مرتّبہ
خلیق انجم

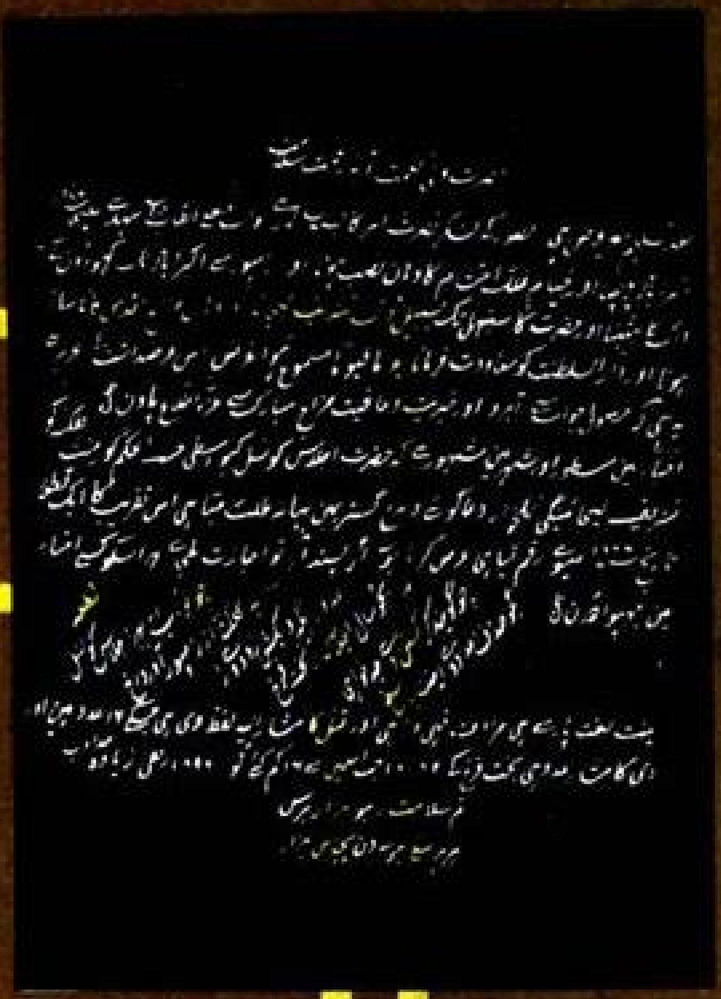

غالب کے خطوط

۹۱۸۴۳۶

جلد اوّل

غالبؔ کے خطوط

(جلد اوّل)

مُرتّبہ

خلیق انجم

غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی

© خلیق انجم

سنہ اشاعت —— ۱۹۸۴ء
تعداد : —— ۱۱۰۰
قیمت : —— پچھتر روپے
بہ اہتمام : —— شاہد ماہلی
طباعت : —— سمر آفسٹ پرنٹرز۔ دہلی

ناشر
غالب انسٹی ٹیوٹ، ایوانِ غالب مارگ نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

فہرست

حرفِ آغاز ۹
کچھ اِس تنقیدی اڈیشن کے بارے میں ۱۳
متن کی تصحیح ۱۳
بنیادی نسخہ ۱۴
خطوں کی تاریخ وار ترتیب ۱۷
خطوں کی تاریخِ تحریر ۱۷
تنقیدی اڈیشن کے متن کی املا ۱۹
اوقاف کی علامتیں ۲۰
رقمیں ۲۱
غالبؔ کا نام بہ حیثیت مکتوب نگار ۲۱
مکتوب الیہ کے حالات ۲۲
خطوطِ غالبؔ کے مختلف اڈیشن اور ری پرنٹ ۲۳
مہرِ غالب ۲۳
انتخابِ غالب ۲۴
عودِ ہندی: پہلا اڈیشن ۲۵
دونوں اڈیشنوں کی مماثلتیں ۲۷
اختلافات ۲۹
اردوے معلّیٰ: پہلا اڈیشن ۳۳
عودِ ہندی: ری پرنٹ ۳۵
اردوے معلّیٰ: ری پرنٹ ۳۵
اردوے معلّیٰ ری پرنٹ ۳۶
اردوے معلّیٰ: حصہ اول و دوم ۳۶
اردوے معلّیٰ حصہ اول و دوم۔ دوسرا ری پرنٹ ۳۷
اردوے معلّیٰ: حصہ اول ۳۸
مکمل اردوے معلّیٰ: مشتمل بر ہر دو حصہ ۳۹
اردوے معلّیٰ مکمل: ہر دو حصہ مع ضمیمہ ۳۹
عودِ ہندی ۴۰
ادبی خطوطِ غالب، مرتبہ مرزا محمد عسکری ۴۰
مکاتیبِ غالب، مرتبہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی ۴۱
خطوطِ غالب، مرتبہ مہیش پرشاد ۴۲
نادراتِ غالب، مرتبہ آفاق حسین آفاق ۵۱
خطوطِ غالب، مرتبہ غلام رسول مہر ۵۲
غالب کی نادر تحریریں، مرتبہ خلیق انجم ۵۳

خطوطِ غالب، مرتبہ مہیش پرشاد
بہ نظرِ ثانی مالک رام ۵۳
عودِ ہندی اور اردوئے معلّٰی،
مرتبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل ۵۴

غالب کی اردو املا کی خصوصیات

یائے مجہول اور یائے معروف ۶۴
الفاظ کو ملا کر لکھنے کا رجحان ۶۴
اعراب بالحروف ۶۵
پیش کا استعمال ۶۵
ہکار آوازوں کی لکھاوٹ ۶۵
لفظ کے آخر میں الف یا ہائے مختفی ۶۷
ہائے مختفی یا الف پر ختم ہونے والے الفاظ
واحد محرف یا جمع قائم کی صورت میں ۶۸
نون غنہ اور نون ساکن ۶۹
بعض حروف کو ملا کر لکھنے کا رجحان ۷۰
ذ اور ز ۷۰
پانو اور گانو ۷۰
یائے تحتانی اور ہمزہ ۷۲
چاہیے۔ لیے۔ دیے۔ کیے۔ ۷۲
مؤید اور رؤسا ۷۳
ایسے الفاظ جن کی املا غالب نے دو طرح کی ہے ۷۳
بعض الفاظ کی املا اور اُن کا تلفظ ۷۴
بوڑھا اور گاڑی ۷۴
گڑ بڑ ۷۴
تڑپنا ۷۵
ڈھونڈنا ۷۵
سونچ ۷۵

غالب کی زبان پر فارسی اثرات

انگریزی الفاظ کا استعمال ۷۶
غالب کے اردو خطوط کی مجموعی تعداد ۹۳
خطوطِ غالب کا تنقیدی مطالعہ ۹۹
غالب سے قبل اُردو کا نثری سرمایہ
اور اردو مکتوب نگاری کا آغاز ۱۰۱
غالب کا پہلا دستیاب اُردو خط ۱۱۷
مکتوب نگاری کا فن ۱۲۴
شگفتنِ گل ہائے ناز ۱۳۷
القاب و آداب ۱۴۸
غالب کا آئینِ نامہ نگاری ۱۵۱
خطوط میں مکالمہ نویسی ۱۵۵
غالب کا ہے اندازِ بیاں اور
مقفّیٰ عبارتیں ۱۶۶

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر ۱۷۲
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے ۱۸۳
مرقع نگاری ۱۹۵
اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے ۱۹۷
ماتمِ یک شہرِ آرزو ۲۱۱
عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا ۲۱۹

غالبؔ کے خطوط

مرزا ہرگوپال تفتہؔ کے نام ۲۳۳
نواب علاء الدین احمد خاں علائیؔ کے نام ۳۶۳

تصویریں

مرزا ہرگوپال تفتہؔ ۲۳۱
نواب علاء الدین احمد خاں علائیؔ ۳۶۱

خطوطِ غالبؔ کے عکس

مرزا ہرگوپال تفتہؔ کے نام ۲۴۱
مرزا علاء الدین احمد خاں علائیؔ کے نام ۳۷۷
ایضاً ۳۸۸
ایضاً ۴۲۶

حرفِ آغاز

غالب کے تمام اردو خطوط کو یکجا کر کے اُن کا تنقیدی اڈیشن تیار کرنے کا منصوبہ پہلی بار مولوی مہیش پرشاد نے بنایا تھا۔ مرحوم نے اس سلسلے میں بڑی محنت اور جانفشانی سے کام لیا۔ ہر ممکن ذریعے سے غالب کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ خطوط یا اُن کے عکس فراہم کیے۔ اُس وقت تک خطوطِ غالب کے متعدد اڈیشن اور اُن کے ری پرنٹ شائع ہو چکے تھے۔ خطوطِ غالب کے اِس طرح کے تمام نسخوں کی ترتیب میں چوں کہ متنی تنقید کے بنیادی اصولوں کی پابندی نہیں کی گئی تھی اِس لیے متن میں بے شمار غلطیاں راہ پا گئی تھیں۔ مولوی مہیش پرشاد نے صحیح متن کے تعیّن کی کوشش کی اور پہلی جلد مرتّب کر کے ۱۹۴۱ء میں شائع کر دی۔ وہ ابھی دوسری جلد کی تیاری میں مصروف تھے کہ دنیا سے چل بسے۔

مہیش پرشاد صاحب کے انتقال کے بعد مولوی غلام رسول مہر نے دو جلدوں میں خطوطِ غالب مرتّب کر کے ۱۹۵۱ء میں لاہور سے شائع کیے۔ مہر صاحب کے علم و فضل سے کون انکار کر سکتا ہے۔ وہ جیّد عالم تھے لیکن نہ جانے کیوں انھوں نے اس کام پر خاطر خواہ توجہ نہیں کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ متن اتنا غلط چھپا کہ میرے محتاط اندازے کے مطابق متن میں فی صفحہ آٹھ یا دس غلطیاں ہوں گی۔

جملۂ معترضہ کے طور پر عرض کر دوں کہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی کا مرتّبہ "مکاتیبِ غالب"، غالب کے خطوط کا وہ پہلا اڈیشن ہے جس میں انتہائی سائنٹی فک طریقے سے متن کا تنقیدی اڈیشن تیار کیا گیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس مجموعے میں غالب کے بیش تر خطوط سو روپے ماہوار کی رسید ہونے کی وجہ سے بالکل غیر اہم ہیں۔ "مکاتیبِ غالب" کی اہمیت اُن کے مکتوب الیہم کی وجہ سے نہیں بلکہ اس وجہ سے ہے کہ انھیں غالب نے لکھا اور عرشی صاحب

جیسے متنی نقاد نے اُن کا تنقیدی اڈیشن تیار کیا۔

غالبؔ کے اصل خطوط کے عکس مختلف رسالوں میں شائع ہوتے رہے ہیں "مرقعِ غالبؔ" میں پرتھوی چندر نے نوابانِ رام پور کے نام غالبؔ کے اکثر خطوط اور کچھ دوسرے لوگوں کے نام غالبؔ کے خطوط کے عکس شائع کیے ہیں۔ میں نے غالبؔ کے اصل خطوط کے تمام دستیاب عکس اس مجموعے میں اس طرح شامل کیے ہیں کہ جس مکتوب الیہ کے نام کا وہ خط جس کی اصل کا عکس دستیاب ہو گیا ہے، جہاں نقل ہوا ہے، اُس کے ساتھ خط کا عکس بھی دے دیا ہے۔

میں ان تمام حضرات کا انتہائی شکر گزار ہوں جنھوں نے یہ عکس شائع کیے تھے۔ جناب کالی داس گپتا رضا کا بھی خاص طور سے ممنون ہوں جنھوں نے علائی اور ثاقبؔ کے نام کے دو خطوط کے عکس مجھے فراہم کیے۔ غالبؔ نے یہ دونوں خط ۳۰ ستمبر ۱۸۶۱ء کو لکھے تھے۔

خطوطِ غالبؔ کا تنقیدی اڈیشن تیار کرنے میں جن کرم فرماؤں، دوستوں اور شاگردوں نے میرے ساتھ تعاون کیا ہے، اُن کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ خطوط کے ذریعہ جن محترم شخصیتوں سے میں نے استفادہ کیا ہے اُن میں مولانا امتیاز علی خاں عرشی مرحوم، قاضی عبدالودود اور پروفیسر نذیر احمد کے نام خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ اِس سلسلے میں میرے نام لکھے گئے ان حضرات کے خطوط بجائے خود غالبیات کا ایک اہم سرمایہ ہیں۔ کوشش کروں گا کہ انھیں مرتب کر کے شائع کر دوں۔ مالک رام صاحب نے حواشی کے سلسلے میں ایسے بے شمار مآخذ کی نشان دہی کی جن کے بغیر حواشی نامکمل رہتے۔ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی نے حواشی پر نظرِ ثانی کر کے بہت اہم مشوروں سے نوازا۔ رشید حسن خاں صاحب نے قدم قدم پر رہنمائی کی۔ ڈاکٹر اسلم پرویز اور کاظم علی خاں نے میری بہت سی اُلجھنوں کو سلجھایا۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی اور ڈاکٹر ظ انصاری نے اپنے قیمتی مشوروں سے اس کام کو بہتر بنانے میں میری مدد کی۔ تفتہؔ اور علائی کی تصویریں مالک رام صاحب نے عنایت فرمائیں۔

خدا بخش لائبریری کے ڈائرکٹر ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے مجھے بھرپور تعاون دیا۔ مختلف کتابوں کے بارے میں سوالات کا جواب ہمیشہ بلا تاخیر دیا ہے۔ بڑی تعداد میں میرے مطلوبہ

مضامین اور کتابوں کے اقتباسات کے زیروکس فراہم کیے۔ احمد سعید صاحب (اسکول آف فارن لینگویجز، وزارتِ دفاع) نے خطوط کے متن کی درستی میں میری بہت مدد کی۔

کالی داس گپتا رضا نے اپنی بیش قیمت ذاتی لائبریری سے استفادے کا موقع دیا۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کے لائبریرین ایم حبیب خاں صاحب اور ہردیال لائبریری (ہارڈنگ لائبریری) کے بہار الہ آبادی صاحب نے کتابوں کی فراہمی میں مجھے غیر معمولی تعاون دیا۔ شہباز حسین صاحب اور راج نرائن راز صاحب نے خطوطِ غالب کے وہ عکس فراہم کیے جو ماہنامہ "آج کل" (نئی دہلی) میں شائع ہوئے تھے۔ میرے کرم فرما ساغر نظامی صاحب، ضامن علی خاں ضامن مراد آبادی، یوگندر بہل تشنہ، شمیم احمد صاحب اور ایم بی مغل صاحب نے کتابوں کی فراہمی میں میری بہت مدد کی۔

محمد رضا صاحب اور ثریا سعید صاحبہ نے خطوط کی نقل کرنے میں میری مدد کی۔ سی۔ ایس چڈھا صاحب نے مسودہ صاف کرنے میں بہت تعاون دیا۔

میں نے اس کام کے سلسلے میں جن لائبریریوں سے بہت زیادہ استفادہ کیا ہے اُن میں انجمن ترقی اردو (ہند) لائبریری، برٹش لائبریری، لندن، انڈیا آفس لائبریری، لندن۔ ہردیال لائبریری، دہلی۔ نیشنل آرکائوز آف انڈیا، نئی دہلی۔ ڈیپارٹمنٹ آف آرکائوز دہلی۔ دہلی یونیورسٹی لائبریری۔ مولانا آزاد لائبریری، علیگڈھ۔ نذیریہ لائبریری، دہلی۔ غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی۔ خدابخش لائبریری، پٹنہ۔ رضا لائبریری، رام پور۔ غالب اکیڈمی، نئی دہلی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ لائبریری، نئی دہلی۔ سالار جنگ میوزیم، حیدر آباد، خانۂ فرہنگ، نئی دہلی۔ ادارۂ ادبیاتِ اردو، حیدر آباد، خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

میرے پاس الفاظ نہیں کہ اپنے اِن تمام بزرگوں، دوستوں، عزیزوں اور لائبریریوں کے منتظموں کا شکریہ ادا کرسکوں۔ خدا انھیں ہمیشہ سلامت رکھے۔

اگر غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی کے سکریٹری جناب محمد شفیع قریشی اس کام میں غیر معمولی

دلچسپی نہ لیتے اور کام جلد ختم کرنے پر اصرار نہ کرتے، تو اس کام کی تکمیل میں ابھی نہ جانے اور کتنا وقت لگتا۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے معین زیدی صاحب اور شاہد ماہلی صاحب نے اس کی طباعت میں بہت جان کھپائی ہے۔ میں ان تینوں حضرات کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔

آخر میں اپنی بیوی موہنی اور بچوں سیما اور ثمر کا شکریہ ادا کرنا اس لیے ضروری سمجھتا ہوں کہ ان کے حصے کا بہت سارا وقت بھی میں نے اس کام کی تکمیل پر صرف کیا ہے۔ جو سہولتیں اِن تینوں نے مجھے فراہم کیں، اُن کے بغیر یہ کام ہرگز مکمل نہیں ہو سکتا تھا۔ میرے باغ کے اِن پھولوں کو خدا ہمیشہ سرسبز و شاداب رکھے۔

غالب کے خطوط میں جن لوگوں، کتابوں، اخباروں اور مختلف مقاموں کا ذکر آیا ہے۔ اُن پر جہانِ غالب کے عنوان سے حواشی لکھے گئے ہیں۔ "متن کے مآخذ" کے تحت ہر خط کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ خط کا بنیادی متن کہاں سے لیا گیا ہے اور کس متن سے اُس کا موازنہ کر کے اختلافاتِ نسخ بیان کیے گئے ہیں۔ غالب کے خطوط میں جتنے بھی فارسی اور اردو اشعار یا مصرعے نقل ہوئے ہیں، اُن کا اشاریہ "اشعار کا اشاریہ" کے عنوان سے ترتیب دیا گیا ہے۔ پورے متن کا مکمل اشاریہ بھی تیار کیا گیا ہے۔

مکتوب الیہ کے حالات، "جہانِ غالب"، کتابیات، اشعار کا اشاریہ اور متن کا اشاریہ آخری جلد میں شامل کیے گئے ہیں۔

غالب کے خطوط چار جلدوں میں شائع کیے جا رہے ہیں۔ پہلی جلد حاضرِ خدمت ہے، باقی تین جلدیں بھی اسی سال چھپ جائیں گی۔ اِنشا اللہ۔

خلیق انجم

۸۴/۱/۱/۷

کچھ اِس تنقیدی اڈیشن کے بارے میں

غالب کے خطوط کا تنقیدی اڈیشن تیار کرتے ہوئے میں نے متنی تنقید کے جن اصولوں کی پابندی کی ہے، یہاں اُن کی وضاحت ضروری ہے۔

میری کوشش رہی ہے کہ غالب کے تمام اردو خط اِس اڈیشن میں شامل کرلیے جائیں "اُردوے معلّٰی"، "عودِ ہندی"، "مکاتیبِ غالب"، "نادراتِ غالب" اور "غالب کی نادر تحریریں" کے تمام خطوط شامل کرلیے گئے ہیں۔ ایسے خطوں کی تعداد خاصی تھی، جو اِن مجموعوں میں شامل نہیں تھے، انھیں بھی اس اڈیشن میں شامل کرلیا گیا ہے۔ اگرچہ میں نے پوری کوشش کی ہے کہ غالب کے تمام اردو خطوط اس اڈیشن میں مرتب ہوجائیں پھر بھی اگر کوئی خط شامل ہونے سے رہ گیا ہو، تو اُسے میری کوتاہی سمجھا جائے۔

متن کی تصحیح

متنی نقاد کو کسی بھی تحریر کا تنقیدی اڈیشن تیار کرتے ہوئے ہر قدم پر یہ ذہن میں رکھنا ہوتا ہے کہ وہ اس تحریر کی بازیافت کر رہا ہے، جو مصنف کے ذہن میں تھا اور جو وہ لکھنا چاہتا تھا، اُس تحریر کی نہیں جو مصنف کے قلم سے نکلی یا شائع ہوئی، کیوں کہ مصنف کے اپنے

ہاتھ کے لکھے ہوئے مسودے میں بھی غلطیاں رہ جاتی ہیں۔ کبھی کوئی لفظ سہواً دوبار لکھا جاتا ہے، اور کبھی کوئی لفظ لکھنے سے رہ جاتا ہے۔ کبھی مصنف لکھنا کچھ چاہتا ہے، اور لکھ کچھ جاتا ہے۔ کبھی الفاظ کی املا غلط ہو جاتی ہے۔ جب مصنف کی تحریر طباعت کی منزلوں سے گزرتی ہے تو اس تحریر میں کم سے کم ایک اور انسانی ذہن کا دخل ہو جاتا ہے۔ اردو طباعت میں یہ ذہن کاتب کا ہوتا ہے۔ کاتب اس تحریر میں بعض تبدیلیاں شعوری طور پر کرتا ہے اور بعض تبدیلیاں انسانی ذہن کی پُراسرار اور پیچیدہ نفسیات کی وجہ سے غیر شعوری طور پر وجود میں آتی ہیں۔ اگر مصنف اور کاتب کے درمیان مرتّب ہو تو اس کی پسند یا ناپسند، غلط فہمی، کم علمی، سیاسی، سماجی اور مذہبی مصلحتوں اور اُس کی اپنی نفسیاتی پیچیدگیوں کی وجہ سے تحریر میں اور بہت سی تبدیلیاں ہو جاتی ہیں۔

غالب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے اصل خطوط خاصی تعداد میں دستیاب ہیں، باقی خطوط مطبوعہ صورت میں ہم تک پہنچے ہیں۔ ان خطوط کے متن میں تبدیلیوں کی وہ تمام مثالیں موجود ہیں، جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ اس لیے اگر ان خطوط میں مجھے کوئی ایسی قرأت نظر آئی ہے جو میرے خیال سے غالب کی منشا کے خلاف ہے تو میں نے قیاسی تصحیح کر کے حاشیے میں اس کا ذکر کر دیا ہے۔

بنیادی نسخہ

متنی تنقید کے نقطۂ نظر سے خطوطِ غالب کا متن دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک متن تو وہ جو غالب کے ہاتھ کا لکھا ہوا دستیاب ہوا ہے، یعنی غالب کے اصل خطوط۔ ان میں وہ خط بھی شامل ہیں جو ہمیں پہلے مطبوعہ شکل میں ملے تھے لیکن بعد میں ہمیں اصل خطوط بھی دستیاب ہو گئے۔ دوسری قسم کا متن وہ ہے جو ”اردوے معلّٰی“، ”عودِ ہندی“ اور ”نادراتِ غالب“ وغیرہ میں شائع ہوا ہے۔ اس متن میں غالب کے وہ خطوط بھی ہیں جو ”اردوے معلّٰی“

کے بعد کے اڈیشنوں میں شامل کیے گئے تھے۔

زیرِ نظر تنقیدی اڈیشن میں غالب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے اُن خطوط کو جن کے عکس مختلف رسالوں میں شائع ہوتے ہیں یا جو اصل شکل میں مختلف لائبریریوں میں محفوظ ہیں، بنیادی نسخے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ تنقیدی متن تیار کرتے ہوئے ان خطوط کا مطبوعہ خطوط سے موازنہ کر کے اختلافاتِ نسخ سے بے وجہ ضخامت بڑھانے کی کوشش نہیں کی گئی۔

"اردوے معلّیٰ" اور "عودِ ہندی" کے پہلے اڈیشنوں میں شائع ہونے والے خطوط کو بنیادی نسخے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ غالب کے جو خطوط ان دونوں مجموعوں میں مشترک ہیں، اُن میں "اردوے معلّیٰ" کے متن کو بنیادی نسخہ بنا کر، "عودِ ہندی" کے متن سے موازنہ کر کے اختلافاتِ نسخ دیے گئے ہیں۔ "اردوے معلّیٰ" کے متن کو اس لیے ترجیح دی گئی ہے کہ یہ مجموعہ دہلی میں شائع ہوا تھا اور "عودِ ہندی" کے مقابلے میں اس مجموعے میں طباعت کی غلطیاں کم ہیں۔
"اردوے معلّیٰ" پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے لکھا ہے:

> "... اکثر عبارتیں جو "عودِ ہندی" میں چھوڑ دی گئی تھیں، اس میں موجود ہیں۔ اس سے یقین ہوتا ہے کہ اس نسخے کے ترتیب دینے والوں کے سامنے اصل خط تھے۔ البتہ ایک آدھ جگہ ایسا بھی ہے کہ ایک ٹکڑا اس میں حذف ہو گیا ہے اور وہ "عودِ ہندی" اور اصل خط دونوں میں موجود ہے۔ ... اس سے یہ نتیجہ بھی نکالا جا سکتا ہے کہ "اردوے معلّیٰ" کے ترتیب دینے والوں کے سامنے کچھ اصل خط تھے، کچھ خطوں کی نقلیں، جن میں سے بعض ناقص بھی تھیں۔"[1]

"اردوے معلّیٰ" اور "عودِ ہندی" کے بہت سے ری پرنٹ شائع ہوتے تھے اور ہر ایک کے متن میں تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ چوں کہ ان ری پرنٹوں کے متن میں تبدیلیوں کی وجہ یہ نہیں تھی کہ اُن کے پورے متن یا اُس کے کچھ حصے کا موازنہ اصل خطوط سے کیا گیا تھا، بلکہ یہ تبدیلیاں یا تو طباعت کی غلطیاں ہیں یا جن لوگوں کی نگرانی میں یہ ری پرنٹ شائع ہوئے ہیں،

انھوں نے متن کی خود تصحیح کی ہے۔ اس لیے ان ری پرنٹوں میں شائع ہونے والے متن کا بنیادی متن سے موازنہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی، ہاں کہیں کہیں قیاسی تصحیح میں ان سے ضرور مدد لی گئی ہے۔

۱۸۹۹ء میں مطبع نامی مجتبائی دہلی سے "اُردوے معلّٰی" کا ایک اڈیشن شائع ہوا تھا۔ اس کے دو حصے تھے پہلا حصہ تو وہی تھا جو "اُردوے معلّٰی" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ دوسرے حصے میں سات دیباچوں اور تقریظوں کے علاوہ غالبؔ کے وہ خطوط شامل کیے گئے، جن میں غالبؔ نے ادبی مسائل پر بحث کی ہے اور جو ابھی تک شائع نہیں ہوتے تھے۔ یہ خطوط مرزا ہرگوپال تفتہؔ، ماسٹر پیارے لال، منشی حبیب اللہ ذکا، میاں داد خاں سیاحؔ، شہزادہ بشیر الدین، کیول رام ہشیارؔ، مولوی کرامت علی، جواہر سنگھ جوہرؔ، منشی ہیرا سنگھ، اور میر مہدی مجروحؔ کے نام ہیں۔ ان تمام خطوط کو بنیادی متن کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔

سید غلام حسنین قدرؔ بلگرامی کے نام غالبؔ کے خطوط پہلی بار مولانا حسرتؔ موہانی کے "اُردوے معلّٰی" (علی گڑھ، دسمبر ۱۹۰۷ء، ص ص ۵ - ۲۳) میں شائع ہوتے تھے مگر ان خطوط کا متن خاصا غلط شائع ہوا تھا۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے پاس اِن میں سے بعض خطوں کی نقلیں موجود تھیں۔ مولوی مہیش پرشاد نے ان نقلوں کی بنیاد پر متن تیار کیا تھا، اس لیے اسی متن کو بنیادی متن بنایا گیا ہے۔

انور الدولہ سعید الملک نواب سعد الدین خاں بہادر صولت جنگ متخلص بہ شفقؔ کے نام غالبؔ کے اکیس خطوط ہیں۔ ان میں سے گیارہ خطوط اعظم گڑھ میں کسی صاحب کے پاس تھے۔ مولوی مہیش نے مطبوعہ متن کا ان اصل خطوط سے موازنہ کیا تھا، اس لیے مولوی صاحب نے شفقؔ کے نام خطوط کا جو متن تیار کیا ہے، اِس تنقیدی اڈیشن میں اُسے ہی بنیادی متن بنایا گیا ہے۔

خاصی تعداد میں غالبؔ کے اصل خطوط رضا لائبریری رامپور اور دوسری لائبریریوں

میں محفوظ ہیں، بہت سے خطوط کے عکس مختلف رسالوں میں شائع ہوئے تھے۔ ان تمام خطوں کے عکس اِس تنقیدی اڈیشن میں شامل کر دیے گئے ہیں، تاکہ یہ تمام عکس یکجا محفوظ ہو جائیں۔

ہر اڈیشن کے آخر میں بنیادی متن کا ایک اشاریہ دیا گیا ہے، جس میں ہر خط کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ کہاں سے لیا گیا ہے۔ جس سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ کون سا خط پہلی بار کب اور کہاں شائع ہوا تھا۔

خطوں کی تاریخ وار ترتیب

مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے پہلی بار "مکاتیبِ غالب" کے خطوں کو تاریخ وار ترتیب دیا تھا۔ یہ خطوط نوابانِ رام پور اور رام پور سے متعلق چار دیگر افراد کے نام ہیں۔ بعد میں مولوی مہیش پرشاد، آفاق دہلوی اور غلام رسول مہر وغیرہ نے خطوطِ غالب تاریخ وار ترتیب دیے۔

میں نے بھی تمام خطوط تاریخ وار ترتیب دیے ہیں۔ جن خطوں کی تاریخِ تحریر کا تعین نہ ہو سکا، انھیں متعلقہ مکتوب الیہ کے نام خطوط کے آخر میں ترتیب دیا گیا ہے۔ اگر کسی خط کی تاریخ کا اندازہ نہ ہو سکا لیکن سنہ کا اندازہ ہو گیا ہے تو اُس سنہ کے خطوط کے آخر میں اُس خط کو ترتیب دیا گیا ہے۔

خطوں کی تاریخِ تحریر

غالب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے جو خطوط دستیاب ہوئے ہیں، اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب ہر خط میں تاریخِ تحریر ضرور لکھتے تھے۔ ممکن ہے یہ اُس مراسلت کا اثر ہو جو پنشن کے سلسلے میں غالب اور برطانوی حکومت کے درمیان تھی۔

غالب نے تاریخِ تحریر مختلف طریقوں سے لکھی ہے۔ عام طور سے خط کے آخر میں لکھتے تھے لیکن کبھی خط کے آغاز میں اور کبھی خط کے متن میں بھی لکھ دیا کرتے تھے۔

میں نے تاریخِ تحریر کو خط کے آخر میں دائیں طرف ترتیب دیا ہے تاکہ قاری کو خط کی تاریخِ تحریر معلوم کرنے میں آسانی ہو۔

غالب کبھی صرف عیسوی تاریخ لکھتے تھے، کبھی ہجری اور کبھی دونوں۔ انھوں نے اگر ہجری تاریخ لکھی ہے تو، میں نے اس کی عیسوی تاریخ بھی لکھ کر حاشیے میں اُس کا حوالہ دے دیا ہے۔

ایسے خطوط خاصی تعداد میں ہیں، جن کی تاریخِ تحریر میں غالب نے دن بھی لکھا ہے۔ غالب دن تین طرح سے لکھتے ہیں۔ عام طور سے دنوں کے فارسی نام یعنی شنبہ اور یکشنبہ وغیرہ، کبھی ہندوستانی نام اتوار، سوموار وغیرہ اور کبھی یوم الخمیس اور آدینہ وغیرہ۔ کبھی وقت بھی لکھ دیتے مثلاً صبح، چاشتگاہ، نیم روز، وقتِ نمازِ ظہر وغیرہ۔

غالب تاریخِ تحریر میں پہلے دن، پھر تاریخ، مہینہ اور سنہ لکھتے۔ کبھی سنہ لکھنے کے بجائے "سال حال" لکھ دیتے۔

مطبوعہ خطوط میں سہوِ کتابت کی وجہ سے بعض تاریخیں بدل گئی ہیں۔ خود غالب کے ہاتھ کے جو اصل خطوط دستیاب ہوتے ہیں، اُن میں جب ہجری اور عیسوی تاریخوں کی مطابقت کرتے ہیں تو کبھی کبھی ایک دن کا فرق آتا ہے اور یہ فرق اس طرح کا ہوتا ہے کہ فرض کیجیے تاریخ کے اعتبار سے "شنبہ" ہونا چاہیے لیکن غالب نے "جمعہ" یا "یکشنبہ" لکھا ہے۔

چوں کہ ہجری اور عیسوی تاریخوں میں ایک دن کا فرق عام ہے، اس لیے میں نے ایسی تاریخوں کو نہیں بدلا، جن سے ایک دن کا فرق آتا ہے، ہاں حاشیے میں اس فرق کا ذکر کر دیا ہے۔ جہاں ایک دن سے زائد کا فرق ہے، وہاں اُسے غالب یا کاتب کا سہو تصور کر کے بدل دیا ہے اور حاشیے میں اس تبدیلی کا ذکر کر دیا ہے۔

جب غالب کے خطوط شائع ہونے لگے تو تاریخِ تحریر کو غیر ضروری سمجھ کر عام طور سے

حذف کردیا گیا۔ "عودِ ہندی" میں کافی خطوط کی تاریخِ تحریر کو حذف کردیا گیا ہے۔ اس کے برعکس "اردوے معلیٰ" میں بیشتر خطوط پر تاریخِ تحریر موجود ہے۔

ایسے خطوط کی بہت بڑی تعداد ہے جن پر تاریخِ تحریر نہیں ہے۔ ان خطوں میں غالب نے جو واقعات بیان کیے ہیں اُن کی مدد سے میں نے بیشتر خطوں کی تاریخِ تحریر کا تعین کیا ہے۔ اور ہر تاریخِ تحریر کے تعین کے لیے حاشیے میں اپنے مکمل دلائل پیش کیے ہیں تاکہ اگر مجھ سے غلطی ہو تو مستقبل کا محقق اُسے درست کرسکے۔

جن خطوط کے متن سے تاریخِ تحریر کا تعین نہیں ہوسکا، اُن کے لیے میں نے قیاس اور اندازہ سے کام نہیں لیا، بلکہ انھیں بغیر تاریخِ تحریر ہی کے رہنے دیا تاکہ خطوطِ غالب کے نقاد اور سوانح نگار غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔

تنقیدی اڈیشن کے متن کی اِملا

تنقیدی اڈیشن کی املائیں دو ہوسکتی ہیں۔ متنی نقاد متن کے لیے اپنے عہد کی املا کا استعمال کرتا ہے یا اُس املا کا جس میں مصنف نے متن لکھا تھا۔ میں اس حق میں ہوں کہ متن کی املا جدید ہونی چاہیے، کیوں کہ اول تو ہم متن اپنے عہد کے لوگوں کے لیے تیار کرتے ہیں اور دوسرے متنی نقاد کا مقصد متن کی بازیافت ہے، املا کی بازیافت ہرگز نہیں۔

زبان کے مختلف عناصر کی طرح املا میں بھی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ کچھ تبدیلیاں بعض قاعدوں کے تحت ہوتی ہیں اور کچھ بے قاعدہ محض چلن کے تحت۔ اگر ہم آج سے پانچ چھ سو سال کا کوئی دکنی اردو متن مرتب کریں، اور متن کی وہی املا رکھیں جس میں ہمیں متن دستیاب ہوا ہے تو ہمارے عہد کے لوگوں کے لیے اس متن کا پڑھنا بہت مشکل بلکہ بعض اوقات ناممکن ہوجائے گا۔ اس لیے اس طرح کے متن ہمیں لازمی طور پر جدید املا میں مرتب کرنے ہوں گے۔ اب ایسا کوئی قاعدہ نہیں بنایا جاسکتا کہ فلاں عہد تک کے متن تو

جدید املا میں مرتب ہوں گے اور اس کے بعد کے متن اُسی املا میں لکھے جائیں گے جس میں مصنف یا کاتب نے لکھا تھا۔ ان مسائل کا واحد حل یہی ہے کہ جو متن ہم مرتب کر رہے ہیں، اگر مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا وہ متن دستیاب ہوگیا ہے تو ہمیں چاہیے کہ تنقیدی اڈیشن کی املا تو جدید ہی رکھیں لیکن مقدمے میں مصنف کی املا کی خصوصیات بیان کر دیں۔

اردو کی بدنصیبی ہے کہ بعض حضرات نے اردو املا کی یہ حالت کر دی ہے کہ اردو کی کوئی معیاری املا نہیں ہے۔ ہونا یہ چاہیے تھا کہ اردو میں جو لفظ ایک سے زیادہ طریقے سے لکھے جاتے تھے، اُن میں یہ دیکھا جاتا کہ اکثریت ایک مخصوص لفظ کو کس طرح لکھتی ہے، اُسے ہی معیاری مان لیا جاتا۔ ہوا یہ کہ اردو املا کے مسائل حل کرنے والوں نے بہت سے الفاظ کی نئی نئی املا ایجاد کر دی، نتیجہ یہ ہوا کہ اب ایک لفظ کئی کئی طرح لکھا جاتا ہے۔ املا کے مسائل میں اُلجھنیں پیدا کرنے والوں میں بعض اہم ادارے بھی شامل ہیں۔

غالبؔ کے خطوط کا متن میں نے اُس املا میں تیار کیا ہے، جو میری املا ہے۔ ہاں غالبؔ کی املا کی خصوصیات تفصیل سے بیان کر دی گئی ہیں۔ میری پوری کوشش رہی ہے کہ ایک لفظ کی میں نے جو املا کی ہے، پورے متن میں وہی برقرار رہے، اگر کہیں ایک لفظ کی املا دو طرح سے ملے تو اس میں میرا نہیں کاتب کا قصور ہے۔

اوقاف کی علامتیں

غالبؔ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے جو خطوط دستیاب ہوئے ہیں، اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالبؔ انگریزی مراسلت کے طریقوں سے خاصے واقف تھے۔

غالباً انگریزی مراسلت کے طریقوں ہی کا اثر تھا کہ غالبؔ ہر خط پر تاریخِ تحریر پابندی سے لکھتے تھے اور عبارت میں پیراگراف کا خیال رکھتے تھے۔

غالبؔ کے ایسے خطوط موجود ہیں، جن میں غالبؔ نے پیراگراف نئی سطر سے شروع کیا

ہے، اگرچہ ایسے خطوط کی تعداد دو چار سے زیادہ نہیں ہے۔ ہاں، غالب خط میں جب ایک بات ختم کرتے تو دوسری بات شروع کہنے سے پہلے عام طور سے کوئی نشان بنا دیتے۔

جس جملے سے نئی بات شروع کرتے اُس کے پہلے لفظ پر (ــــ) علامت بنا دیتے۔ یہ علامت بہ قول مولانا امتیاز علی خاں عرشی عربی کے لفظ "بت" بہ معنی قطع کی شکل ہے۔

کبھی پیراگراف ختم کرنے پر "ڡؕ" علامت ایک بار اور کبھی دو بار لکھتے۔ یہ علامت بہ قول عرشی مرحوم "فقط" کی طغرائی شکل ہے۔

غالب نے پیراگراف ختم ہونے پر "١٢" کا ہندسہ کثرت سے لکھا ہے۔ یہ لفظ "حد" کے عدد ہیں۔ اس علامت کے بارے میں غالب نے مرزا حاتم علی مہر کو ایک خط میں لکھا تھا

> "صاحب، بندۂ اثنا عشری ہوں، ہر مطلب کے خاتمے پر بارہ کا ہندسہ کرتا ہوں۔"

اس تنقیدی اڈیشن میں ہر پیراگراف نئی سطر سے شروع کیا گیا ہے۔ اوقاف کی وہ علامتیں بھی استعمال کی گئی ہیں جو ہمارے عہد میں رائج ہیں۔

رقمیں

غالب گنتی کبھی لفظوں میں اور کبھی ہندسوں میں لکھتے تھے۔ روپوں کی تعداد کے لیے بعض اوقات حسابی رقوم لکھتے تھے۔

اس تنقیدی اڈیشن کے متن میں گنتی اور روپوں کی تعداد وغیرہ لفظوں میں لکھی گئی ہے تاکہ طباعت کی غلطی سے محفوظ رہے۔

غالب کا نام بہ حیثیت مکتوب نگار

غالب عام طور سے خط کے آخر میں تاریخ سے پہلے مکتوب نگار کی حیثیت سے اپنا نام

لکھتے تھے۔ نام لکھنے میں بھی انھوں نے بڑی جدّت سے کام لیا ہے۔ جس کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا۔

میں نے خط کے آخر میں بائیں طرف مکتوب نگار کا نام ترتیب دیا ہے۔

مکتوب اِلیہ کے حالات

میں نے مکتوب الیہم کے حالات خاصے تفصیل سے لکھے تھے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ میرے عزیز دوست کاظم علی خاں نے تمام مکتوب الیہم کے حالات بڑی محنت سے لکھ لیے ہیں اور کتابی صورت میں شائع کر رہے ہیں، اس لیے میں نے یہ حالات بہت مختصر کر دیے۔

خطوطِ غالبؔ کے مختلف اڈیشن اور ری پرنٹ

پچھلے سو سال میں جن کتابوں کے سب سے زیادہ ری پرنٹ اور اڈیشن شائع ہوئے ہیں۔ اُن میں غالبؔ کی "اُردوے معلّیٰ" اور "عود ہندی" سرِفہرست ہیں۔ اِس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ اردو میں غالبؔ کے خطوں کو غیر معمولی مقبولیت حاصل رہی ہے اور دوسرے غالبؔ کے خطوط ہمیشہ اسکولوں اور کالجوں کے نصاب میں شامل رہے۔ اس لیے بعض پبلشر تو ہر سال دو سال بعد "اُردوے معلّیٰ" یا "عودِ ہندی" کے ری پرنٹ شائع کرتے رہے۔

غالبؔ کے خطوط کے اب تک جتنے ری پرنٹ اور اڈیشن شائع ہوئے ہیں، اُن سب کا فراہم کرنا ممکن نہیں ہے، البتہ اہم اڈیشن اور ری پرنٹ لائبریریوں میں محفوظ ہیں۔

یہاں کچھ قدیم ری پرنٹ اور بعض اہم اڈیشنوں کا جائزہ لینا مقصود ہے۔

مہرِ غالبؔ

ابتدا میں غالبؔ کو پسند نہیں تھا کہ اُن کے خطوط مرتب کرکے کتابی صورت میں شائع

کیے جائیں۔ جب مرزا ہرگوپال تفتہ اور منشی شیو نرائن نے غالب سے اُن کے خطوط مرتب کرکے شائع کرنے کی اجازت مانگی تو غالب نے اُن دونوں کو اِس انداز سے منع کیا کہ اُن کے حوصلے ہمیشہ کے لیے پست ہوگئے۔ تقریباً دو سال بعد چودھری عبدالغفور سرور اور منشی ممتاز علی خاں نے اُن خطوط کو شائع کرنے کا ارادہ کیا جو غالب نے سرور کو لکھے تھے۔ اِن لوگوں نے غالب سے اجازت لینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ سرور نے اس مجموعے پر ایک دیباچہ لکھا اور اُس کا نام "مہرِ غالب" رکھا جو تاریخی نام ہے۔ اس نام سے ۱۲۷۸ھ (مطابق ۱۸۶۱ء-۱۸۶۲ء) برآمد ہوتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ خطوط کا یہ مجموعہ ۱۸۶۱ء یا ۱۸۶۲ء میں مرتب ہوگیا تھا۔ کچھ عرصے بعد منشی ممتاز علی خاں کو خیال آیا کہ اس مجموعے میں کچھ اور لوگوں کے نام کے خطوط بھی شامل کیے جائیں۔ انھوں نے مزید خطوط حاصل کرنے کی کوششیں شروع کردیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس مجموعے کی طباعت معرضِ التوا میں پڑگئی۔

انتخابِ غالب

غالب نے ڈاکٹر مولوی ضیاء الدین خاں کی فرمایش پر غالباً انگریز افسروں اور فوجیوں کو اردو پڑھانے کے لیے اپنی اردو نظم و نثر کا ایک مختصر سا انتخاب کیا تھا۔ یہ انتخاب ۱۸۶۶ء میں شائع ہوا۔ گویا "عودِ ہندی" اور "اردوے معلّی" سے پہلے یہ شائع ہوچکا تھا۔ غالب نے جو نسخہ مولوی ضیاء الدین خاں کے لیے لکھوایا تھا وہ محمد عبدالرزاق راشد کو دستیاب ہوگیا۔ انھوں نے یہ انتخاب مرتب کرکے ۱۹۲۶ء میں چشتیہ پریس، حیدرآباد سے شائع کردیا۔ اس کا دوسرا اڈیشن ۱۹۴۳ء میں دین محمدی پریس، لاہور سے شائع ہوا۔

اس انتخاب کا ایک قلمی نسخہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی ملکیت تھا۔ جس کی فوٹوسٹیٹ کاپی غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی میں محفوظ ہے۔ مالک رام صاحب کا کہنا ہے کہ یہ انتخاب چالیس صفحات پر مشتمل ہے، جبکہ اِس قلمی نسخے میں کل تیس صفحات ہیں۔ ابتدا میں اس انتخاب پر غالب کا دیباچہ ہے۔

اس کے بعد مرزا رجب علی بیگ سرور کی "گلزارِ سرور" اور خواجہ بدرالدین خاں کی "حدائق الانظار" پر لکھے گئے غالب کے وہ دیباچے ہیں، جو "اردوئے معلیٰ" میں شامل ہیں۔ پھر میر مہدی مجروح کے کے نام غالب کے بارہ خط ہیں۔ اس کے بعد دو نقلیں اور ایک لطیفہ۔ دوسرے حصے میں ۳۹ اردو اشعار ہیں اور آخر میں اس کتاب سے متعلق غالب کی لکھی ہوئی ایک مختصر سی نثر ہے۔

غالب انسٹی ٹیوٹ کی لائبریری میں محفوظ اس مجموعے کی فوٹو اسٹیٹ کاپی کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کسی اور نسخے سے نقل کیا گیا ہے۔ تمام خطوط کے آغاز کے حاشیے میں "مقابلہ نمودہ شد" لکھا گیا ہے۔ متن میں ترمیمات کی گئی ہیں جس سے گمان ہوتا ہے کہ یہ نسخہ غالب کی نظر سے گزرا ہے۔

عودِ ہندی : پہلا اڈیشن

غلام غوث خاں بےخبر، غالب سے اجازت لے کر اُن کے خطوط کا مجموعہ مرتب کر رہے تھے۔ غالب نے نہ صرف بہ خوشی اجازت دی بلکہ خود بھی خطوط کی نقلیں فراہم کیں۔ بےخبر نے خطوط جمع کرنے کا کام ۱۸۶۱ء میں شروع کیا تھا لیکن ۱۸۶۵ء تک اس مجموعے کی طباعت کے آثار نظر نہیں آئے تو بےخبر نے اپنا مرتب کیا ہوا مجموعہ منشی ممتاز علی خاں کو بھیج دیا۔ منشی صاحب نے "مہرِ غالب" اور اس مجموعے کو ملا کر اس کا نام عودِ ہندی رکھا اور خود بھی اس مجموعے پر دیباچہ لکھا۔ مجموعے میں دو فصلیں ہیں۔ پہلی فصل کی ابتدا چودھری عبدالغفور سرور کے دیباچے سے ہوتی ہے۔ اور پھر وہ پچیس خط ہیں جو سرور نے مرتب کیے تھے۔ دوسری فصل میں حسبِ ذیل حضرات کے نام خطوط ہیں۔

صاحب عالم مارہروی (۲ خط) شاہ عالم مارہروی (۲ خط) انور الدولہ شفق (۲۰ خط) مرزا یوسف علی خاں عزیز (۲ خط) مرزا ہرگوپال تفتہ (۱ خط) مرزا حاتم علی مہر (۱۸ خط) غلام غوث خاں بےخبر (۲۵ خط) عبدالغفور نساخ (۱ خط) ظہیرالدین خاں کی طرف سے اُن کے چچا کے نام (۱ خط) نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے نام (۱ خط) مردان علی خاں رعنا (۲ خط) مرزا رحیم بیگ (۱ خط)

عبدالرزاق شاکر (۱۰ خط) قاضی عبدالجمیل جنون بریلوی (۱۷ خط) مولوی عزیزالدین (۱ خط) سید محمد عباس (۱ خط) منشی غلام بسم اللہ (۱ خط) مجروح (۳۱ خط) میر سرفراز حسین (۱ خط)۔

خطوط کا یہ مجموعہ ۱۰ رجب ۱۲۸۵ھ مطابق ۲۷ اکتوبر ۱۸۶۸ء کو شائع ہوا۔

عودِ ہندی کے بارے میں ایک اہم انکشاف

بہت عرصہ ہوا میں نے غالب کے وہ خطوط مرتب کر لیے تھے جن کے متن کی بنیاد "عودِ ہندی" اور "اردوے معلیٰ" کے پہلے اڈیشنوں پر تھی۔ انجمن ترقی اُردو (ہند) کا جنرل سکریٹری ہوجانے کے بعد میری مصروفیات کچھ اس طرح کی ہوگئیں کہ کافی عرصے تک اس کام کی طرف توجہ نہیں کرسکا۔ اس دوران میں میرے ساتھ ایک حادثہ ہوگیا۔ ہوا یہ کہ میری دس پندرہ بہت قیمتی کتابیں ایک ساتھ چوری ہوگئیں۔ ان میں "عودِ ہندی" کا وہ پہلا اڈیشن بھی تھا، جو میں نے پرانی کتابوں کے ایک تاجر سے خریدا تھا۔ اس وقت میں چور کو بہت کوستا تھا لیکن اب دعائیں دیتا ہوں کہ اگر وہ میری کتابیں چوری نہ کرتا تو "عودِ ہندی" کے بارے میں ایک اہم ترین انکشاف میں اور نہ جانے کتنا زمانہ لگتا۔

جب میں نے کام دوبارہ شروع کیا تو انجمن ترقی اردو کی لائبریری سے "عودِ ہندی" کا پہلا اڈیشن لے لیا۔ مرتب کیے ہوئے خطوط کا جب "عودِ ہندی" سے موازنہ کیا تو بہت زیادہ اختلافاتِ نسخ نکلے۔ دس پندرہ صفحات کا موازنہ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ "عودِ ہندی" کا وہ پہلا اڈیشن جو میری ملکیت تھا اور چوری ہوگیا تھا انجمن کے اس اڈیشن سے مختلف تھا۔ میں نے اپنے نوٹس کھنگالے تو ایک کاغذ پر گم شدہ "عودِ ہندی" کے بارے میں نوٹ کی ہوئی تفصیلات مل گئیں۔ یہ اڈیشن مطبعِ مجتبائی میرٹھ میں ۱۰ رجب ۱۲۸۵ھ کو شائع ہوا تھا۔ انجمن کے اڈیشن کو دیکھا تو وہ بھی مطبعِ مجتبائی میرٹھ میں اسی تاریخ کو چھپا تھا۔ پھر سوال یہ تھا کہ میں نے جو متن تیار کیا تھا، اس میں "عودِ ہندی" اور "اردوے معلیٰ" کے پہلے اڈیشنوں کو

بنیادی نسخوں کے طور پر استعمال کیا تھا اور تمام اختلافاتِ نسخ کی نشان دہی کی تھی، پھر اب وہ اتنا مختلف کیوں ہے۔ میں یہ تو مان سکتا تھا کہ "عودِ ہندی" میں کوئی لفظ حذف ہوگیا ہو اور میری نظر چوک گئی ہو لیکن اگر کسی عبارت میں "اُردوے معلّٰی" کے مقابلے میں "عودِ ہندی" میں کوئی لفظ زائد ہو تو یہ لفظ میں کہاں سے لایا۔ اور اس کی نشان دہی کیسے کی۔ پھر میں نے اپنے متن کا موازنہ "اُردوے معلّٰی" سے کیا تو معلوم ہوا کہ میں نے جن اختلافاتِ نسخ کی نشان دہی کی ہے وہ بالکل درست ہیں۔

انور الدولہ سعد الدین خاں بہادر شفق کے نام غالب کے ایک خط کے اختلافاتِ نسخ ملاحظہ ہوں۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ میرا پریشان ہونا کہاں تک جائز تھا۔

میرا تیار کیا ہوا متن	عودِ ہندی پہلا اڈیشن (انجمن)
قصیدد (میں نے اس لفظ کے بارے میں حاشیے میں لکھا تھا کہ "قصیدد" سہو کاتب ہے یہ لفظ "قصیدہ" ہے)	قصیدہ
ہرزہ	ہرذرہ
آوردہ (میں نے لکھا تھا کہ طباعت کی غلطی ہے، اصل لفظ "اور وہ" ہے۔)	اور وہ
ہمشیر	باہمشیر
سفر	اس نسخے میں یہ لفظ ندارد
حضورِ والا	حضور والد

ایک ہی خط میں اتنے اختلافاتِ نسخ دیکھ کر میں نے سوچا کہ میرا سب کام بے کار ہوگیا۔

میں نے اپنے متن کا موازنہ "عودِ ہندی" کے اُس اڈیشن سے کیا جو مولانا سید مرتضیٰ حسین فاضل نے مرتب کر کے مجلسِ ترقی ادب لاہور سے شائع کرایا تھا۔ اس کا متن تقریباً وہی' جو میں نے تیار کیا تھا۔ ان تمام شواہد کی روشنی میں میں اِس نتیجے پر پہنچا کہ میرا گم شدہ "عودِ ہندی" کا اڈیشن انجمن کے اڈیشن سے بالکل مختلف تھا۔

اتفاق سے انجمن کی لائبریری میں "عودِ ہندی" کا ایک اور پہلا اڈیشن نکل آیا۔ میں نے دونوں اڈیشنوں کے سرورق اور ترقیمے کی عبارتوں کا موازنہ کیا تو ایک حیرت انگیز اور دلچسپ انکشاف ہوا۔ معلوم ہوا کہ میں نے "عودِ ہندی" کے جس اڈیشن کو بنیادی نسخے کے طور پر استعمال کیا تھا وہ یہی ہے جو دوسری دفعہ میں نے انجمن سے حاصل کیا۔

اگرچہ ترقیمے میں تاریخِ اشاعت دونوں میں ایک ہی یعنی ۱۰ رجب ۱۲۸۵ھ دی ہے۔ لیکن سرورق کی عبارت میں معمولی سا فرق ہے۔ ایک اڈیشن کی سرورق کی عبارت یہ ہے:

خدا وند بے نسبتِ بندگی ۔ نہ پڑی درونہ پراگندگی
بفضلِ واہب العطیات خالق الخیر والحسنات
انشاء اردو لاجواب موسومہ بہ

عودِ ہندی

من تصنیف جناب استادِ زماں علامۂ عصر
اسد اللہ خاں المتخلص بغالب حسبِ فرمایش مجمع
خوبی ہا جہاں میاں محمد ممتاز علی خاں رئیس میرٹھ ۔
در مطبع مجتبائی واقع میرٹھ طبع گردید

دوسرے اڈیشن میں دوسری سطر میں " انشاء اردو" کے بجائے " انشاء اور دو" اور آخری سطر اس طرح ہے:

" در مطبع مجتبائی واقع میرٹھ باہتمام محمد ممتاز علی طبع شد"

دونوں اڈیشنوں کے سرورق کی عبارت میں اختلاف کا صاف مطلب ہے کہ دونوں الگ الگ اڈیشن ہیں۔

دونوں اڈیشنوں کی مماثلتیں

۱۔ دونوں اڈیشنوں کی کتابت کا بہ غور مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں کے کاتب مختلف ہیں لیکن دوسرے کاتب نے پہلے کاتب کی نقل انتہائی کامیاب طریقے سے کی ہے۔

۲۔ ایک اڈیشن میں ہر صفحہ جس لفظ پر ختم ہوتا ہے دوسرے اڈیشن میں بھی اسی لفظ پر ختم ہوتا ہے۔

۳۔ دونوں اڈیشنوں کا سائز ایک ہی ہے۔

۴۔ دونوں اڈیشنوں میں اُنیس سطری مسطر استعمال کیا گیا ہے۔

۵۔ دونوں اڈیشنوں کے آخری چار صفحوں میں ایک لفظ کا بھی اختلاف نہیں۔

اختلافات

۱۔ دونوں اڈیشنوں میں بے شمار اختلافاتِ نسخ ہیں۔

۲۔ دونوں کے صفحات تو ایک ہی لفظ پر ختم ہوتے ہیں لیکن سطریں عام طور سے مختلف الفاظ پر ختم ہوتی ہیں۔

۳۔ دونوں کے سرورق کی عبارت میں بھی اختلاف ہے۔ جس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔

۴۔ مخطوطات میں اور اُنیسویں صدی کے نصف آخر تک کی مطبوعات میں عام قاعدہ تھا کہ جس لفظ پر جفت صفحہ ختم ہوتا تھا۔ اسے دوسرے طاق صفحے کے شروع میں پھر لکھتے تھے۔ ایسا غالباً اس لیے کیا جاتا تھا کہ اگر صفحات آپس میں مل جائیں تو انھیں ترتیب

دیا جاسکے۔ "عودِ ہندی" کے ایک اڈیشن میں اس قاعدے کی پابندی کی گئی ہے جبکہ دوسرے میں بالکل نہیں کی گئی۔

"عودِ ہندی" کی ترتیب مکمل ہونے میں تقریباً پانچ سال لگے تھے، اور اس کی طباعت میں مزید دو سال لگ گئے۔ بالآخر اکتوبر ۱۸۶۸ء میں "عودِ ہندی" شائع ہوگئی۔ یہ نہیں معلوم ہوسکا کہ تعدادِ اشاعت کیا تھی۔

"عودِ ہندی" اور "اردوے معلیٰ" دونوں کے شائع ہونے سے پہلے ہی ان کی بہت شہرت ہوچکی تھی، اس لیے یہ امکان ہے کہ اردو والوں کو ان مجموعوں کا بہت انتظار رہا ہو۔ خواجہ غلام غوث خاں بے خبر نے ایک خط میں غالب کو لکھا تھا:

> "منشی ممتاز علی خاں صاحب کے بھانجے نے آپ کی اردو انشا مجھے دکھائی، سب چھپ گئی، ایک صفحہ اخیر کا باقی ہے۔ خان صاحب نے قطعہ تاریخ کے انتظار میں کہ کوئی کہہ دے، اسے پھینک رکھا ہے۔ مراد آباد میں اخبار "جلوۂ طور" کا مہتمم بھی وارد تھا وہ کہتا تھا کہ میں نے ویسے ہی ناتمام پچیس جلدیں لیں اور لوگوں کو دیں۔"

اس کا مطلب ہے کہ "عودِ ہندی" کی شہرت بہت ہوگئی تھی۔ ابھی اس کا آخری صفحہ چھپا بھی نہیں تھا کہ لوگ خریدنے لگے۔ "عودِ ہندی" جب شائع ہوئی ہے تو غالب ہندوستان گیر شہرت کے مالک تھے۔ اُن کے شاگرد اور مداح تقریباً تمام ہندوستان میں پھیلے ہوئے تھے۔ اس سے تقریباً دس سال پہلے جب اُن کی "دستنبو" شائع ہوئی تو تقریباً چھ مہینے میں ساری فروخت ہوگئی۔ جس پر غالب نے منشی شیونرائن آرام کو لکھا:

> "کتب "دستنبو" کے بک جانے سے میں خوش ہوا .... دیکھو صاحب تم گھبراتے تھے، آخر یہ جنس پڑی نہ رہی اور بک گئی۔" ۱۹ اپریل ۱۸۵۹ء

کیمسن نامی ایک انگریز مدارسِ غرب و شمال کے محکمے میں کسی عہدے پر فائز تھا۔ اُس نے

غالب سے اُن کی اردو نظم و نثر کی فرمایش کی تھی۔ غالباً یہ فرمایش طالب علموں کی ضرورت کے پیش نظر کی گئی تھی۔

ہنری اسٹوارٹ محکمہ صوبجات متحدہ کے محکمہ تعلیم میں ڈائرکٹر تھے۔ انھوں نے غالب سے اردو نثر میں ایک کتاب لکھنے کی فرمایش کی تھی۔ جسے وہ غالباً اسکول کے نصاب میں شامل کرنا چاہتے تھے۔ اس فرمایش کے سلسلے میں غالب نے منشی شیو نرائن آرام کو لکھا تھا:

"جناب ہنری اسٹوارٹ ریڈ صاحب کو ابھی میں خط نہیں لکھ سکتا

اُن کی فرمایش ہے اردو کی نثر، وہ انجام پائے تو اُس کے ساتھ اُن کو خط لکھوں'

اس کا مطلب ہے کہ اس زمانے میں اردو نثر کی ایسی کتابوں کی ضرورت تھی جنھیں نصاب میں شامل کیا جاسکے۔ اس لیے پورا امکان ہے کہ "عودِ ہندی" نصاب میں شامل کرلی گئی ہو یا لائبریریوں کے لیے کافی تعداد میں خریدی گئی ہو

امکان یہ بھی ہے کہ طباعت کے دوران میں کافی آرڈر آگئے ہوں۔ اس لیے بہت جلد دوسرے اڈیشن کی ضرورت پڑ گئی ہو۔

لیکن سوال یہ ہے کہ جب دوسرا اڈیشن چھاپا گیا تو پہلے اڈیشن کی ایسی نقل کیوں کی گئی کہ آخری صفحے پر تاریخِ طباعت میں بھی کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔

اب ری پرنٹ کی طباعت کی کئی صورتیں ہیں۔

۱ - خود منشی ممتاز علی خاں نے دوسرا اڈیشن شائع کیا۔ اگر ایسا تھا تو منشی ممتاز علی خاں "عودِ ہندی" میں فخر سے اس کا اعلان کرتے کہ پہلا اڈیشن ختم ہوگیا اور اب دوسرا اڈیشن چھاپا جارہا ہے۔ اگر منشی ممتاز علی خاں دوسرا اڈیشن شائع کرتے تو اسے چھپانے کی بہ ظاہر کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ اس زمانے میں مصنف کو معاوضہ دینے کا رواج نہیں تھا، بلکہ اُلٹا معاملہ ہوتا تھا، مصنف کچھ کتابیں خریدنے کی پیش کش کرتا تھا۔ غالب نے "دستنبو" کی پچاس جلدیں خریدنے کا وعدہ کیا اور اپنے ایک مداح رائے اُمید سنگھ سے اِن پچاس

جلدوں کی قیمت منشی شیونرائن آرام کو دلوائی تو انھوں نے "دستنبو" چھاپی، اس لیے منشی ممتاز علی خاں کے پاس کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہ اس طرح چُھپا کر دوسرا اڈیشن چھاپتے۔

دوسری صورت یہ ممکن ہے کہ "عودِ ہندی" کی مقبولیت دیکھ کر کسی نے جعلی اڈیشن شائع کر دیا۔ مگر یہ بھی قرینِ قیاس نہیں کیوں کہ "عودِ ہندی" کی اشاعت کے حقوق کسی کے نام محفوظ نہیں کیے گئے تھے اور پھر غالب کی وفات ہو چکی تھی اس لیے کوئی بھی دوسرا اڈیشن شائع کر سکتا تھا اور پھر دونوں اڈیشنوں کے آخری چار صفحے بالکل ایک ہیں، اور ایک ساتھ چھپے ہیں۔

تیسری صورت جو قرینِ قیاس ہے وہ یہ ہے کہ "عودِ ہندی" کے ۱۸۴ صفحات چھپ چکے تھے، قطعۂ تاریخِ طباعت کے انتظار میں چار صفحے کی آخری کاپی نہیں چھپی تھی۔ جب آخری کاپی چھپنے کی نوبت آئی تو منشی ممتاز علی خاں کو خیال آیا کہ "عودِ ہندی" کی مانگ بہت زیادہ ہے اور انھوں نے جتنی کتابیں چھپوائی ہیں وہ ناکافی ہیں۔ ۱۸۴ صفحے چھپے ہوئے کافی دن ہو گئے تھے اس لیے پریس میں ان کے پتھر بھی صاف کر دیے گئے تھے۔ مجبوراً ۱۸۴ صفحات کی کتابت کرا کے انھیں چھاپا گیا۔ آخری چار صفحے اتنی تعداد میں شائع کیے گئے کہ وہ پوری کتاب کے لیے کافی ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۸۴ صفحات کے متن میں تو بہت زیادہ اختلافات ہیں لیکن آخری چار صفحوں میں ایک لفظ کا بھی اختلاف نہیں۔

متنی نقاد کے لیے ایک اہم سوال یہ ہے کہ ان دونوں میں سے پہلا اڈیشن کس کو مانے اور ری پرنٹ کسے تسلیم کرے۔

یقینی طور پر تو نہیں کہا جا سکتا ہے لیکن میرا قیاس ہے کہ جس کتاب کے سرورق پر "باہتمام محمد ممتاز علی خاں" لکھا ہوا ہے یہ وہ اڈیشن ہے جو پہلے چھپا تھا۔ کیوں کہ (۱) اس اڈیشن پر محمد ممتاز علی خاں کا نام ہے (۲) اس اڈیشن کا کاتب دوسرے اڈیشن کے مقابلے میں زیادہ بہتر اور پختہ کار معلوم ہوتا ہے (۳) پہلے اڈیشن کا کاغذ زیادہ بہتر ہے جبکہ دوسرے اڈیشن کا کاغذ تجارتی انداز کا ہے۔

"عودِ ہندی" کے جتنے اڈیشن چھپے ہیں ان سب کے ساتھ یہ ہوا کہ کسی نے ایک اڈیشن کو بنیاد بنایا، اور کسی نے دوسرے کو۔ ۱۸۶۸ء میں مطبع نرائنی، دہلی سے "عودِ ہندی" کا جو اڈیشن چھپا تھا اس کی بنیاد "عودِ ہندی" کے پہلے اڈیشن پر ہے۔ اور ۱۸۸۷ء مطبع نول کشور سے جو چھپا تھا، اس کی بنیاد ری پرنٹ پر ہے۔ مولوی مہیش پرشاد کو بھی چوں کہ ری پرنٹ کا علم نہیں تھا اس لیے انھوں نے بھی صرف ایک ہی کو بنیاد بنایا ہے۔ جس کی وجہ سے ان کے بتائے ہوئے اختلافاتِ نسخ بے معنی ہو گئے ہیں۔

ہمیں اس کا یقین نہیں کہ ری پرنٹ کون سا ہے اور پہلا اڈیشن کون سا، اور اگر فرض کیجیے کسی طرح یہ ثابت بھی ہو جائے کہ پہلا اڈیشن کون سا ہے تو ہمیں اس کا علم نہیں کہ دوسرے اڈیشن کی کتابت پہلے اڈیشن سے ہوئی تھی یا اصل مسودے سے۔ حال آں کہ امکان یہی ہے کہ مسودے سے ہوئی ہوگی کیوں کہ مسودہ ہوتے ہوئے پبلشر ایک کتاب خراب کرنے پر تیار نہیں ہوتا۔

اس لیے متنی نقاد کے سامنے ایک ہی راستہ ہے کہ وہ دونوں اڈیشنوں کو بنیادی نسخوں کی حیثیت سے استعمال کرے۔ میں نے "غالب کے خطوط" کے تنقیدی اڈیشن کی تیاری میں ایسا ہی کیا ہے۔

اردوے معلّیٰ : پہلا اڈیشن

"عودِ ہندی" کی طباعت میں غیر معمولی تاخیر ہو رہی تھی اور غالب کے چاہنے والوں کا مطالبہ بڑھتا جا رہا تھا۔ دہلی میں حکیم غلام رضا خاں مالک "اکمل المطابع" نے غالب کے خطوط چھاپنے کا پروگرام بنایا۔ غالب نے بعض دوستوں کو خط لکھ کر اپنے خطوط یا اُن کی نقلیں فراہم کیں۔ یہ ممکن ہے کہ طباعت کی نگرانی بھی خود غالب نے کی ہو کیوں کہ "عودِ ہندی" کے مقابلے میں اس مجموعے میں کتابت کی غلطیاں کم ہیں۔ میر مہدی مجروح نے اس کا دیباچہ اور

قربان علی بیگ سالک نے خاتمہ لکھا اور کتاب دو حصوں میں ترتیب دی گئی۔ پہلے حصے میں وہ خطوط شامل کیے گئے جو آسان اور صاف زبان میں تھے اور جن میں ادبی مسائل پر گفتگو نہیں کی گئی، یہ حصہ طالب علموں کے لیے تھا۔ دوسرے حصے میں وہ خطوط شامل کیے گئے، جن میں مشکل مطالب بیان کیے گئے تھے۔ عرشی صاحب کا خیال ہے کہ: "غالباً پہلی بار صرف حصہ اوّل شائع ہو سکا، اس لیے کہ کتب خانۂ عالیہ رام پور میں جو نسخہ موجود ہے وہ مکمل ہوتے ہوئے صرف حصہ اوّل پر مشتمل ہے[1]"۔ اس کا بھی امکان ہے کہ پہلے حصے کو باقاعدہ کتاب بنا کر، طالب علموں کے لیے اس کے کچھ زائد نسخے چھپوائے گئے ہوں۔

کتاب کے آخر میں غالب کی ایک تحریر شامل ہے۔ جس میں غالب نے لکھا ہے کہ: "میں نے ازراہِ فرطِ محبت، اپنا حقِ تالیف نورِ چشم اقبال نشاں، حکیم غلام رضا خاں کو بخش دیا ہے"۔ اس مجموعے میں خطوں کی مجموعی تعداد ۳۷۰ ہے اور حسبِ ذیل حضرات کے نام کے خطوط اس میں شامل کیے گئے ہیں۔

نواب میر غلام بابا خاں بہادر (۱۰ خط)۔ میاں داد خاں سیاح (۲۹ خط)، منشی حبیب اللہ ذکا (۱۰ خط)، مرزا ہرگوپال تفتہ (۸۹ خط)۔ شاہزادہ بشیر الدین (۳ خط)۔ سید بدر الدین المعروف بہ فقیر (۵ خط)۔ چودھری عبدالغفور سرور (۱۶ خط)، میر سرفراز حسین (۲ خط)، میر مہدی مجروح (۴۳ خط)، شاہ عالم (۲ خط)۔ صاحب عالم (۲ خط)۔ عبدالغفور نساخ (۱ خط)۔ قاضی عبدالجمیل جنون بریلوی (۱۱ خط)۔ مردان علی خاں رعنا مرادآبادی (۲ خط)۔ عبدالرزاق شاکر (۲ خط)۔ مولوی عزیز الدین (۱ خط)، مفتی سید عباس (۱ خط)، حکیم غلام نجف خاں (۳۳ خط)، نجم الدین حیدر خاں (۱ خط)۔ نواب ابراہیم علی خاں وفا (۵ خط)، مولوی احمد حسن قنوجی (۲ خط)، حکیم سید احمد حسن مودودی (۱۱ خط)، تفضل حسین خاں (۱ خط)، مرزا حاتم علی مہر (۱۸ خط)۔ منشی نبی بخش (۲ خط) منشی عبداللطیف (۱ خط)۔ خواجہ غلام غوث خاں بے خبر (۱۴ خط)۔ نواب ضیاء الدین خاں نیر (۱ خط)۔ مرزا شہاب الدین خاں (۷ خط)۔ نواب

انور الدولہ شفق (۱۹ خط)۔ میرن صاحب (۳ خط)۔ قربان علی بیگ خاں سالک (۲ خط)۔ شمشاد علی بیگ خاں رضوان (۲ خط) باقر علی خاں کامل (۲ خط) حسین مرزا (۴ خط)۔ نواب یوسف مرزا (۱۲ خط)۔ منشی شیونرائن (۳۲ خط)۔ بابو ہرگوبند سہائے (۲ خط)۔ نواب امین الدین خاں بہادر (۶ خط)۔ نواب علاء الدین خاں علائی (۵۶ خط)۔ فرخ مرزا (۱ خط)۔ احمد حسین میکش (۲ خط) حکیم مرتضیٰ خاں (۱ خط) حکیم غلام رضا خاں (۱ خط)۔ ماسٹر پیارے لال (۳ خط)۔ جواہر سنگھ جوہر (۲ خط)۔ منشی ہیرا سنگھ (۱ خط)۔ اور بہاری لال مشتاق (۲ خط)۔ ظہیر الدین احمد خاں (۱ خط) یوسف علی خاں عزیز (۱ خط)۔

۴۶۴ صفحات پر مشتمل خطوط کا یہ مجموعہ ۲۱ ذی قعد ۱۲۸۵ھ (مطابق ۶ مارچ ۱۸۶۹ء کو شائع ہوا، گویا غالب کی وفات کے ۱۹ دن بعد۔

عودِ ہندی : ری پرنٹ

ستمبر ۱۸۸۱ء میں مطبع نول کشور لکھنؤ سے "عودِ ہندی" کا ایک ری پرنٹ شائع ہوا۔ اس کے خاتمے کی عبارت میں لکھا گیا ہے کہ: "پہلے شائقین کی تلاش سے مدوّن ہو کر مطبع مجتبائی میرٹھ میں طبع ہوا تھا، باقی نہیں رہا۔ لہٰذا فی الحال حسبِ اصرارِ اہلِ شوق مطبع نامی سرچشمۂ فتوت جناب منشی نول کشور صاحب دام اقبالہٗ میں ۔۔۔ رونقِ مرقع مانی ہوا۔"

یہ مجموعہ ۱۶۶ صفحات پر مشتمل، ″۶½ × ″۹½ کے سائز پر شائع ہوا تھا۔

اردوے معلّٰی : ری پرنٹ

یہ ری پرنٹ نسخ ٹائپ میں، ۵۰۷ صفحات پر مشتمل، مارچ ۱۸۸۳ء میں مطبع اردو گائیڈ، کلکتہ سے $\frac{۲۲\times۱۸}{۸}$ کے سائز پر شائع ہوا تھا۔ اس کے سرورق پر جو عبارت لکھی گئی ہے، اُس سے پتا چلتا ہے کہ بحکمِ سرکار، باہتمام سکریٹری بورڈ آف ایگزامینشن ، بذریعہ

صمد کبیرالدین احمد شائع ہوا۔ یہ کتاب نسخ ٹائپ میں شائع ہوئی۔ اس ری پرنٹ میں میر مہدی مجروحؔ کے دیباچے اور قربان علی بیگ خاں سالک کی تقریظ شامل نہیں کی گئی۔ خطوط میں سے ایسے فقرے بھی نکال دیے گئے، جو حکومت کے نقطۂ نظر سے پسندیدہ نہیں تھے۔

اردوے معلّٰی: ری پرنٹ

”اکمل المطابع“ سے ”اُردوے معلّٰی“ کا دوسرا ری پرنٹ ۱۰ فروری ۱۸۹۱ء کو شائع ہوا۔ ۳۸۴ صفحات پر مشتمل یہ مجموعہ ”۶¼ × ۹½“ کے سائز پر شائع ہوا۔ کتاب کے آخری ورق پر اجازت نامے کے عنوان سے حکیم غلام رضا خاں کا یہ اعلان شائع ہوا کہ: ”میں صرف ایک ہی دفعہ کے لیے ایک ہزار کانپی (کاپی) ”اردوے معلّٰی“ کی اجازت (جس کا کاپی رائٹ میرے پاس محفوظ ہے) سید فخرالدین صاحب مہتمم مطبع اور محمد اجمل خاں کو دیتا ہوں۔ آیندہ یہ بغیر میری اجازت کے بارِ دگر نہیں چھاپ سکتے۔“

اردوے معلّٰی: حصہ اوّل، حصہ دوم

”اردوے معلّٰی“ کا یہ اڈیشن مطبع نامی مجتبائی دہلی سے اپریل ۱۸۹۹ء میں شائع ہوا۔ اس کا پہلا حصہ ۳۸۴ اور دوسرا حصہ ۶۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا سائز ”۶¼ × ۹½“ ہے۔ دوسرے حصے پر محمد عبدالاحد نے مختصر دیباچہ لکھا ہے۔

اس مجموعے کے حصہ اول کے خطوط وہی ہیں، جو ”اردوے معلّٰی“ کے پہلے اڈیشن میں شائع ہوئے تھے۔ حصہ دوم کی ابتدا میں اطلاع دی گئی ہے کہ: ”حمد و صلوٰۃ کے بعد احقر العباد محمد عبدالاحد عفا عنہ الصمد شائقین و الاتمکین کی خدمت میں عرض کرتا ہے کہ جب اُردوے معلّٰی“ مرزا غالبؔ، ہندوستان کے سعدی مولانا حالیؔ کی اجازت سے مطبع میں چھپی تو مولانا موصوف نے ایک قلمی مسودہ مرزا غالبؔ کے رقعات کا، اپنے پاس سے بھی عنایت فرمایا،

جس کو احقر نے حصہ دوم "اُردوے معلّیٰ" کے نام سے نامزد کرکے اسی کے آخر میں شامل کردیا۔ اس حصے میں خاص کردہ رقعات ہیں، جن میں انھوں نے لوگوں کو اصلاحیں دی ہیں یا شاعری کے متعلق کوئی ہدایت کی ہے یا کوئی نکتہ بتایا ہے اور بعض کتابوں کے دیباچے اور ریویو بھی ہیں"۔ اس حصے میں مفتی سید رحمت علی خاں کی "سراج المعرفت" خواجہ بدر الدین خاں عرف خواجہ امان کی "حدائق انظار" پر غالب کے لکھے ہوئے دیباچے۔ بہادر شاہ ظفر کی ایک کتاب اور مرزا رجب علی بیگ سرور کی "گلزارِ سرور" پر تقریظیں۔ منشی حبیب اللہ ذکا کے دیوان اور سید فرزند احمد صفیر بلگرامی کے رسالۂ "تذکیر و تانیث" پر دیباچے ہیں۔ اس کے بعد مندرجہ ذیل خطوط ہیں ۔

مرزا ہرگوپال تفتہ	۲۴
ماسٹر پیارے لال	۱
حبیب اللہ ذکا	۵
میاں داد خاں سیاح	۵
شہزادہ بشیر الدین	۲
منشی کیول رام	۱
مولوی کرامت علی	۱
جواہر سنگھ جوہر	۱
منشی ہیرا سنگھ	۱
میر مہدی مجروح	۲

اردوے معلّیٰ: حصہ اوّل و دوم۔ دوسرا ری پرنٹ

مطبع مجتبائی دہلی سے اپریل ۱۸۹۹ء میں "اردوے معلّیٰ" حصہ اول و دوم جو شائع ہوا تھا،

اُس کا تعارف کرایا جا چکا ہے۔ عزیز دوست کاظم علی خاں کی عنایت سے مجھے معلوم ہوا کہ "اُردوے معلّیٰ" کے اس اڈیشن کے ساتھ بھی تقریباً وہی معاملہ ہے، جو "عودِ ہندی" کے پہلے اڈیشن کے ساتھ ہے۔ یعنی اس کا بھی ایک ایسا ری پرنٹ شائع ہوا تھا، جس کی تاریخِ طباعت وہی شائع کی گئی، جو پہلے اڈیشن پر تھی۔ میں نے جس نسخے سے استفادہ کیا ہے وہ تو وہی ہے جو پہلے اڈیشن کے طور پر شائع ہوا تھا۔ یہ اڈیشن انجمن ترقی اردو (ہند) کی لائبریری میں محفوظ ہے۔ کاظم علی خاں صاحب کے اطلاع دینے پر میں نے اس نسخے کی تلاش شروع کی تو ہردیال لائبریری میں یہ نسخہ مجھے مل گیا۔

اس ری پرنٹ کے آخر میں تاریخِ طباعت اس طرح دی گئی ہے:

"العبد۔ محمد عبدالاحد عفی عنہ پروپرائٹر مطبع مجتبائی دہلی ماہ اپریل ۱۸۹۹ء"

اس سے دھوکا ہوتا ہے کہ یہ پہلا اڈیشن ہے۔ جب کہ ایسا نہیں ہے۔ پہلے اڈیشن کے پہلے اور دوسرے حصے کے آخر میں محمد عبدالاحد کے نام کے ساتھ "عفی عنہ" لکھا گیا ہے، جب کہ ری پرنٹ میں دوسرے حصے کے آخر میں تو نام کے ساتھ "عفی عنہ" ہی چھپا ہے، لیکن پہلے حصے کے آخر میں محمد عبدالاحد کے ساتھ "مرحوم و مغفور" چھپا ہے۔ پہلے اڈیشن کے پہلے حصے کے ۳۸۴ اور دوسرے حصے کے ۶۴ صفحات ہیں۔ اس کے برعکس ری پرنٹ کے پہلے حصے کے ۳۴۷ اور دوسرے حصے کے ۵۶ صفحات ہیں۔

کتابت کی غلطیوں کی وجہ سے ان دونوں کتابوں کے متن میں خاصے اختلافات ہو گئے ہیں۔

یہ راز میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ری پرنٹ پر تاریخِ طباعت وہی کیوں چھاپی گئی جو پہلے اڈیشن پر تھی۔ کتاب شائع کرنے والوں کی غیر ذمہ داری کے سوا اور کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

اردوے معلّیٰ: حصہ اوّل

"اُردوے معلّیٰ" کا یہ ری پرنٹ مطبع فاروقی، دہلی سے ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا۔ ۳۸۴ صفحات

پر مشتمل یہ مجموعہ ۶¼″ × ۹½″ کے سائز پر شائع ہوا۔ کتاب کے آخر میں سید عبد السلام ابن سید محمد معظم پروپرائٹر مطبع فاروقی کی طرف سے اعلان ہے کہ: "کاپی رائٹ محفوظ ہے۔"

مکمل اردوے معلّٰی: مشتمل بر ہر دو حصہ

"اردوے معلّٰی" کا یہ اڈیشن ماہ ذی حجہ سنہ ۱۳۴۰ھ مطابق جولائی سنہ ۱۹۲۲ء مطبع مجیدی کانپور سے، ۳۸۴ صفحات پر مشتمل، ۶½″ × ۹¾″ کے سائز پر شائع ہوا۔

اب تک "اردوے معلّٰی" کے تمام مجموعوں میں مکتوب الیہم کی فہرست نہیں ہوتی تھی اور ایک ہی مکتوب الیہ کے نام کے خطوط یکجا ہونے کے بجاے مجموعے میں بکھرے ہوتے تھے۔ غالباً یہ پہلا مجموعہ ہے، جس میں محمد منیر منیرؔ نے ترتیبِ متن کا ابتدائی کام کیا ہے۔ سب سے پہلے غالبؔ کے مختصر سوانح دیے گئے ہیں۔ ہر مکتوب الیہ کے نام کے خطوط ایک جگہ کر دیے گئے ہیں۔ خطوط کی فہرست میں ہر مکتوب الیہ کے نام کے سامنے اُس کے نام کے کُل خطوط کی تعداد بھی لکھی گئی ہے۔

کتاب کے آخر میں یہ نوٹ دیا گیا ہے: "چوں کہ یہ مجموعہ بہ ترتیبِ نو بہ صرفِ زرِ کثیر، تیار کرایا گیا ہے۔ لہٰذا حقِ ترتیب بحقِ مطبع ہٰذا محفوظ ہے۔ کوئی صاحب بلا اجازتِ مالکِ مطبع اس ترتیب سے نہ چھاپیں۔"

اردوے معلّٰی مکمل: ہر دو حصہ مع ضمیمہ

غالبؔ کے خطوط کا یہ مجموعہ شیخ مبارک علی تاجر کتب، لاہور نے مطبع کریمی سے ستمبر سنہ ۱۹۲۲ء میں شائع کیا۔ ۴۲۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ ۶½″ × ۹½″ کے سائز پر چھاپا گیا ہے۔ شروع میں ادیبؔ کا لکھا ہوا، پندرہ صفحات پر مشتمل، مرزا غالبؔ دہلوی کے عنوان سے ایک دیباچہ ہے۔ اس دیباچے میں غالبؔ کی زندگی کے کچھ اہم واقعات بیان کیے گئے ہیں۔

مولانا حسرت موہانی نے اردوئے معلیٰ (علی گڑھ، دسمبر ۱۹۰۷ء) میں غالب کے قدر بلگرامی کے نام بائیس خط اور ایک خط شیخ لطیف احمد بلگرامی کے نام شائع کیے تھے۔ ان خطوط کو بھی اس مجموعے میں ضمیمے کے تحت شامل کرلیا گیا ہے۔ ضمیمے کے شروع میں شیر محمد سرخوش کی ۶ صفحات پر مشتمل ایک تحریر ہے، جس میں خطوط غالب کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔

اس مجموعے کے ری پرنٹ میرے پیش نظر ہیں۔ پہلا ری پرنٹ جیسا کہ عرض کیا گیا، ستمبر ۱۹۲۲ء میں شائع ہوا تھا۔ دوسرا ۱۹۲۶ء میں اور تیسرا ۱۹۳۰ء میں چھپا تھا۔ ممکن ہے اس کے بعد بھی کوئی اور ری پرنٹ شائع ہوا ہو۔

عودِ ہندی : ری پرنٹ

رام نرائن لال، الہ آباد سے "عودِ ہندی" کا یہ ری پرنٹ ۱۹۲۸ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ ری پرنٹ ۳۱۸ صفحات پر مشتمل اور ۴½" × ۶" کے سائز پر ہے۔ اس کی خصوصیت صرف یہ ہے کہ اس کے آخر میں ۶۴ صفحات پر مشتمل مشکل الفاظ کی فرہنگ شامل کی گئی ہے۔

ادبی خطوطِ غالب مرتبہ مرزا محمد عسکری

غالب کے خطوط کا اپنی نوعیت کا یہ پہلا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں ایسے خطوط کا انتخاب کیا گیا ہے، جن میں غالب نے "نکاتِ ادبیہ حل کیے ہیں، اشعار کے معنی سمجھائے ہیں اور شعرا کے متعلق رائے زنی کی ہے۔" ترپن صفحات کے دیباچے میں غالب کے خطوط کی خصوصیات تفصیل سے بیان کی گئی ہیں۔ اس موضوع پر شاید یہ پہلی جامع تحریر ہے۔ پھر خطوط کا انتخاب دیا گیا ہے۔ آخر میں غالب کے تینتس مکتوب الیہم کے حالاتِ زندگی بیان کیے گئے ہیں۔ اس انداز کا کام اردو میں پہلی بار ہوا ہے۔

یہ کتاب ۲۰۴ صفحات پر مشتمل ہے اور ۱۹۲۹ء میں نظامی پریس، لکھنؤ سے شائع ہوئی۔

مکاتیبِ غالب مرتبہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی

رام پور کے نواب یوسف علی خاں ناظم اور اُن کے صاحب زادے نواب کلب علی خاں، غالب کے شاگرد تھے۔ غالب کو دربارِ رام پور سے جولائی ۱۸۵۹ء سے سو روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی جو مرتے دم تک انھیں ملتی رہی، اس لیے غالب اور نوابانِ رام پور میں سلسلۂ مراسلت تھا۔ اہلِ اُردو کی خوش نصیبی ہے کہ غالب کے خطوط کا بڑا حصہ محکمۂ عالیہ دارالانشا، رام پور میں محفوظ تھا۔ ۱۹۳۶ء میں ریاست کے چیف منسٹر کرنل بشیر حسین زیدی نے ان خطوط کو مرتب کرا کے شائع کرنے کا منصوبہ تیار کیا۔ اس کام کے لیے اُن کی نظرِ انتخاب مولانا امتیاز علی خاں عرشی جیسے عالم پر پڑی۔

عرشی صاحب نے غالب کے ۱۱۷ خطوط کا تنقیدی متن تیار کیا۔ ان خطوط کے مکتوب الیہم کی تفصیل یہ ہے:

یوسف علی خاں ناظم	۴۲ (۳۸ اردو اور ۴ فارسی)
نواب کلب علی خاں	۶۵
نواب زین العابدین خاں بہادر عرف کلن میاں	۲
خلیفہ احمد علی رام پوری	۱
منشی سیل چند	۶
مولوی محمد حسن	۱

مکاتیبِ غالب کا پہلا اڈیشن ۱۹۳۷ء میں مطبع قیمہ بمبئی سے شائع ہوا۔ یہ اڈیشن ٹائپ کے ذریعہ چھاپا گیا تھا اور طباعت کا بہترین نمونہ تھا۔ اس کے چھے ری پرنٹ شائع ہوئے۔ آخری اور چھٹا ری پرنٹ ۱۹۴۹ء میں رام پور سے شائع ہوا۔

مولانا عرشی نے مکاتیبِ غالب میں ایک سو تراسی صفحات پر مشتمل ایک مبسوط مقدمہ لکھا۔

جس میں سرگذشتِ غالب، تصانیف، لوازماتِ امارت، انگریزی تعلقات، بہادر شاہ ظفر سے تعلقات، تعلقاتِ رام پور، انشاے غالب، متعلقاتِ انشا اور طباعت خطوط کے عنوانات کے تحت غالب کے سوانح لکھے ہیں اور غالب کی خطوط نگاری کی تفصیلات بیان کی ہیں۔

اس کے بعد خطوط کا متن دیا گیا ہے۔ متن کے بعد اشخاص و قبائل، مقامات اور کتب و اخبارات کے تین مکمل اشاریے دیے گئے ہیں۔ اس سے پہلے کسی نے خطوط غالب کے اشاریے تیار نہیں کیے تھے۔ عرشی صاحب نے پہلی بار یہ کام کیا ہے۔

مولانا عرشی نے ان خطوط کا تنقیدی اڈیشن انتہائی سائنٹی فک انداز میں اور غیر معمولی احتیاط سے تیار کیا ہے۔ پورے متن میں مشکل ہی سے کوئی غلطی نکلے گی۔ خطوط پر بڑی محنت اور عالمانہ انداز سے حواشی لکھے گئے ہیں۔ کسی بھی خط میں شاید ہی کوئی ایسا واقعہ ہو، جو تشریح طلب ہو، اور عرشی صاحب نے اس پر حاشیہ نہ لکھا ہو۔

میں یہ بات پورے وثوق اور پوری ذمہ داری کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ "مکاتیبِ غالب" سے پہلے کسی اردو متن کا ایسے سائنٹی فک انداز میں تنقیدی اڈیشن تیار نہیں ہوا، بلکہ اس کے بعد بھی جہاں تک میرا مطالعہ ہے، ایسا تنقیدی اڈیشن تیار نہیں ہوا جسے "مکاتیبِ غالب" کے مقابلے میں رکھا جا سکے۔

خطوطِ غالب : مرتبہ مہیش پرشاد

اگرچہ "عودِ ہندی" اور "اردوے معلیٰ" کے مختلف ری پرنٹ اور اڈیشن شائع ہوتے رہے لیکن غالب کے تمام خطوط کو یکجا کر کے اُن کا تنقیدی اڈیشن تیار کرنے کا خیال پہلی بار مولوی مہیش پرشاد کو آیا۔ انھوں نے ہر ممکن ذریعے سے غالب کے خطوط جمع کیے۔ بڑی محنت اور جستجو سے بعض ایسے اصل خطوط بھی تلاش کیے جو غالب کے خطوط کے مجموعوں میں شامل ہو چکے تھے۔ ان خطوط کی بنیاد پر نئے اڈیشن کا متن قائم کیا گیا۔ وہ خطوط بھی یکجا کیے گئے جو

مجموعوں میں شامل نہیں ہوسکے تھے لیکن مختلف رسائل میں شائع ہوچکے تھے۔ کچھ ایسے غیر مطبوعہ خطوط بھی حاصل کیے گئے جو غالبؔ کے مکتوب الیہم کے وارثوں کی ملکیت تھے۔

مولوی صاحب نے "مکاتیبِ غالب" مرتبہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی میں شامل نواب یوسف علی خاں ناظم کے نام سینتیس خطوط بھی اس اڈیشن میں شامل کیے۔

"عودِ ہندی" کے پہلے اڈیشن اور "اردوے معلّٰی" کے پہلے تین اڈیشنوں اور "مکاتیبِ غالب" اور غالبؔ کے جو اصل خطوط یا اُن کے عکس فراہم ہوئے تھے، انھیں بنیادی نسخوں کے طور پر استعمال کیا گیا۔

متن کی نظرثانی اور طباعت کی نگرانی ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مرحوم نے کی۔

مولانا عرشی کے "مکاتیبِ غالب" کے بعد غالبؔ کے خطوط کا یہ پہلا مجموعہ تھا، جس کی ترتیب اور طباعت میں اتنا اہتمام کیا گیا۔ یہ اڈیشن دو جلدوں میں شائع کرنے کا پروگرام بنایا گیا۔ پہلی جلد ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد سے ۱۹۴۱ء میں ٹائپ میں شائع ہوئی۔ مولوی صاحب دوسری جلد مرتب کر ہی رہے تھے کہ موت نے انھیں ہم سے چھین لیا۔ اور یہ کام ادھورا رہ گیا۔ انجمن ترقی اردو (ہند) نے مرحوم کے وارثوں سے دوسری جلد کا مسودہ اور خطوطِ غالب سے متعلق اکٹھا کیا ہوا تمام مواد خرید لیا۔ افسوس ہے کہ انجمن میں دوسری جلد کا مسودہ گم ہوگیا۔

پہلی جلد میں مرزا تفتہ۔ جواہر سنگھ جوہر۔ بدرالدین فقیر۔ عبدالجمیل جنون۔ انورالدولہ شفق۔ سید یوسف مرزا۔ یوسف علی خاں عزیز۔ احمد حسین میکش۔ غلام حسنین قدر بلگرامی۔ نواب یوسف علی خاں ناظم۔ حکیم غلام نجف خاں۔ میر مہدی مجروح۔ شہاب الدین احمد خان ثاقب۔ مرزا حاتم علی مہر۔ صاحبزادہ زین العابدین۔ علاء الدین احمد خاں علائی۔ شیو نرائن آرام اور دو ایسے خطوط جن کے مکتوب الیہم کے نام معلوم نہیں ہوسکے، شامل ہیں۔

کسی بھی متن کا تنقیدی اڈیشن تیار کرنے میں اہم مرحلہ املا کا ہوتا ہے۔ بعض متنی نقادوں کا خیال ہے کہ متن کی املا وہی ہونا چاہیے، جو مصنف کی تھی اور بعض کا خیال ہے کہ

قدیم متن کو جدید املا میں لکھا جانا چاہیے۔ طریقہ کوئی بھی اختیار کیا جائے، ضروری یہ ہے کہ شروع سے آخر تک ایک ہی طریقہ برتا جائے۔ "خطوطِ غالب" میں ایسا نہیں کیا گیا۔ جس کے دو وجوہ ہیں: ایک تو یہ کہ مولوی مہیش پرشاد کو غالب کی املا کے بارے میں کچھ غلط فہمیاں تھیں، اور دوسرے اس سلسلے میں انھوں نے کوئی باقاعدہ اصول نہیں بنایا۔

مولوی مہیش نے "خطوطِ غالب" کے دیباچے میں اطلاع دی ہے کہ انھیں کافی تعداد میں غالب کے اصل خطوط دستیاب ہو گئے ہیں لیکن مقدمے میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے غالب کی اردو املا کے بارے میں جو کچھ کہا ہے، اسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کی املا پر اظہار خیال کرتے ہوئے اُن کے پیشِ نظر بہت کم اصل خطوط تھے اور اُن خطوط میں غالب کی املا کی جو روش ہے، اسے ہی "خطوطِ غالب" کے متن کی املا بنا لیا گیا ہے، جو کسی طرح بھی درست نہیں۔ "خطوطِ غالب" کے مقدمے میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی لکھتے ہیں کہ "خطوطِ غالب کے متن کے قائم کرنے میں اُن تمام اصول کا لحاظ رکھا گیا ہے، جنھیں غالب مانتے تھے اور جو صحیح ہیں؛ البتہ اُن کی طرزِ کتابت کی پیروی میں "ہات" "رت" اور بعضے اور اردو لفظ اُسی طرح لکھے گئے جس طرح غالب لکھا کرتے تھے۔"[۱] "اردوے معلّٰی" کے پہلے اڈیشن پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ: "یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس نسخے کے کاتب نے غالب کی طرزِ کتابت یا املا کو اکثر جگہ برقرار رکھا ہے۔ گو بعضی باتوں میں اُس کی پابندی نہیں بھی کی ہے .... اس لیے "خطوطِ غالب" کا متن سوا اُس قلمی مواد کے جو میرے سامنے تھا، اسی نسخے پر قائم کیا گیا۔"[۲] ڈاکٹر صاحب کا یہ خیال درست نہیں۔ کیوں کہ غالب کے جو اصل خطوط دستیاب ہوئے ہیں، اُن کی اور "اردوے معلّٰی" طبع اول کے متن کی املا میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ مولوی صاحب نے عام طور سے "اردوے معلّٰی" طبعِ اول کی املا کو بنیاد بنایا ہے، جو ظاہر ہے غالب کی املا سے بہت مختلف ہے اور غالب کی املا کے بارے میں ڈاکٹر صاحب نے جو بیانات دیے ہیں، اُن میں سے بعض درست نہیں۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کہتے ہیں:

”ہاتھ“ کو غاؔلب نے جب لکھا ”ہات“ لکھا۔ یہ درست نہیں، کیوں کہ غاؔلب کے خطوط میں اس لفظ کی املا تین طرح ملتی ہے: ”ہاتھہ“، ”ہاتھ“ اور ”ہات“ اور بھی کئی لفظ ہیں جن کی املا غاؔلب نے ایک سے زیادہ طریقے سے کی ہے۔ مثلاً ”روانا۔ روانہ“۔ ”خط۔ خطّ“۔ ”میرزا مرزا“۔ ”مجھ۔ مجھہ“۔ ”نواب۔ نوّاب“۔ ”روپیے۔ روپیئے“ وغیرہ۔ مولوی مہیش نے ”ہات“، ”روانا“۔ ”خط“۔ کبھی ”میرزا“ اور کبھی ”مرزا“، ”روپئے“ اور ”نواب“ وغیرہ کی املا کو اپنایا ہے۔

مولوی مہیش نے ”خطوطِ غاؔلب“ کا متن تیار کرنے میں کئی طریقے اپنائے ہیں۔

ایک طریقہ تو یہ ہے کہ غاؔلب جن الفاظ کی املا ایک سے زیادہ طریقے سے کرتے تھے، ان میں سے ایک کو قبول کر لیا ہے۔ مثلاً ”روانا“، ”ہات“، ”ہاتی“ وغیرہ اور اس ترجیح کی وجہ نہیں بتائی۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ مولوی صاحب نے بھی ایک لفظ کی املا دو طرح کی ہے۔ مثلاً ”مرزا“ اور ”میرزا“۔ ”نواب“ اور ”نوّاب“ وغیرہ

تیسرا طریقہ یہ ہے کہ غاؔلب کی غلط املا کو اپنا لیا گیا ہے۔ مثلاً غاؔلب تمام فارسی الفاظ ”ز“ سے لکھتے تھے، کیوں کہ اُن کو غلط فہمی تھی کہ فارسی میں ”ذ“ نہیں ہے۔ مولوی صاحب نے بھی تمام فارسی الفاظ غاؔلب کی منشا کے مطابق ”ز“ سے لکھے ہیں۔

چوتھا طریقہ یہ ہے کہ اگر غاؔلب نے بعض الفاظ کی املا غلط کی ہے، تو اُن کو درست املا میں لکھا گیا ہے۔ مثلاً غاؔلب ”بالفعل“ اور ”بالکل“ لکھتے تھے۔ ان الفاظ کو مولوی صاحب نے درست املا میں لکھا ہے۔

پانچواں طریقہ انگریزی الفاظ کی املا میں اپنایا گیا ہے۔ عام طور سے غاؔلب انگریزی الفاظ کی املا جدید املا سے مختلف کرتے تھے۔ مثلاً غاؔلب ”گورمنٹ“، ”سارتی فکٹ“ اور ”لارد“ لکھتے تھے، ان الفاظ کو مولوی صاحب نے ”گورنمنٹ“، ”سارٹی فکٹ“ اور ”لارڈ“ لکھا ہے۔ اس کے برعکس بعض انگریزی الفاظ کی املا وہی کی گئی ہے جو غاؔلب کرتے تھے۔ مثلاً ”پنسن“ وغیرہ

مختلف طریقے اپنانے کی وجہ سے "خطوطِ غالب" کے متن کی اِملا ایسی ہوگئی ہے جو نہ جدید ہے اور نہ غالب کی ہے۔

"عودِ ہندی" اور "اردوے معلّٰی" میں کسی طرح کی کوئی ترتیب نہیں تھی۔ ایک مکتوب الیہ کے نام کے خطوط بھی یکجا نہیں کیے گئے تھے۔ غالباً پہلی بار "اردوے معلّٰی" کے اُس اڈیشن میں ترتیب قائم کی گئی جو مطبع مجیدی کانپور سے ۱۹۲۲ء میں شائع ہوا۔ اس اڈیشن میں ایک مکتوب الیہ کے نام کے تمام خطوط یکجا کیے گئے۔ لیکن ابھی صورت حال یہ تھی کہ ایک مکتوب الیہ کے نام کے بعض خطوط "عودِ ہندی" میں تھے اور بعض "اردوے معلّٰی" میں۔ اس کے علاوہ اب تک خطوط کی تاریخ وار ترتیب کسی مجموعے میں نہیں تھی۔ مولوی مہیش نے پہلی بار ایک مکتوب الیہ کے نام تمام دستیاب خطوط کو یکجا کر کے انھیں تاریخ وار ترتیب دیا۔

"عودِ ہندی" میں بہت کم خطوں پر تاریخِ تحریر ہے۔ غالباً مرتبین نے تاریخیں شائع کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس کے برعکس "اردوے معلّٰی" کے کافی خطوط پر تاریخیں ہیں۔ تاریخِ تحریر کے لحاظ سے غالب کے خطوط کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک تو وہ خطوط جن پر مکمل تاریخِ تحریر ہے۔ دوسرے خطوط وہ جن پر تاریخ یا مہینا یا دونوں ہیں لیکن سنہ نہیں ہے، اور تیسرے وہ جن پر تاریخِ تحریر بالکل نہیں۔ مولوی صاحب نے پہلی بار اُن خطوط کی تاریخِ تحریر متعین کرنے کی کوشش کی، جن پر تاریخ نہیں تھی۔ بعض خطوں پر توقوسین میں متعین کی ہوئی تاریخ دے دی ہے ۔ جن خطوں کی تاریخِ تحریر کا تعین نہیں ہو سکا لیکن زمانۂ تحریر کا اندازہ ہو گیا ہے تو اُن کی ترتیب اس طرح کی ہے کہ پڑھنے والے کو زمانۂ تحریر کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً اگر ایک ایسا خط ہے جس پر تاریخِ تحریر نہیں ہے اور مولوی صاحب کو اندازہ ہوا ہے کہ یہ اگست ۱۸۶۳ء میں لکھا گیا ہوگا تو اس خط کو جولائی ۱۸۶۳ء اور ستمبر ۱۸۶۳ء کے درمیان ترتیب دے دیا ہے۔ کافی خطوط ایسے ہیں جن کی تاریخِ تحریر کا تعین مولوی صاحب نے کیا ہے۔ لیکن انھوں نے کسی تاریخ کے بارے میں اپنے دلائل پیش نہیں کیے اور بقول: قاضی عبدالودود:

"متعدد خطوط کے زمانۂ کتابت کی نسبت جو اطلاعات دی گئی ہیں وہ غیر صحیح اور ناکافی ہیں" یہ حقیقت ہے کہ مولوی صاحب کی متعین کی ہوئی اکثر تاریخیں غلط ہیں۔ چوں کہ مولوی صاحب کے مرتبہ "خطوطِ غالب" کو مستند ترین نسخہ تسلیم کیا جاتا ہے اس لیے غالب کے سوانح نگاروں اور نقادوں نے ان خطوط کی تاریخِ تحریر کی بنیاد پر بعض ایسے نتائج نکالے جو درست نہیں تھے۔ ان ناقدوں کا قصور یہ نہیں تھا کہ انھوں نے بعض بے بنیاد باتیں کہیں، اُن کا قصور یہ تھا کہ انھوں نے مولوی صاحب کی متعین کی ہوئی تاریخوں پر بھروسا کیا۔ ان تاریخوں کے بارے میں چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

تفتہ کے نام ایک خط پر تاریخِ تحریر نہیں ہے لیکن خط میں غالب نے لکھا ہے: "آج پنجشنبہ، ۱۲ستمبر کو ڈاک میں بھجوا دیا"۔ مولوی صاحب کو نہ جانے کن وجوہ کی بنا پر خیال ہوا کہ یہ خط سنہ ۱۸۶۳ء میں لکھا گیا۔ لیکن مشکل یہ آ پڑی کہ سنہ ۱۸۶۳ء میں پنجشنبے کے دن ستمبر کی ۱۰ تاریخ تھی ۱۲ نہیں۔ مولوی صاحب تے فقرے کو اس طرح کر دیا: "آج پنجشنبہ ۱۰ستمبر [۱۸۶۳ء] کو ڈاک میں بھجوا دیا"۔ قوسین سے اندازہ ہوتا ہے کہ، قوسین میں اضافہ مولوی صاحب کا ہے۔ باقی تمام الفاظ غالب کے ہیں۔

حال آں کہ مولوی صاحب نے "۱۲ستمبر" کو بدل کر "۱۰ستمبر" کر دیا ہے۔ اور اس تبدیلی کی کوئی اطلاع نہیں دی۔ خطوط کے اندرونی شواہد اس حق میں ہیں کہ یہ تاریخ "۱۲ستمبر" بالکل درست ہے۔ سنہ کے تعین میں مولوی صاحب سے غلطی ہوئی یہ "سنہ ۱۸۶۳ء" نہیں "سنہ ۱۸۶۱ء" ہے۔ اب دوسری طرح کی مثالیں لیجیے۔ "اردوے معلّٰی" کے پہلے اڈیشن میں علائی کے نام ایک خط ہے جس پر تاریخِ تحریر "یکشنبہ ۲۷ جولائی سنہ ۱۸۶۴ء" ہے۔ تقویم کی رو سے اور خط کی اندرونی شہادتوں کی بنیاد پر یہ "سنہ ۱۸۶۲ء" ہونا چاہیے۔ مولوی صاحب نے "سنہ ۱۸۶۴ء" کو بدل کر "سنہ ۱۸۶۲ء" کر دیا ہے لیکن اس کی کوئی اطلاع نہیں دی۔ اس طرح تفتہ کے نام ایک خط پر تاریخِ تحریر "۷ دسمبر سنہ ۱۸۵۸ء" درج تھی، جو غلط تھی۔ مولوی صاحب نے اسے درست

کر کے "۲۷ دسمبر" کر دیا ہے۔ لیکن اس تصحیح کی طرف بھی کوئی اشارہ نہیں کیا۔

متنی تنقید کا ایک اہم ترین اصول یہ ہے کہ آپ متن کی ترتیب کے لیے جو بھی اصول اپنائیں، اُن کی پابندی شروع سے آخر تک کریں۔ مولوی صاحب نے ایسا نہیں کیا۔ ایسا لگتا ہے کہ جب بھی کسی قرأت کا مسئلہ سامنے آیا، انھوں نے اُس قرأت کی بنیاد پر فیصلہ کر لیا، کسی سوچے سمجھے اصول کی بنیاد پر نہیں۔ مولوی صاحب نے بے شمار قرأتیں بدلی ہیں اور اکثر اس کی اطلاع نہیں دی۔ جس سے یقیناً پڑھنے والے کو یہ تاثر ہوتا ہے کہ غالب کے اصل خط یا پہلے اڈیشن میں یہی قرأت تھی۔ حال آں کہ ایسا نہیں ہے۔ ایسے مقامات بہت کم ہیں جہاں مولوی صاحب نے قیاسی تصحیح کی نشان دہی کی ہے۔

متن کی ترتیب میں یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ ہم اس متن کا تنقیدی اڈیشن تیار کر رہے ہیں جو مصنف کے ذہن میں تھا نہ کہ اُس متن کا جو کاغذ پر منتقل ہوا۔ یعنی اگر مصنف سے عبارت میں کسی لفظ کا اضافہ ہو گیا ہے یا کوئی لفظ چھوٹ گیا ہے یا کوئی لفظ مکرر لکھا گیا یا کسی لفظ کی املا غلط لکھی گئی تو اِن میں سے کوئی چیز مصنف کی منشا کے مطابق نہیں۔ جو متن مصنف کے ذہن میں تھا اُسے کاغذ پر منتقل کرتے ہوئے سہو ہوا۔ اِس لیے ہمارے لیے ضروری ہے کہ تحریر کی غلطیوں کو درست کر کے حواشی میں اُن کی نشان دہی ضرور کر دیں۔ مولوی صاحب نے یہاں بھی کسی ایک طریقے کی پابندی نہیں کی۔

مثلاً "خطوطِ غالب" میں پہلی تصحیح کی نشان دہی ص ۷ پر کی گئی ہے۔ غالب کے اپنے قلم سے (اصل خط کا عکس "خطوطِ غالب" میں شامل ہے) ایک لفظ "سہرت" لکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ غالب کا سہو قلم ہے ورنہ یہ لفظ "سورٹھ" ہے۔ متن میں غلط قرأت رہنے دی گئی اور حاشیے میں صحیح قرأت دی گئی ہے۔

دوسری تصحیح کی نشان دہی ص ۱۴۲ پر کی گئی ہے۔ متن میں قرأت ہے: "وہ لکھتا ہے کہ راجا مرا، رانی مری۔" اصل قرأت یہ ہونی چاہیے۔ "وہ لکھتا ہے کہ راجا مرا، رانی نہیں مری"

مولوی صاحب نے متن میں قوسین میں "نہیں" کا اضافہ کر دیا۔ اور غلط قرأت حاشیے میں دے دی۔ یہ گویا تصحیح کا دوسرا طریقہ اپنایا گیا۔

ایک تصحیح کی نشان دہی ص ۱۵ پر کی ہے۔ متن میں "انیس روپیے کئی آنے" خط کی اندرونی شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے "انتیس روپیے کئی آنے" ہونا چاہیے۔ مولوی صاحب نے متن کو درست کر دیا اور اس کی نشان دہی حاشیے میں کر دی۔ یہاں تصحیحِ متن کا تیسرا طریقہ اپنایا گیا ہے۔

ان تین مثالوں کے ذریعے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ مولوی صاحب نے متنی تنقید کے کسی اصول کی پابندی نہیں کی۔ جہاں جو مناسب سمجھا ویسا کر لیا۔

"خطوط غالب" میں متن کی خاصی غلطیاں ہیں۔ تفتہ کے نام غالب کے ایک اصل خط کا عکس بھی مولوی صاحب نے "خطوطِ غالب" میں شامل کیا ہے۔ مولوی صاحب نے عکس کے ساتھ جو متن شائع کیا ہے، اس میں ایک غلطی ہے۔ اس طرح علائی کے نام بھی ایک خط کا عکس شائع کیا گیا ہے۔ مولوی صاحب نے اس گیارہ سطری خط کا جو متن شائع کیا ہے اس میں پانچ الفاظ غلط ہیں۔ تمام خطوں میں غلطیوں کی تعداد اتنی زیادہ نہیں ہے مگر پھر بھی متن کی غلطیاں ہیں کافی تعداد میں۔

متنی تنقید کا ایک اہم ترین اصول یہ بھی ہے کہ متنی نقاد یہ اطلاع دے کہ اس نے کس نسخے کو بنیادی نسخہ بنایا ہے اور کیوں بنایا ہے؟ مولوی صاحب نے دیباچے میں اطلاع دی ہے کہ غالب کے کون کون سے اصل خطوط مل گئے تھے جن سے انھوں نے مطبوعہ خطوں کا موازنہ کیا ہے۔ ان اصل خطوط کے بارے میں اطلاع دیتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے:

> "..... ! نور الدولہ شفق کے نام کے گیارہ خط اعظم گڑھ میں کسی صاحب کے پاس ہیں۔ پنڈت رامیشر دیال صاحب، ڈپٹی کلکٹر کا احسان مند ہوں کہ اُن کی

> وساطت سے ان خطوں سے مطبوعہ خطوں کا مقابلہ کیا جا سکا ..... نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی، ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب، خاں بہادر سید ابو محمد صاحب ممبر پبلک سروس کمیشن صوبۂ متحدہ، پنڈت گوپی ناتھ کنزرو صاحب ایڈوکیٹ الہ آباد، آغا محمد اشرف صاحب دہلوی، کرائسٹ کالج، کیمبرج، سید فرخ حیدر صاحب رئیس شمس آباد (فتح گڑھ)، پروفیسر حافظ محمود شیرانی صاحب، منشی اقبال حسین بیگ صاحب، اودے پور، سید بشیر الدین حیدر صاحب موسومی نے مختلف خطوط یا نقل مقابلے کے لیے عنایت فرمائے جن سے کتاب کی ترتیب و تکمیل میں بڑی مدد ملی[۱]۔"

مولوی صاحب کے ان بیانات نے خاصی دشواری پیدا کر دی ہے۔ انورالدولہ شفق کے نام غالب کے اکیس[۲] خطوط ہیں۔ ان میں سے گیارہ خط اصل شکل میں مولوی صاحب کو مل گئے تھے مگر ہمیں یہ پتا نہیں چلتا کہ وہ گیارہ خط کون سے تھے؟ شفق کے نام خطوط کے متن میں خاصے اختلافات نسخ ہیں۔ اگر مولوی صاحب اُن خطوط کی نشان دہی کر دیتے تو ظاہر ہے کہ ان کی قرأتوں کو مطبوعہ خطوں کی قرأتوں پر ترجیح دی جاتی۔ مولوی صاحب نے جن لوگوں سے خطوط یا نقلیں حاصل کی ہیں اُن کا شکریہ ادا کیا ہے۔ اِن حضرات کی تعداد کافی ہے لیکن وہ کون سے خطوط ہیں جن کی اصل یا نقل ان حضرات سے دستیاب ہوئی تھی، اس کی کوئی اطلاع نہیں دی گئی۔ اگرچہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے "مقدمہ" میں لکھا ہے کہ:

> "خطوطِ غالب" کی دوسری جلد کے آخر میں کچھ ضمیمے اور اشاریے ہوں گے۔ انہی میں ایک فہرست خطوں کی ہوگی اور اُس میں ہر خط کے متعلق یہ بتایا جائے گا کہ وہ کہاں سے لیا گیا ہے[۳]۔"

یہ ضمیمے اور اشاریے "خطوطِ غالب" کی اُس دوسری جلد میں شامل تھے، جس کا مسودہ مولوی مہیش کے انتقال کے بعد انجمن ترقی اردو (ہند) نے خرید لیا تھا اور جو انجمن کے دفتر سے گم ہو گیا۔

میرا خیال ہے کہ مولوی مہیش نے غالب کے کئی اصل خط اور کئی خطوں کے عکس بھی فراہم کیے تھے جنھیں مرحوم دوسری جلد میں شامل کرنا چاہتے تھے۔ بدنصیبی ہے کہ ان میں سے بیشتر ضائع ہو گئے۔ انجمن ترقی اردو (ہند) میں میر مہدی مجروح کے نام غالب کا اصل خط، کچھ لفافوں پر غالب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے پتے اور خطوطِ غالب کے کچھ عکس موجود ہیں۔ انجمن کو یہ سب چیزیں مولوی مہیش کے کاغذات میں سے ملی تھیں۔

تمام کوتاہیوں کے باوجود ہمیں یہ اعتراف کرنا چاہیے کہ مولوی صاحب نے پہلی بار غالب کے خطوط کو تاریخ وار ترتیب دیا تھا۔ انھوں نے خطوں کے تنقیدی اڈیشن کی تیاری میں جس محنت اور دیدہ ریزی سے کام لیا، وہ قابلِ قدر ہے۔ اگر مرحوم متنی تنقید کے اہم اصولوں کی پابندی کرتے اور متن کی درستی کا خاص خیال کرتے تو یہ کام بہت معیاری ہوتا۔

نادراتِ غالب مرتبہ آفاق حسین آفاق

میرن دہلوی نے منشی نبی بخش حقیر کے نام غالب کے ۳۷ خطوط اور منشی عبداللطیف کے نام ایک خط فراہم کر کے مرتب کیے تھے۔ خطوں کا یہ مجموعہ مسودے کی شکل میں میرن صاحب کے نواسے آفاق حسین آفاق کو ملا۔ انھوں نے یہ تمام خطوط "نادراتِ غالب" کے نام سے مرتب کیے۔ "نادراتِ غالب" ۱۹۴۹ء میں ادارۂ نادرات، کراچی سے شائع ہوئی۔ آفاق صاحب نے مولانا امتیاز علی خاں عرشی کی مرتبہ "مکاتیبِ غالب" کو اپنا نمونہ بنایا۔ شاید اسی لیے یہ کام خاصا اچھا ہوا۔ ۱۳۵ صفحات پر مشتمل مقدمہ ہے، جس میں مختلف عنوانات کے تحت منشی نبی بخش حقیر اور غالب کے حالات اور غالب کی تصنیفات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ غالباً پہلی بار غالب کے ۹۲ شاگردوں کے مختصر حالات بیان کیے گئے ہیں۔ آخر میں متن کے حواشی درج ہیں۔ کتابت کی غلطیاں بہت زیادہ ہیں۔

خطوطِ غالب مرتّبہ غلام رسول مہر

غلام رسول مہر نے غالب کے تمام خطوط یکجا کر کے "خطوطِ غالب" کے نام سے سنہ ۱۹۵۱ء میں کتاب منزل، لاہور سے شائع کرائے۔ اس مجموعے میں "مکاتیبِ غالب" اور "نادراتِ غالب" کے خطوط شامل نہیں کیے گئے۔ غالب کے خطوط کا ایسا مجموعہ جس میں تقریباً سب خطوط شامل کر لیے گئے ہوں، پہلی بار شائع ہوا۔

"خطوطِ غالب" کے اب تک کم سے کم تین ہی پرنٹ شائع ہو چکے ہیں۔ اس کا ایک ری پرنٹ جو غالباً تیسرا ہے، نسخ ٹائپ میں پنجاب یونی ورسٹی، لاہور سے بھی شائع ہوا۔ طباعت کے اعتبار سے یہ ری پرنٹ بہت صاف ستھرا اور خوبصورت چھپا ہے۔

مہر صاحب نے اس مجموعے میں ہر مکتوب الیہ کے نام کے تمام خطوط تاریخ وار ترتیب دیے ہیں۔ مکتوب الیہم کے حالات بھی ہیں لیکن مآخذ کے حوالے کہیں نہیں دیے گئے۔ خطوط میں بہت سے ایسے واقعات کا ذکر ہے جنھیں عام قاری نہیں سمجھ سکتا تھا، مہر صاحب نے حاشیے میں ایسے بہت سے واقعات کی تفصیل بیان کر دی ہے۔

جن لوگوں نے مولانا مہر کی دوسری تصنیفات کا مطالعہ کیا ہے، وہ میرے اس بیان کی تصدیق کریں گے کہ مولانا ایک جید عالِم تھے لیکن نہ جانے کیوں غالب کے خطوط کی ترتیب میں انھوں نے بہت لاپروائی بلکہ غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا۔ مولانا نے متنی تنقید کے کسی اصول کی پابندی نہیں کی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے "خطوطِ غالب" کے عام نسخے لے کر کاتب کو دے دیے اور کتابت پڑھنے کا کام دوسروں سے لیا۔ میں پوری ذمہ داری سے کہہ سکتا ہوں کہ آج تک غالب کے خطوط کا کوئی مجموعہ اتنا غلط نہیں چھپا، جتنا کہ "خطوطِ غالب" ہے۔ متن کی حالت یہ ہے کہ کوئی صفحہ ایسا نہیں ہے، جس میں متن کی آٹھ دس سے کم غلطیاں ہوں۔ صرف ایک مثال دیتا ہوں۔ نواب حسین مرزا کے نام غالب کے چار خط "اردوے معلّٰی" میں شامل تھے۔

دو مزید خطوں کے عکس بعد میں شائع ہوئے۔ مولانا نے چھئوں خط اپنے مجموعے میں شامل کر لیے۔ جن خطوط کے عکس اُن کے پیشِ نظر تھے، اُن میں سے ایک کے متن میں تیس اور دوسرے کے متن میں نو غلطیاں ہیں۔ اس لیے اس مجموعے پر مزید تبصرے کی گنجایش نہیں ہے۔

غالبؔ کی نادر تحریریں مرتبہ خلیق انجم

غالبؔ کے خطوط کا یہ مجموعہ اس نوعیت سے دوسرے مجموعوں سے مختلف ہے کہ اس میں صرف وہ خطوط شامل کیے گئے ہیں جو "عودِ ہندی" اور "اردوے معلّیٰ" میں شامل ہونے سے رہ گئے تھے اور بعد میں مختلف رسالوں میں شائع ہوئے۔

یہ مجموعہ ۱۹۶۱ء میں مکتبہ شاہراہ دہلی سے شائع ہوا۔ اس میں مختلف لوگوں کے نام غالبؔ کے ۴۹ خطوط اور ۱۹ مختلف تحریریں ہیں۔

اس مجموعے میں متنی تنقید کے کسی بنیادی اصول کی پابندی نہیں کی گئی، متن کی ترتیب میں بہت لاپروائی سے کام لیا گیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ متن میں بے شمار غلطیاں راہ پاگئیں اور ایک اچھا کام ناتجربہ کاری کی نذر ہو گیا۔

خطوطِ غالبؔ مرتبہ مہیش پرشاد بہ نظرِ ثانی مالک رام

مہیش پرشاد کے انتقال کے بعد اُن کے مسودات اور ادبی کاغذات انجمن ترقی اردو (ہند) نے خرید لیے۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے مشورے سے انجمن نے خطوطِ غالبؔ کا دوسرا اڈیشن تیار کرنے کا کام مالک رام صاحب کو سونپا۔ یہ کام دو جلدوں میں ہونا تھا۔ پہلی جلد تو وہی جو چھپ چکی تھی اور دوسری جلد کا مسودہ انجمن نے حاصل کر لیا تھا۔ بدنصیبی سے دوسری جلد کا مسودہ انجمن سے گم ہو گیا۔

"خطوطِ غالبؔ" کا دوسرا اڈیشن انجمن ترقی اردو سے ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا۔ اس وقت

مالک رام صاحب ہندوستان سے باہر تھے، انجمن کی غلطی سے اس کتاب پر مرتب کی حیثیت سے مالک رام صاحب کا نام چھپ گیا۔

مالک رام صاحب نے دوسرے اڈیشن میں منشی نبی بخش حقیر اور اُن کے صاحبزادے منشی عبداللطیف کے نام کے خطوط کا اضافہ کیا ہے۔

مالک رام صاحب نے مولوی مہیش پرشاد کی متعین کی ہوئی بعض تاریخوں سے اختلاف کیا ہے اور کچھ ایسے خطوں کی تاریخِ تحریر کا تعین کیا ہے جن پر تاریخ نہیں تھی۔

عودِ ہندی اور اردوے معلّیٰ مرتّبہ سید مرتضیٰ حسین فاضل

۱۹۶۹ء میں ہندوستان اور پاکستان، دونوں ملکوں میں غالب کا جشن منایا گیا۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ غالب پر خاصی تعداد میں کتابیں اور مضامین شائع ہوئے۔ اکثر رسالوں نے غالب نمبر مرتب کیے۔ اس طرح غالب کے سوانح، شخصیت و سیرت اور غالب کے معاصروں، شاگردوں، دوستوں اور رشتہ داروں پر کافی مواد سامنے آگیا۔ لیکن اس جشن کا ایک نقصان بھی ہوا، اور وہ یہ کہ جشن سے کچھ عرصے پہلے ہی غالب پر کتابیں لکھنے یا غالب کی کتابیں مرتب کرنے کے پروگرام بنائے گئے۔ چوں کہ وقت کم تھا اور ہر حال میں ایک محدود مدّت میں کام پورا کرنا تھا، اس لیے جشنِ غالب کے موقع پر چھپنے والی بعض کتابوں کا معیار غیر اطمینان بخش اور بعض کا بہت پست رہا۔ فاضل صاحب کی مرتب کی ہوئی ”عودِ ہندی“ اور ”اردوے معلّیٰ“ کا شمار بھی انھیں کتابوں میں ہے۔ اگرچہ ان کی مرتبہ ”عودِ ہندی“ ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئی تھی۔

فاضل صاحب کے ان دونوں کتابوں کے بہ غور مطالعہ کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ عجلت کی وجہ سے انھوں نے (۱) پہلے سے اپنے کام کا خاکہ نہیں بنایا (۲) تنقیدی اڈیشن تیار کرنے کے لیے باقاعدہ اصول نہیں بنائے۔ (۳) متن کی املا پہلے سے طے نہیں کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہی لفظ کی املا دو دو طرح ملتی ہے (۴) متن کی ترتیب میں خاصی

غیر ذمہ داری سے کام لیا اور (۵) اشاریے دوسرے لوگوں سے بنوائے۔

پہلی بات تو یہ سمجھ میں نہیں آئی کہ فاضل صاحب نے "عودِ ہندی" اور "اردوئے معلّٰی" ان دونوں مجموعوں کو الگ الگ کیوں مرتب کیا۔ خطوط کے یہ مجموعے ایک صدی قبل یعنی اُس زمانے میں ترتیب دیے گئے تھے جب ترتیبِ متن کا اردو میں کوئی شعور نہیں تھا۔ ان مجموعوں میں ایک مکتوب الیہ کے نام کے خطوط یکجا نہیں کیے گئے، بلکہ پورے مجموعے میں بکھرے ہوئے ہیں۔ پھر ان مجموعوں میں خطوط، تاریخ وار مرتب نہیں کیے گئے۔ "اردوئے معلّٰی" کے پہلے اڈیشن میں سب سے پہلے میر غلام بابا خاں بہادر کے نام کے خطوط ترتیب دیے گئے ہیں اور یہ ترتیب اس طرح ہے کہ پہلا خط ۲۲ مارچ ۱۸۶۶ء کا، دوسرا ۶ ستمبر ۱۸۶۳ء کا تیسرا ۲ اپریل ۱۸۶۷ء کا چوتھا ۶ اپریل ۱۸۶۴ء کا اور پانچواں ۹ اگست ۱۸۶۶ء کا ہے۔ باقی تمام خطوط کی ترتیب اسی طرح ہے۔ ظاہر ہے کہ ترتیب کا یہ طریقہ بہت غلط ہے۔ ہم "اردوئے معلّٰی" اور "عودِ ہندی" کے پہلے اڈیشنوں کے مرتبین کو قصوروار نہیں ٹھہرا سکتے لیکن موجودہ زمانے میں اور خاص طور سے عرشی صاحب کے "مکاتیبِ غالب" کی اشاعت کے بعد اگر کوئی متنی نقاد اسی ترتیب کو قائم رکھے تو اُسے معاف نہیں کیا جا سکتا۔ غرض یہ ہے کہ "عودِ ہندی" اور "اردوئے معلّٰی" کو الگ الگ شائع کرنے اور ان کی ترتیب میں کوئی تبدیلی نہ کرنے کا مالی منفعت کے علاوہ اور کوئی جواز سمجھ میں نہیں آتا۔

دونوں مجموعوں کو الگ الگ مرتب کرنے سے جو خامیاں پیدا ہوئیں اُس کی پہلی مثال یہ ہے کہ شاہ عالم کے نام کا خط "عودِ ہندی" اور "اردوئے معلّٰی" دونوں مجموعوں میں شامل ہے۔ میں نے فاضل صاحب کے مرتبہ "اردوئے معلّٰی" اور "عودِ ہندی" میں اس خط کے متن کا مقابلہ کیا تو معلوم ہوا کہ دونوں مجموعوں کے متن میں صرف ایک قرأت کو "اردوئے معلّٰی" کے متن کے حوالے سے درست کیا گیا۔ باقی قرأتوں کے اختلاف کی کسی مجموعے میں کوئی اطلاع نہیں دی گئی۔

دونوں مجموعوں میں اس خط کے متن میں سترہ متنی اختلافات ہیں۔ اور دونوں مجموعوں میں

اس خط کی علاماتِ اوقاف میں بھی کافی فرق ہے۔ "سودِ ہندی" کے متن میں چار وضاحتی حاشیے دیے گئے۔ اسی طرح بغل گیر ہونا، تموز، مقتضی جیسے لفظوں کے معنی "عودِ ہندی" کے حاشیوں میں دیے گئے ہیں "اردوے معلّٰی" میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔

"اردوے معلّٰی" کے متن کے بارے میں حاشیے میں بتایا گیا ہے کہ "اردوے معلّٰی" کے پہلے اڈیشن میں یہ خط کس صفحے پر ہے اور یہ بھی اطلاع دی گئی ہے کہ مختلف مطبوعہ مجموعوں میں یہ خط کس کس صفحے پر ہے،" "عودِ ہندی" کے حاشیے میں اس طرح کی کوئی اطلاع نہیں۔ میں نے یہاں صرف شاہ عالم کے نام غالب کے خط کا جائزہ لیا ہے، ورنہ تمام خطوط کا کم و بیش یہی حال ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ میں شاہ عالم کے نام کے کس متن پر بھروسہ کروں، اس متن پر جو فاضل صاحب نے "عودِ ہندی" میں مرتب کیا ہے، یا اُس متن پر جسے "اردوے معلّٰی" میں ترتیب دیا ہے۔ متن کے اختلافات کی وجہ عجلت کے علاوہ یہ بھی ہے کہ ایک ہی خط کے متن کو دو جگہ مرتب کیا گیا ہے۔ اور دونوں جگہ غیر ذمے داری سے کام لیا گیا ہے۔

فاضل صاحب کے مرتبہ مجموعوں میں متن کی غلطیاں ہیں، لیکن مولانا غلام رسول مہر کے مرتبہ "خطوطِ غالب" کے مقابلے میں خاصی کم۔ بعض خطوط ایسے بھی ہیں جن کی ہر سطر میں متن کی غلطی ہے۔ مثلاً مولوی ضیاء الدین خاں ضیاؔ کے نام کے خط کا عکس، ڈاکٹر مختار الدین نے علی گڑھ میگزین، غالب نمبر، سنہ ۴۹۔۱۹۴۸ء میں شائع کیا تھا۔ فاضل صاحب نے یہ خط "اردوے معلّٰی" کی جلد دوم کے حصہ سوم میں شامل کیا ہے۔ میں نے ایک ضرورت سے خط کے عکس کا فاضل صاحب کے مرتبہ متن سے مقابلہ کیا تو معلوم ہوا کہ فاضل صاحب کے متن میں پندرہ غلطیاں ہیں۔ ایک خط کے متن میں پندرہ غلطیاں پوری کتاب کو ناقابلِ اعتبار بنانے کے لیے کافی ہیں۔

فاضل صاحب نے "عودِ ہندی" اور "اردوے معلّٰی" دونوں میں مختلف طریقے اختیار

کیے ہیں۔ مثلاً "عودِ ہندی" میں حاشیے میں یہ نہیں بتایا کہ متعلقہ خط "عودِ ہندی" کے کس کس اڈیشن کے کس صفحے پر ہے۔ جب کہ "اردوے معلّٰی" میں ہر خط کے بارے میں یہ اطلاع دی گئی ہے۔

"عودِ ہندی" کے حاشیوں میں احیاناً، پایاں، رحیل، متوسط، مغشوش، توام اور زمرہ جیسے آسان لفظوں کے معنی دیے گئے ہیں۔ "اردوے معلّٰی" میں بہت ہی کم الفاظ کے معنی دینے کی ضرورت محسوس کی گئی ہے۔ "عودِ ہندی" کے ان حاشیوں کو دیکھ کر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ بے وجہ ضخامت بڑھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

غالبؔ کے اکثر خطوط پر تاریخِ تحریر نہیں ہے۔ فاضلؔ صاحب نے کوشش کی ہے کہ ہر خط پر تاریخِ تحریر ضرور دیں۔ اپنی اس کوشش میں خطوں میں تاریخ یا سنہ لکھ کر اس طرح کے بیانات دینے پڑے ہیں: "میرے خیال میں ۱۸۵۸ء کے وسط یا بعد کا ہے"۔ یہ نہیں بتایا گیا کہ اس خیال کی بنیاد کن دلائل پر ہے۔ ایک خط پر تاریخِ تحریر دی ہے "اکتوبر ۱۸۵۸ء" اور اس کے بارے میں لکھا ہے "تقریباً وسط اکتوبر یا اس سے پہلے"۔ اس خیال کی کوئی وجہ بیان نہیں کی گئی اور یہ بھی نہیں بتایا کہ سنہ کا تعین کس بنیاد پر کیا گیا ہے۔ ذکاؔ کے نام ایک خط پر "اردوے معلّٰی" میں تاریخِ تحریر صرف "۲۷ فروری" ہے۔ فاضلؔ صاحب نے اسے ۱۸۶۷ء کا بتایا ہے اور اس پر حاشیہ لکھا ہے کہ "اردوے معلّٰی" میں تاریخ موجود نہیں ہے"۔ یہ نہیں بتایا کہ ۱۸۶۷ء کہاں سے آیا۔ کیول رام ہشیارؔ کے نام کے خط کو ۱۸۶۰ء کا بتایا گیا ہے اور لکھا ہے کہ "صرف ایک تخمینہ ہے"۔ منشی ہیرا سنگھ کے نام کا خط فاضلؔ صاحب ۱۸۶۷ء کا بتاتے ہیں اور اس کے بارے میں حاشیے میں لکھتے ہیں "پہلے حصے میں ایک خط ہے جو ۱۴ جنوری ۱۸۶۸ء کو لکھا گیا ہے، غالباً یہ اس کے کچھ ماہ بعد کا خط ہے"۔

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اس طرح کی تاریخیں دینے سے ہمارے نقاد اور غالبؔ پر کام کرنے والے محقق گمراہ ہو جاتے ہیں۔ وہ تاریخِ تحریر پر بھروسہ کر کے بعض اہم نتائج اخذ کر لیتے ہیں اور حاشیہ دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ جب تک ہمارے پاس معقول دلائل

نہ ہوں تاریخِ تحریر ہرگز نہیں دینی چاہیے۔

ممکن نہیں ہے کہ فاضل صاحب کو یہ اندازہ نہ ہو گیا ہو کہ غلام رسول مہر کا مرتب کیا ہوا متن ملط ترین ہے، پھر بھی اکثر مہر کے متن کی قرأتیں، اختلافاتِ نسخ کے طور پر پیش کی گئی ہیں۔ ان قرأتوں کا انتخاب کس بنیاد پر کیا گیا ہے، یہ نہیں بتایا گیا کیوں کہ اگر مہر کے متن کے تمام اختلافاتِ نسخ پیش کیے جاتے تو یقیناً ایک صفحے کی تین چار سطروں میں فاضل صاحب کا مرتبہ متن ہوتا اور باقی صفحے پر مہر صاحب کے متن کے اختلافاتِ نسخ۔

فاضل صاحب نے غالب کے تمام خطوں کے اشاریے مرتب کر کے غالب پر کام کرنے والوں کی مشکل حل کرنے کی کوشش کی تھی۔ مگر افسوس ہے کہ انھوں نے یہ کام ایسے لوگوں سے کرایا جو غالب کے دوستوں، شاگردوں اور عزیزوں سے قطعی واقف نہیں ہیں اور جن کا مبلغِ علم بھی بہت کم معلوم ہوتا ہے۔

اکثر ایک ہی نام کے مختلف لوگوں کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ مثلاً

محمد علی خاں۔ ۴۵۵ - ۵۰۰ - ۷۹۶ - ۸۸۹

ص ۵۰۰ پر جن محمد علی خاں کا ذکر ہے وہ مرزا حاتم علی مہر کے دوست ہیں۔

ص ۴۵۵ کے محمد علی خاں، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے لڑکے ہیں۔

ص ۷۹۶ کے محمد علی خاں دہلی کے رہنے والے ہیں۔ اور

ص ۸۸۹ کے محمد علی خاں کو مثال کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ تفتہ کے نام اس خط میں غالب نے یہ بتایا ہے کہ نام کے ساتھ خطابات کس طرح لکھے جاتے ہیں اور محمد علی خاں کو مثال کے طور پر لیا ہے۔ اس لیے یہ نام اشاریے میں نہیں آسکتا۔ جانی بہاری لال رند کو اشاریہ میں چار ناموں سے الگ الگ فہرست کیا گیا ہے۔ بابو صاحب، جانی بانکے لال رند، جانی جی، اور رند، جانی بانکے لال' یہ کام وہی کر سکتا ہے جس نے خطوطِ غالب کا مطالعہ نہ کیا ہو۔ اس لیے ظاہر ہے کہ فاضل صاحب نے یہ کام کسی اور سے کرایا ہے۔

اشاریے میں اس طرح کی غلطیاں اتنی کثرت سے ہیں کہ پورا اشاریہ گمراہ کُن ہوگیا ہے۔

- "عودِ ہندی" کے دیباچے میں فاضل صاحب نے خود اپنے کام کی داد دیتے ہوئے لکھا ہے :

> "مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ "عودِ ہندی" کے اس نسخے سے پہلے کوئی اڈیشن اس اہتمام سے مرتب و شائع نہیں ہوا۔ حال آں کہ اس کی افادیت کے پیشِ نظر اتنی بڑی غفلت حیرت انگیز ہے۔"

پورے بیان سے تو نہیں، البتہ اِس کے آخری فقرے سے متفق ہوں، اس لیے میں اس فقرے کو دہرانا چاہتا ہوں :

> "اس کی افادیت کے پیشِ نظر اتنی بڑی غفلت حیرت انگیز ہے۔"

غالبؔ کی اُردو املا کی خصوصیات

دنیا میں کوئی زبان ایسی نہیں ہے جس کے تمام الفاظ ٹھیک اسی طرح لکھے جاتے ہوں جس طرح اُن کا تلفظ ادا کیا جاتا ہے، اس کی ایک بڑی وجہ تو یہ ہے کہ کسی بھی زبان کا رسم الخط اتنا مکمل نہیں ہوتا کہ اس زبان کے صوتی نظام کو پوری طرح تحریری روپ دے سکے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ زندہ زبان میں ہر سطح پر تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ چنانچہ تلفظ اور املا کے مقابلے میں تلفظ کی تبدیلی کی رفتار زیادہ تیز ہوتی ہے، اس لیے اکثر الفاظ کے تلفظ اور املا میں مطابقت نہیں رہتی۔ یہی وجہ ہے کہ ماہرینِ لسانیات جب کسی زبان کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہ صرف بولی جانے والی زبان کو اپنی بنیاد بناتے ہیں، اُس کے تحریری روپ کو نہیں۔

تلفظ اور املا کے اس طرح کے اختلافات کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ ایک ہی زمانے میں مختلف لوگ ایک لفظ کا تلفظ مختلف طریقے سے کرتے ہیں لیکن لکھتے ایک ہی طرح ہیں اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک لفظ کو مختلف لوگ مختلف طریقے سے لکھتے ہیں لیکن اُن کا تلفظ ایک ہی کرتے ہیں۔

اردو دنیا کی اُن زبانوں میں سے ایک ہے جن میں املا اور تلفظ میں عدمِ مطابقت کچھ زیادہ ہی ہے۔ اس کے کئی لسانی اور تاریخی اسباب ہیں۔ پہلا سبب تو یہی ہے کہ اردو کے

صوتی نظام اور رسم الخط کا ارتقا ایک ساتھ نہیں ہوا۔ کھڑی بولی نے مکمل زبان بننے کے بعد فارسی رسم الخط کو اپنایا۔ اس لیے اردو کا صوتی نظام اور رسم الخط ایک دوسرے سے مکمل طور سے ہم آہنگ نہیں ہو سکے۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ اردو اور فارسی دونوں آریائی خاندان کی زبانیں ہیں، لیکن دونوں کا صوتی نظام خاصا مختلف ہے۔ فارسی کی مخصوص آوازوں کو اردو میں لکھنا مشکل نہیں تھا کیوں کہ اردو نے فارسی رسم الخط کو اپنا لیا تھا لیکن اردو کی کچھ مخصوص آوازیں ایسی ہیں، جو فارسی میں نہیں ہیں، وہ ہیں ہکار اور معکوس آوازیں۔

جن لوگوں کو پہلی بار اردو کو تحریری روپ دینے کی ضرورت پڑی وہ عام طور سے صرف فارسی رسم الخط سے واقف تھے۔ اس لیے انھوں نے اردو کے لیے فارسی رسم الخط کو اپنا لیا۔ کیوں کہ ان کے سامنے اس کے علاوہ اور کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ اردو کی ہکار اور معکوس آوازوں کو فارسی رسم الخط میں تحریری روپ دینے میں خاصی پریشانی ہوئی۔ ان آوازوں کے لیے ایسی تحریری علامتیں ایجاد کی گئیں جو صدیوں تک ارتقا کی منزلوں سے گزرتی رہیں۔

تقریباً سولھویں صدی سے اردو میں نظم و نثر کی صورت میں کتابیں لکھی جا رہی ہیں۔ لیکن ابتدائی تین صدی تک اردو املا کے ارتقا کی رفتار بہت سُست رہی۔ انیسویں صدی کے شروع کے ساٹھ ستّر برسوں میں یعنی عہدِ غالب میں اردو املا کے مسائل پر سنجیدگی سے غور کیا جانے لگا۔ اور اردو املا میں سب سے زیادہ تبدیلیاں اسی عہد میں رونما ہوئیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ ہندوستان میں پریس قائم ہونے کی وجہ سے اردو کتابوں کی طباعت کی رفتار خاصی تیز ہوگئی۔ فورٹ ولیم کالج اور دہلی کالج کی مطبوعات نے اس رفتار کو اور بھی تیز کر دیا۔ انیسویں صدی کے آغاز میں برطانوی حکومت کی انتظامیہ اور تعلیمی پالیسی کی وجہ سے اردو کو ہمارے تعلیمی نظام میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہوگئی، اس لیے اردو پڑھنے والوں کا حلقہ بہت وسیع ہوگیا۔ اب اردو محض شعر و شاعری کی نہیں بلکہ روزمرہ کے

استعمال کی زبان بن گئی۔ زبان کا چلن بڑھنے کی وجہ سے، اس کی املا پر بھی زیادہ غور کیا گیا۔ انتظامی امور کے سلسلے میں جب انگریزوں نے اردو کی تعلیم حاصل کرنا شروع کی تو اردو املا کی معیار بندی کی ضرورت کو پہلے سے زیادہ محسوس کیا گیا ہوگا۔

غالبؔ کے آخری زمانے میں اردو املا میں بعض اہم بنیادی تبدیلیاں ہوئیں۔ مثلاً معکوسی اور ہکار آوازوں کی علامتوں میں باقاعدگی پیدا کی گئی۔ جس کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا۔

اسی زمانے میں یاے مجہول اور یاے معروف میں باقاعدہ تفریق قائم کی گئی۔

غالبؔ ہی کے زمانے میں امیرؔ مینائی نے اپنی کتابوں میں املا کا ایسا اہتمام کیا کہ ان کتابوں پر ایک نظر ڈالنے ہی سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ اردو املا کی معیار بندی کی کوشش کی جارہی ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں مولانا احسنؔ مارہروی نے املا کے مسائل پر غالباً پہلی بار باقاعدہ مضامین لکھے۔

اردو املا کی معیار بندی کے سلسلے میں پہلی منظم کوشش، انجمن ترقی اردو (ہند) نے کی۔ انجمن نے ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی سربراہی میں ایک املا کمیٹی تشکیل دی۔ اس کمیٹی نے بہت سی سفارشیں پیش کیں۔ جن میں سے کچھ چلن میں آگئیں اور کچھ اہلِ اردو کے لیے قابلِ قبول نہ ہوئیں۔ چند سال پہلے ترقی اردو بورڈ نے ایک املا کمیٹی بنائی۔ ڈاکٹر عابد حسین اس کے صدر مقرر ہوئے۔ اس کمیٹی کی سفارشات ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے مرتّب کرکے شائع کیں۔ پچھلے پچاس برسوں میں ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، مولانا امتیاز علی خاں عرشیؔ، ڈاکٹر نذیر احمد، قاضی عبدالودود، ڈاکٹر مسعود حسین خاں، ڈاکٹر گیان چند جین، ڈاکٹر شوکت سبزواری، حیات اللہ انصاری وغیرہ نے اردو املا پر خاصی تعداد میں مضامین لکھے۔

پاکستان میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے "اردو املا اور رسم الخط" کے نام سے اردو املا پر اور ہندوستان میں رشید حسن خاں نے "اردو املا" کے نام سے کتابیں لکھیں۔

غالبؔ کی اردو تحریروں میں پرانی املا بھی ملتی ہے اور وہ تبدیلیاں بھی نظر آتی ہیں

جو اُس عہد کی املا میں ہو رہی تھیں۔

غالب نے اپنے بعض شاگردوں کے نام خطوط میں املا کے بارے میں ہدایتیں دی ہیں، جنھیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کی کوشش تھی کہ اُن کے شاگرد صحیح املا لکھیں۔ وہ منشی بہاری لال مشتاق کو لکھتے ہیں:

> "چوں کہ تم کو مشاہدۂ اخبارِ اطراف اور خود اپنے مطبع کے اخبار کی عبارت کا شغلِ تحریر ہمیشہ رہتا ہے۔ بہ تقلید اور انشا پردازوں کے تمھاری عبارت میں بھی املا کی غلطیاں ہوتی ہیں۔ میں تم کو جا بہ جا آگاہ کرتا رہتا ہوں۔" ۷ جون ۱۸۶۸ء

غالب کے خطوط میں اردو املا کے بارے میں ہدایتیں پڑھ کر یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ غالب اردو املا پر بہت توجہ دیتے تھے، لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ غالب اس سلسلے میں خاصے غیر محتاط تھے۔

غالب کی املا پر تبصرہ کرنے سے پہلے میں املا کا یہ بنیادی اصول بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ اگر ایک لفظ کی املا مخصوص طریقے سے رائج ہے اور کوئی شخص اس کے خلاف لکھے تو وہ غلط املا ہے۔ مثلاً "کرسی" کو "کرصی" لکھا جائے اور "سرور و نشاط" کو "صرور و نشات"، تو یہ غلط املا ہے۔ لیکن اگر کچھ لوگ ایک لفظ کی املا ایک طرح اور کچھ لوگ دوسری طرح کرتے ہیں۔ مثلاً کچھ لوگ "کئے"۔ "دیئے"۔ "جئے" لکھتے ہیں اور کچھ لوگ "کیے"۔ "دیے"۔ "جیے"، تو ہم ایک کو صحیح اور دوسرے کو غلط نہیں کہہ سکتے۔ ہمیں کہنا چاہیے کہ املائیں مختلف ہیں۔

پرتھوی چندر مرحوم نے "مرقع غالب" میں غالب کے ایک سو تین اصل خطوط کے عکس شائع کیے ہیں اس کے علاوہ خاصی تعداد میں غالب کے اصل خطوط کے عکس مختلف رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ یہ تمام عکس اس مجموعے میں شامل کر دیے گئے ہیں۔ غالب کی املا کا مطالعہ ان تمام عکسوں کی بنیاد پر کیا گیا ہے۔

یائے مجہول اور یائے معروف

اردو کی قدیم املا میں یائے مجہول اور یائے معروف میں اس طرح فرق نہیں کیا جاتا تھا جیسا کہ جدید املا میں کیا جاتا ہے۔ دراصل لکھنے والا اس معاملے میں لفظ کی املا سے زیادہ فنِ خوش خطی کا خیال رکھتا تھا۔ اسی لیے یائے مجہول کی جگہ یائے معروف اور یائے معروف کی جگہ یائے مجہول لکھنا عام تھا۔ اس کا ایک بڑا نقصان یہ ہوا کہ اکثر اوقات اردو کے قدیم متنوں میں یہ نہیں معلوم ہو پاتا کہ مصنف بعض الفاظ کا تلفظ کس طرح کرتا تھا اور کبھی کبھی ہمیں اس کا بھی علم نہیں ہو پاتا کہ مصنف کسی مخصوص لفظ کو مذکر لکھتا ہے یا مونث۔

غالب کے ہاتھ کی جتنی تحریریں ملی ہیں، اُن میں یائے مجہول اور یائے معروف میں بالکل فرق نہیں کیا گیا۔ غالب کے زمانے میں ان دونوں میں تفریق شروع ہو چکی تھی لیکن کچھ لوگ اس کی پابندی کرتے تھے اور کچھ لوگ نہیں۔ "عودِ ہندی" اور "اردوئے معلّٰی" کے پہلے اڈیشن تقریباً ایک ہی زمانے میں شائع ہوتے ہیں "عودِ ہندی" میں یائے مجہول اور یائے معروف میں کوئی فرق نہیں کیا گیا۔ جب کہ "اردوئے معلّٰی" میں اس فرق کا پورا خیال رکھا گیا ہے۔

الفاظ کو ملا کر لکھنے کا رجحان

قدیم املا میں الفاظ کو ملا کر لکھنے کا عام رجحان تھا۔ جب کہ جدید املا میں کوشش کی جاتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ الفاظ کو الگ الگ لکھا جائے۔ غالب املا کی قدیم روش سے متاثر ہیں۔ ان کے ہاں الفاظ کو ملا کر لکھنے کا رجحان بہت زیادہ ہے۔ چند الفاظ ملاحظہ ہوں:

نوابصاحب۔ بیگمصاحبہ۔ فصلربیع۔ ہنڈویکا۔ نکروں۔ نگیا۔ جوابمیں۔ غزلونکو۔ وغیرہ

قدیم املا میں "اُن نے" اور "اُس سے" بھی ملا کر "اُنّے" اور "اُسّے" لکھتے تھے۔

غاؔلب نے ان الفاظ کو الگ الگ لکھا ہے۔

اعراب بالحروف

ترکی رسم الخط میں اعراب بالحروف کا قاعدہ ہے۔ یعنی اگر لفظ کے پہلے صوتی رکن میں ضمہ ہے تو اُسے واؤ سے بدل دیا جاتا ہے۔ قدیم اردو املا میں بھی یہی طریقہ رائج تھا جو ممکن ہے ترکی رسم الخط سے لیا گیا ہو۔ غاؔلب کے زمانے میں واؤ کے بدلے فارسی پیش کا استعمال کر کے "اوس" اور "اون" وغیرہ کو "اُس" اور "اُن" لکھا جانے لگا تھا۔ غاؔلب نے اُس نئے طریقے کو نہیں اپنایا۔ اُن کے ہاں اعراب بالحروف کی یہ شکلیں ملتی ہیں۔

اوس ۔ اون ۔ اونھوں ۔ اوترنا ۔ اوٹھنا ۔ پونہچنا (غاؔلب نے اکثر پہنچنا لکھا ہے لیکن ایک دو دفعہ پونہچنا بھی لکھا ہے) اودھر ۔ اوتنا ۔ اوتنی وغیرہ

پیش کا استعمال

غاؔلب واؤ معروف ، واؤ مجہول ، پیش معروف اور پیش مجہول پر التزاماً فارسی پیش لگاتے ہیں۔ مثلاً

تُم ۔ طُرفہ ۔ دُو ۔ سُر ۔ کھُل ۔ تُو ۔ جُرم ۔ چُکا ۔ رہُو اور جُو وغیرہ

ہاکار آوازوں کی لکھاوٹ

اردو کی ہاکار آوازیں خالص ہند آریائی ہیں اور تعداد میں گیارہ ہیں ۔ یہ آوازیں ہیں:

پھ ۔ تھ ۔ ٹھ ۔ چھ ۔ کھ ۔ بھ ۔ دھ ۔ ڈھ ۔ جھ ۔ گھ اور ڑھ

فارسی میں ہاکار آوازیں نہیں ہیں۔ اس لیے جب ان آوازوں والے الفاظ کو فارسی رسم الخط میں لکھا گیا تو خاصی دقّت ہوئی۔ ابتدا میں ہاکار آوازوں کے تحریری اظہار

کے لیے ہائے ملفوظ کا استعمال کیا گیا۔ غالب کے عہد ہی میں ان آوازوں کے لیے ہائے مخلوط یعنی "دوچشمی ھ" ایجاد کی گئی۔ غالب کے ہاں "دوچشمی ھ" کا استعمال بہت ہی کم ہوا ہے۔ ان کی املا میں ہاکار آوازوں کی مختلف شکلیں ملتی ہیں۔

اگر ہائے مخلوط لفظ کے شروع میں آئے تو غالب اس طرح املا کرتے ہیں:

بہوکا (بھوکا) بہاری (بھاری) کہانا (کھانا) گہر (گھر) تہوڑا (تھوڑا)

اگر ہائے مخلوط لفظ کے درمیان میں ہو:

رکہی (رکھی) اکہاڑ (اکھاڑ) بوڑہا (بوڑھا) پڑہا (پڑھا) آنکہیں (آنکھیں) ہاتی (ہاتھی) آخری لفظ میں ہاکار آواز کو بندشی آواز "ت" سے بدل دیا ہے۔

اگر ہاکار آواز لفظ کے آخر میں آئے تو اس کی مختلف شکلیں ملتی ہیں:

اودہ (اودھ) پڑہ (پڑھ) باندہ (باندھ) بڑھ (بڑہ) چڑہ (چڑھ)

کبھی ہائے ملفوظ اور ہائے مختفی دونوں کا استعمال کیا ہے۔ مثلاً:

دیکہہ (دیکھ) ہاتہہ (ہاتھ) مجہہ (مجھ) ساتہہ (ساتھ) سمجہہ (سمجھ) جگہہ (جگہ) کہہ (کہ)

بعض لفظوں کی املا اس طرح بھی کی ہے کہ لفظ کے آخر میں آنے والی ہائے مخلوط کو سادہ بندشی آوازوں سے بدل کر اس میں ہائے مختفی کا اضافہ کر دیا ہے۔ مثلاً

مجہ (مجھ) تجہ (تجھ) سمجہ (سمجھ)

اور کبھی لفظ کے آخر میں آنے والی ہائے مخلوط کو صرف سادہ بندشی آوازوں سے بدل دیتے ہیں مثلاً

ہات (ہاتھ) میرٹ (میرٹھ) رت (رتھ)

لفظ کے آخر میں الف یا ہائے مختفی

فارسی میں ایسے الفاظ کی تعداد خاصی ہے، جن کے آخر میں تلفظ الف (۰ ح) کا ہے، لیکن انھیں ہائے مختفی سے لکھتے ہیں۔ ممکن ہے ایران میں ہائے مختفی اور الف کے تلفظ میں فرق رہا ہو لیکن ہندوستان میں کوئی فرق نہیں رہا۔ اس لیے اردو میں فارسی کے کچھ ایسے الفاظ جن کے آخر میں اصلاً ہائے مختفی یا ہائے ملفوظ تھی، الف سے لکھے جانے لگے اور بعض اردو الفاظ جنھیں الف سے لکھنا چاہیے تھا، ہائے مختفی سے لکھے جانے لگے۔ اگر ہر اردو لکھنے والا اس طریقے کو اپنا لیتا تو پھر یہی املا رائج ہو جاتی۔ ہوا یہ کہ کچھ لوگ تو ہائے مختفی پر ختم ہونے والے فارسی الفاظ کو ہائے مختفی سے لکھتے رہے اور کچھ نے الف سے لکھنا شروع کر دیا۔ اس طرح کچھ لوگوں نے بعض اردو الفاظ کو فارسی رسم الخط کے انداز پر ہائے مختفی سے لکھنا شروع کر دیا۔

غالب کے ہاں ایسے الفاظ کی املا کی مختلف صورتیں ملتی ہیں۔ غالب اردو کے بعض الفاظ کو الف ہی سے لکھتے ہیں مثلاً:

پتا۔ مہینا۔ بھروسا۔ کمرا

لیکن بعض اردو الفاظ کو ہائے مختفی یا ہائے ملفوظ سے لکھتے ہیں مثلاً:

لالہ۔ پودینہ۔ راجہ۔ کلکتہ۔ پرچہ۔ تھانہ۔ چبوترہ اور کیوڑہ

بعض فارسی الفاظ کو فارسی رسم الخط میں ان کی املا کے برخلاف غالب الف سے لکھتے ہیں مثلاً:

چھاپے خانا۔ خاکا۔ نقشا وغیرہ۔

ہائے مختفی یا الف پر ختم ہونے والے الفاظ واحد محرف یا جمع قائم کی صورت میں

اردو میں ہائے مختفی اور الف پر ختم ہونے والے الفاظ کا تلفظ فارسی اور عربی کے اس طرح کے الفاظ سے مختلف ہے۔ فارسی میں قاعدہ یہ ہے کہ لفظ کسی بھی زبان کا ہو، جب وہ واحد محرف یا جمع قائم کی صورت میں ہو تو لفظ کے آخر کا الف یا ہائے مختفی یائے مجہول سے بدل جاتے ہیں۔ مثلاً اگر "قصیدہ" واحد کی صورت میں آئے تو یوں لکھا جائے گا: "میں نے قصیدہ لکھا" لیکن اگر جمع کی صورت میں آئے تو اس کا تلفظ اور املا دونوں بدل جاتے ہیں اور اس طرح لکھا جاتا ہے "میں نے قصیدے لکھے" اسی طرح واحد محرف حالت میں "کلکتہ" کو "کلکتے" لکھیں گے۔ مثلاً "میں کلکتے گیا"۔

غالب کی تحریروں میں ان الفاظ کی املا ان طریقوں سے ملتی ہے۔

۱۔ واحد محرف کی حالت میں ہائے مختفی پر ختم ہونے والے الفاظ

جمعہ کے دن
اس رقعہ کو
ابرِ رحمت کے شکریہ میں
میرے مشاہدہ میں

غالب نے اس حالت میں انبالے، کلکتے اور "قصیدے" بھی لکھا ہے، مگر بہت کم۔

۲۔ واحد محرف کی حالت میں "الف" پر ختم ہونے والے الفاظ غالب نے ہمیشہ یائے مجہول سے لکھے ہیں۔ مثلاً

کتاب پر دھبے آگئے۔
اب بڑھاپے میں کیا کروں۔
چھجے پر بیٹھا تھا

گزارے کو کچھ تو چاہیے۔

۳ ۔ جمع قائم کی حالت میں ہائے مختفی یا ہائے ملفوظ پر ختم ہونے والے الفاظ

میں نے صفحے گنے۔

میں نے قصیدے بھیجے۔

سو روپیے وصول پائے

(غالب نے اس حالت میں اکثر "روپیہ" اور کم تر "روپیے" لکھا ہے۔)

اس کے کئی قاعدے ہیں۔

۴ ۔ جمع قائم کی حالت میں الف پر ختم ہونے والے الفاظ

چار مہینے ہوئے۔

تم نے کئی پتے لکھے۔

چھاپے کی کتاب۔

اکیلے کیسے جاؤں۔

اس تجزیے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جن لفظوں کے آخر میں ہائے مختفی یا ہائے ملفوظ یا الف ہوتا ہے، جمع قائم کی حالت میں غالب انھیں یائے مجہول سے لکھتے ہیں اور الف پر ختم ہونے والے الفاظ جب واحد محرف کی حالت میں آتے ہیں تب بھی غالب انھیں یائے مجہول سے لکھتے ہیں۔

لیکن ہائے مختفی پر ختم ہونے والے الفاظ جب واحد محرف کی حالت میں ہوں تو غالب عام طور سے "ہ" سے لکھتے ہیں

نون غنہ اور نون ساکن

غالب کے زمانے تک عام رواج تھا کہ جن الفاظ کے آخر میں "ن" آتا ہو، چاہے وہ

نون غنہ ہو چاہے نون ساکن، دونوں صورتوں میں نون غنہ سے لکھتے تھے۔ غالب نے بھی ایسے تمام الفاظ نون غنہ سے لکھے ہیں۔ مثلاً

ہون - مین - وہان - آوَن - نہین - شادیان - نگران - کرین - لوگون۔
فرمائین - اٹھائین وغیرہ

بعض حروف کو ملا کر لکھنے کا رجحان

غالب ایک ہی لفظ کے بعض ایسے حروف کو ملا کر لکھتے تھے، جنھیں جدید املا میں لازمی طور پر الگ الگ لکھا جاتا ہے مثلاً :

دو (دو) "د" اور "و" ملا کر
بہادر (بہادر) "ا" اور "د" ملا کر
موجد "و" اور "د" ملا کر
زیادہ (زیادہ) "ا" "د" اور "ہ" ملا کر
حال (حال) "ا" اور "ل" ملا کر

"ذ" اور "ز"

غالب کا دعوے تھا کہ فارسی میں "ذ" نہیں ہے۔ اس لیے وہ تمام فارسی الفاظ "ز" سے لکھتے تھے۔ گذشتن۔ گذاشتن۔ گذاردن اور پذیرفتن اور اُن کے مشتقات مثلاً گذشتہ، سرگذشت، گذرگاہ، درگذر وغیرہ کو غالب "ز" ہی سے لکھتے تھے۔ غالب "ذرہ" کو، جو عربی لفظ ہے، "ز" ہی سے لکھتے تھے!۔

پانو اور گانو

تلفظ کے اعتبار سے "پاؤں" اور "گاؤں" کی صحیح املا "پانو" اور "گانو" ہے۔

غالب ہمیشہ "پانو" اور "گانو" لکھا کرتے تھے۔ قاضی عبدالجمیل جنوں بریلوی نے "پاؤں" لکھ دیا تو ۲۲ فروری سنہ ۱۸۶۱ء کے خط میں غالب انھیں تنبیہ کرتے ہیں: "پاؤں کی یہ املا غلط۔ پانو، گانو، چھانو ــــ درست ہے"۔ جدید املا میں ان الفاظ کی املا پاؤں، گاؤں اور چھاؤں ہی عام ہے۔

معکوسی آوازیں

چوں کہ فارسی میں معکوسی آوازیں نہیں ہیں اس لیے فارسی رسم الخط میں ان آوازوں کو تحریری روپ دینے میں خاصی پریشانی ہوئی۔ قدیم اردو املا میں تمام معکوسی آوازوں کے لیے قریب المخرج آوازوں کے مصمتے پر تین نقطے بنا دیا کرتے تھے۔ مثلاً

ث (ٹ) ثھ (ٹھ)

ڎ (ڈ) ژھ (ڑھ)

ژ (ڑ) ڎھ (ڈھ)

پروفیسر محمود شیرانی نے "پنجاب میں اردو" میں لکھا ہے کہ گجرات میں بارھویں صدی ہجری کی ابتدا میں معکوسی آوازوں پر ضرب کی علامت "×" بنا دیتے تھے۔ مثلاً:

ت̽ (ٹ) د̽ (ڈ) وغیرہ

تین نقطے لگانے سے "ٹ" اور "ث" میں التباس ہوتا تھا۔ کیوں کہ دونوں پر تین نقطے ہوتے تھے۔ اس لیے غالباً نقطوں کی تعداد تین سے بڑھا کر چار کر دی گئی۔ غالب کی املا میں چار نقطے ملتے ہیں۔ لیکن غالب کچھ معکوسی آوازوں پر چار نقطے لگاتے ہیں اور کچھ پر "ط" لکھتے ہیں۔ مثلاً "ٹ" اور "ٹھ" پر چار نقطے لگاتے ہیں۔ لیکن "ڈ"۔ "ڈھ"۔ "ڑ" اور "ڈھ" پر "ط" بناتے ہیں۔

یاے تحتانی اور ہمزہ

غالب نے مرزا ہرگوپال تفتہ کی ایک فارسی غزل پر اصلاح دیتے ہوئے لکھا ہے:

یاد رکھو، یاے تحتانی تین طرح پر ہے:

جزوِ کلمہ:

(مصرع) ہماے بر سرِ مرغان از آن شرف دارد
(مصرع) اے سرِ نامہ نام تو عقلِ گرہ کشاے را

یہ ساری غزل اور مثل اس کے جہاں یاے تحتانی ہے۔ جزوِ کلمہ ہے۔ اس پر ہمزہ لکھنا، گویا عقل کو گالی دینا ہے۔

دوسری تحتانیِ مضاف ہے۔ صرف اضافت کا کسرہ ہے۔ ہمزہ وہاں بھی مخل ہے؛ جیسے ”آسیاے چرخ“ یا ”آشناے قدیم“۔ توصیفی، اضافی، بیانی، کسی طرح کا کسرہ ہو، ہمزہ نہیں چاہتا ”فداے تو شوم“ ”رہنماے تو شوم“ یہ بھی اسی قبیل سے ہے۔

تیسری دو طرح پر ہے: یاے مصدری، اور وہ معروف ہوگی۔ دوسری طرح: توحید و تنکیر وہ مجہول ہوگی۔ مثلاً مصدری: ”آشنائی“۔ یہاں ہمزہ ضرور، بلکہ ہمزہ نہ لکھنا عقل کا قصور۔ توحیدی: ”آشنائے“ یعنی ایک آشنا یا کوئی آشنا۔ یہاں جب تک ہمزہ نہ لکھو گے دانا نہ کہاؤ گے۔ اردو املا میں بھی غالب اس اصول کا پورا خیال رکھتے ہیں۔

چاہیے۔ لیے۔ دیے۔ کیے

ہمارے زمانے میں عام طور سے لوگ ان الفاظ کو ہمزہ سے لکھتے ہیں لیکن بعض لوگ ان الفاظ کو ”ی“ سے بھی لکھتے ہیں۔ غالب نے ان الفاظ میں ”ہمزہ“ اور ”ی“ دونوں ہی استعمال کیے ہیں۔ وہ اس طرح لکھتے ہیں:

چاہیئے ۔ کیئے ۔ لیئے ۔ سنیئے ۔ روپیئے ۔ وغیرہ

اس طرح کے فارسی الفاظ میں بھی غالب نے "ہمزہ" اور "ی" دونوں کا استعمال کیا ہے ۔ مثلا :

آیٔندہ ۔ فایٔدہ ۔ پایٔندہ ۔ فزایٔندہ ۔ طایٔر ۔ اور جایٔز ۔ وغیرہ

فرمایئے

اس لفظ میں غالب نے "ہمزہ" اور "ی" استعمال کیا ہے اور تشدید لگا کر اس طرح لکھا ہے : فرمائیّے ۔

آئے ۔ پائے ۔ جائے ۔ ہوئے ۔

ان چاروں لفظوں کو غالب نے کبھی "ہمزہ" سے اور کبھی بغیر "ہمزہ" کے لکھا ہے ۔ اور اگر "آئے گا" اور "جائے گا" کو ملا کر لکھا ہے تو ہمزہ کے بجائے "ی" سے اس طرح لکھا ہے :

آیگا ۔ جایگا ۔

موید اور رؤسا

غالب نے ان دونوں الفاظ کو بغیر "ہمزہ" کے لکھا ہے ۔

ایسے الفاظ جن کی املا غالب نے دو طرح کی ہے

ایسے الفاظ کی تعداد خاصی ہے، جن کی املا غالب نے دو طرح کی ہے ۔ مثلاً

روانہ اور روانا

زمانہ اور زمانا

تکیہ اور تکیا

مولانا اور مولٰنا

یہ اور یہہ

ایک لفظ ایسا بھی ہے جس کی املا غالب نے تین طرح کی ہے۔ وہ لفظ ہے " ہاتھ "۔ غالب نے " ہات "۔ " ہاتہہ " اور " ہاتھ " تین طرح لکھا ہے۔

بعض الفاظ کی املا اور اُن کا تلفظ

کسی بھی متن کی بنیاد پر اس کے مصنف کے تلفظ کا اندازہ لگانا ممکن نہیں ہے۔ کیوں کہ جیسا کہ شروع میں کہا گیا کہ ضروری نہیں الفاظ کے تلفظ اور اُن کی املا میں مطابقت ہو۔ غالب کی تحریروں میں بعض لفظوں کی املا اس طرح کی گئی ہے کہ جن پر شبہہ ہوتا ہے کہ غالب اُن کا تلفظ بھی اس طرح کرتے تھے۔ اگرچہ اس معاملے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

بوڑھا اور گاڈی

غالب کی تحریروں میں یہ الفاظ اور خاص طور سے لفظ " بوڑھا " کثرت سے آیا ہے۔ اور عام طور سے ان دونوں الفاظ کی املا " بوڑھا " اور " گاڑی " کی گئی ہے لیکن کبھی کبھی " بوڈھا " اور " گاڈی " بھی ملتے ہیں۔ ممکن ہے کہ غالب ان الفاظ کا تلفظ اسی طرح کرتے ہوں۔

گڑپنکھ

غالب نے " گڑپھنک " لکھا ہے۔ چوں کہ یہ لفظ خطوطِ غالب میں صرف ایک بار ملتا ہے۔ اس لیے کہنا مشکل ہے کہ یہ سہوِ قلم ہے یا غالب اسی طرح تلفظ کرتے تھے۔

تڑپنا

قدیم اردو میں اس لفظ کا تلفظ "تڑپھنا" ہے۔ غالب بھی اسی تلفظ کو ترجیح دیتے تھے۔ قاضی عبدالجمیل جنون بریلوی کے نام ایک خط میں غالب نے لکھا ہے: "تڑپھنا" ترجمہ "تپیدن" کا املا یوں ہے نہ "تڑپنا" بائے فارسی اور نون کے درمیان ہائے مخلوط التلفظ ضرور ہے۔"

ڈھونڈنا

قدیم اردو میں اس لفظ کا تلفظ "ڈھونڈھنا" ہے۔ اور غالب کی تحریروں میں اس لفظ کی املا "ڈھونڈھنا" ملتی ہے۔ ممکن ہے وہ اس لفظ کا تلفظ اسی طرح کرتے ہوں۔

سونچ

دہلی میں بعض مصوتوں کو انفیانے کا رجحان عام تھا۔ آج بھی دلی کی کرخنداری بولی میں "گھانس"، "چانول"، "بینچنا" عام ہیں۔ غالب نے ہر جگہ سونچ لکھا ہے۔ اگر کہیں "سوچ" لکھا ہے تو وہ میری نظر سے نہیں گزرا۔ ایک جگہ غالب نے "بوٹے" کے بجائے "بونٹے" بھی لکھا ہے۔ ایک مطبوعہ خط میں "چانول" ملتا ہے۔

غالب نے بعض الفاظ کی املا اپنے عہد کی رائج املا سے اس طرح مختلف کی ہے کہ ہم اسے غلط املا کہنے پر مجبور ہیں۔ الفاظ کی اس غلط املا کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک تو وہ الفاظ جو غالب کی اب تک کی دستیاب تحریروں میں غالباً صرف ایک بار آتے ہیں۔ مثلاً:

سہرٹ (سورٹھ)

مومیں جامہ (مومی جامہ) وغیرہ

دوسرے اُن الفاظ کی املا جو میرے خیال سے سہوِ قلم ہیں۔ مثلاً :

پانچ ساتھ (پانچ سات)

خورم (خرم)

دلجی (دلجمعی)

گنٹھائیں (گھٹائیں)

تیسرے وہ الفاظ جو غالب نے ایک سے زیادہ بار لکھے ہیں۔ اور جن کے بارے میں وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ غالب کے ذہن میں ان الفاظ کی املا غلط تھی۔ مثلاً :

باالکل (بالکل)

باالفعل (بالفعل)

باالله (بالله)

غالب کی زبان پر فارسی اثرات

انگریزی الفاظ کا استعمال

یہ بات واضح ہے کہ اردو نثر فارسی کے زیر سایہ پروان چڑھی۔ اس لیے ابتدائی اردو نثر پر فارسی کے بہت گہرے اثرات ہیں۔ فورٹ ولیم کالج میں پہلی بار اردو نثر کو انفرادیت کے ساتھ باقاعدہ طور پر اپنی حیثیت کو منوانے اور اپنی شناخت کرانے کا موقع ملا تھا۔ ابتدا میں فورٹ ولیم کالج کے نثر نگاروں کا اردو نثر پر زیادہ اثر نہیں ہوا، لیکن بعض سیاسی اور سماجی حالات کی وجہ سے جوں جوں اردو نثر کا استعمال بڑھتا گیا، یہ فارسی کے اثر سے آزاد ہوتی گئی۔ پچاس ساٹھ سال کی مدت میں سرسید، مولانا محمد حسین آزاد، مولوی ذکاء اللہ، مولانا الطاف حسین حالی اور ڈپٹی نذیر احمد کے ہاتھوں نثری اعتبار سے بھی اردو نے ایک آزاد اور مکمل زبان کی حیثیت حاصل کرلی۔

غالب کا زمانہ ان لوگوں سے کچھ پہلے کا ہے۔ جب غالب عمر کے آخری حصے میں تھے تو یہ سب لوگ نوجوان تھے۔ غالب بنیادی طور پر فارسی کے ادیب اور شاعر تھے۔ دوسرے لفظوں میں غالب کی پہلی تخلیقی زبان فارسی تھی۔ اگرچہ غالب کی روزمرہ گفتگو کی زبان اردو تھی، لیکن جب وہ اردو میں شعر کہتے یا اردو نثر لکھتے تو اُن کے ذہن پر فارسی کا تھوڑا بہت غلبہ ضرور رہتا۔ انھوں نے اردو میں جو دیباچے اور تقریظیں وغیرہ لکھی ہیں، اُن پر فارسی کے خاصے گہرے

اثرات نظر آتے ہیں۔ لیکن اردو خطوط میں غالب کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ روزمرہ کی زبان میں باتیں کریں، اس لیے اُن کے خطوط کی زبان بہت صاف، سادہ اور سلیس ہے۔ خطوطِ غالب کی نثر پر فارسی کے اثرات ہیں لیکن کم۔ غالب اردو دیباچوں اور تقریظوں کے مقابلے میں اردو خطوط میں فارسی محاوروں یا ان کے اردو ترجموں اور فارسی و عربی کے ان الفاظ کا استعمال بہت کم کرتے ہیں، جن کا اردو میں چلن نہیں ہوا تھا۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ غالب کے اردو خطوط میں جو فارسی محاورے اور نسبتاً اجنبی فارسی و عربی لفظ استعمال ہوتے ہیں، یہ پہلی بار غالب نے ہی استعمال کیے ہیں یا یہ اُن کے عہد کی اردو نثر میں بھی رائج تھے اور بعد میں متروک ہو گئے۔ ممکن ہے کہ کچھ الفاظ اور محاورے رائج ہوں اور کچھ غالب نے پہلی بار استعمال کیے ہوں۔ بہ ہر حال اس معاملے میں کسی نتیجے پر پہنچنے کے لیے خطوطِ غالب اور عہدِ غالب کی اردو نثر کا لسانی تجزیہ ضروری ہے، جو ظاہر ہے کہ آسان کام نہیں ہے۔

محمد حسین آزاد اپنے عہد کی گروہ بندی کے شکار ہیں۔ وہ غالب کے نہیں ذوق کے طرف دار ہیں۔ آبِ حیات میں انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ غالب بنیادی طور پر فارسی کے شاعر اور ادیب تھے۔ آزاد لکھتے ہیں:

> "مرزا صاحب کو اصلی شوق فارسی کی نظم و نثر کا تھا اور اس کمال کو اپنا فخر سمجھتے تھے لیکن چوں کہ تصانیف ان کی اردو میں بھی چھپی ہیں اور جس طرح امرا و رؤساے اکبر آباد میں عُلوّ خاندان سے نامی اور مرزاے فارسی ہیں، اسی طرح اردوے معلّٰی کے مالک ہیں[۱]"

آزاد اپنے مخصوص انداز میں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ غالب تو فارسی کے شاعر اور ادیب ہیں اس لیے اردو کے شاعروں (یعنی ذوق) سے اُن کا مقابلہ بے سود ہے۔ یہ یقیناً آزاد کی زیادتی ہے۔ اب غالب کے اردو خطوط کے بارے میں آزاد کی راے ملاحظہ ہو۔ لکھتے ہیں:

> ”اِن (اردو) خطوط کی عبارت ایسی ہے کہ گویا آپ سامنے بیٹھے گل افشانی کر رہے ہیں۔ مگر کیا کریں کہ اُن کی باتیں بھی خاص فارسی کی خوش نما تراشوں اور عمدہ ترکیبوں سے مرصع ہوتی تھیں بعض فقرے کم استعداد ہندوستانیوں کے کانوں کو نئے معلوم ہوں، تو وہ جانیں۔ یہ علم کی کم رواجی کا سبب ہے۔“[1]

یہ ٹھیک ہے کہ غالب کے اردو خطوط میں فارسی لفظوں، فارسی ترکیبوں اور محاوروں کا استعمال ہوا ہے، لیکن یہ استعمال اس طرح ہرگز نہیں ہوا کہ بعض فقرے بہ قول مولانا محمد حسین آزاد ”کم استعداد ہندوستانیوں کے کانوں کو نئے معلوم ہوں“۔ غالب نے فارسی لفظوں اور ترکیبوں کا استعمال ایسی برجستگی کے ساتھ کیا ہے کہ اُن سے نثر زیادہ موثر اور زیادہ معنی خیز ہو گئی ہے۔

یہاں ایسے فارسی لفظوں، ترکیبوں اور محاوروں کی نشان دہی کی جاتی ہے جو غالب نے استعمال کیے ہیں لیکن جو ہمارے عہد کی ادبی نثر میں استعمال نہیں ہوتے، اگرچہ مذہبی تحریروں میں اس طرح کے الفاظ اب بھی مستعمل ہیں۔

اردو نے بہت سے اسم فارسی اور عربی سے مستعار لیے ہیں، لیکن ان کے ساتھ افعال اردو کے استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً ”کتاب پڑھی“۔ ”قلم بنایا“۔ ”کاغذ پھاڑا“ وغیرہ

غالب نے ایسے بعض فارسی اور عربی الفاظ کے ساتھ خود فارسی افعال کا ہی اردو میں ترجمہ کر دیا ہے۔ اسی طرح بعض ایسے فارسی محاورے اور ترکیبیں بھی استعمال کی ہیں، جو جدید اردو میں مستعمل نہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

”منشی نبی بخش تمھارے خط نہ لکھنے کا بہت گلہ رکھتے ہیں“ ”گلہ رکھتے ہیں“ ”گلہ داشتن“ کا ترجمہ۔

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ ۱۸ نومبر ۱۸۵۸ء

”منشی نبی بخش کے ساتھ غزل خوانی کرنا اور ہم کو ”یاد نہ لانا“ ”یاد نہ لانا“

"یاد نہ آوردن" کا ترجمہ۔

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ   ۴ جنوری ۱۸۵۲ء

"میں مشقت کھینچ کر، جو کچھ کہ اب لکھا ہے، وہ لکھ کر تم کو بھیج دیتا۔" مشقت کھینچنا" "مشقت کشیدن" کا ترجمہ۔

بنام منشی نبی بخش حقیر   ۲۸ مارچ ۱۸۵۱ء

"دو میم آ پڑے ہیں۔ ایک میم محض بے کار ہے" "آ پڑے ہیں" "افتادہ اند" کا ترجمہ۔

بنام انور الدولہ شفق   ہژدہم اکتوبر ۱۸۵۵ء

"اگرچہ باور نہیں آیا، لیکن عجب آیا" "عجب آنا" "عجب آمدن" کا ترجمہ۔

بنام منشی غلام غوث خاں بے خبر   ۱۸۶۴ء

"اُوچھی پونجی والے گم نام اپنی شہرت کے لیے مجھ سے لڑتے ہیں۔ واہ واہ اپنے نامور بنانے کو ناحق احمق بگڑتے ہیں" "نامور بنانا" "نامور ساختن" کا ترجمہ۔

بنام نواب میر غلام بابا خاں   ۱۷ دسمبر ۱۸۶۵ء

"روپیہ وصول میں آیا"۔ "وصول میں آنا" "بہ معرضِ وصول آمدن" کا ترجمہ۔

نوابانِ رام پور کے نام خطوط میں متعدد بار "مجھ کو تو مفید پڑا"۔ یہ فقرہ "بہ من مفید افتاد" کا ترجمہ۔

بنام منشی نبی بخش حقیر   اپریل تا جولائی ۱۸۵۱ء

"کوئی بے وفائی بھی سرزد نہیں ہوئی، جو دستورِ قدیم کو برہم مارے" "برہم مارنا" "برہم زدن" کا ترجمہ۔

"یہ امر جلد صورت پکڑ جائیں" "صورت پکڑنا" "صورت گرفتن" کا ترجمہ۔

"بابو صاحب کے واسطے میرا دل بہت جلا" " میرا دل بہت جلا" "دلم سوخت" کا ترجمہ۔

بنام سید بدرالدین احمد فقیر ۳ جنوری ۱۸۵۵ء

"عظیم الدین کون ہے اور کیا پیشہ رکھتا ہے" "پیشہ رکھنا" "پیشہ داشتن" کا ترجمہ۔

بنام منشی شیو نرائن آرام اپریل ۱۸۶۰ء

"اگر زمانہ میری خواہش کے موافق نقش قبول کرتا ہے، تو میں مارہرہ کو آتا ہوں" "نقش قبول کرنا" "نقش قبول کردن" کا ترجمہ۔

بنام چودھری عبدالغفور سرور ۱۸۵۸ء

"تمہارے تنہا اور بے مربی رہ جانے کا میں نے بہت غم کھایا" غم خوردن کا ترجمہ

بہاری لال مشتاق ۲۶ فروری ۱۸۶۸ء

"اب تم کو بھی لازم آ پڑا ہے" "لازم آپڑنا" "لازم آمدن" کا ترجمہ۔

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ ۲۸ مارچ ۱۸۵۳ء

اب کچھ ایسی مثالیں ملاحظہ ہوں جہاں غالب نے فارسی الفاظ کو فارسی مفہوم میں ہی استعمال کیا ہے۔

فرصت : فارسی میں "موقع"، "فراغت" "مہلت" "چھٹکارا" "نجات" اور خلاصی کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ غالب نے یہ لفظ کثرت سے بیماری سے نجات پانے کے مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ مثلاً :

"میاں تفتہ نے کچھ حال آپ کے آشوب چشم کا لکھا تھا، پھر اُن کے ہی خط سے یہ بھی دریافت ہوا کہ کچھ فرصت ہے۔"

بنام منشی نبی بخش حقیر ۹ مارچ ۱۸۵۲ء

منشا : فارسی میں یہ لفظ "سبب" اور "مقصد" دونوں معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ لیکن اردو میں صرف "مقصد" کے مفہوم میں مستعمل ہے۔ غالب نے یہ لفظ "سبب" کے مفہوم میں بھی استعمال کیا ہے۔ مثلاً :

"منشا تشویش و اضطراب کا یہ ہے۔"

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ ۲۸ مارچ ۱۸۵۲ء

تحقیق : فارسی میں یہ لفظ "درست"، "تصدیق"، "یقین"، "چھان بین" اور "دریافت" وغیرہ کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ اردو میں یہ لفظ صرف آخری دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ غالب نے اسے فارسی معنوں میں بھی استعمال کیا ہے۔ مثلاً :

"یقین ہے کہ تم کو تحقیق حال معلوم ہوگا"

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ ۲۸ مارچ ۱۸۵۳ء

یعنی تم کو صحیح حال معلوم ہوگا۔

جریدہ : فارسی میں اس لفظ کا مطلب "تنہا" اور "اکیلا" اور "رسالہ" ہے۔ غالب نے یہ لفظ "تنہا" کے مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ مثلاً :

"جریدہ بہ سبیلِ ڈاک آئیں گے۔"

بنام حسین مرزا ۱۶ دسمبر ۱۸۵۹ء

وحشت : فارسی میں رمیدگی، خوف سے بھاگنا، کنارہ کشی اختیار کرنا اور "سودا" اور "دیوانگی" کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ اردو میں صرف "دیوانگی" کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ غالب نے یہ لفظ "کنارہ کشی" کے مفہوم میں بھی استعمال کیا ہے۔ لکھتے ہیں :

"پھر اس وحشت کی وجہ کیا۔ اگر کہا جائے کہ وحشت نہیں ہے تو اس کتاب اور مثنوی کی رسید نہ لکھنے کی وجہ کیا۔"

بنام تفتہ یکم ستمبر ۱۸۵۸ء

رنجور : فارسی میں یہ لفظ "بیمار" اور "غمزدہ" دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ غالب نے بیمار کے مفہوم میں یہ لفظ اس طرح استعمال کیا ہے :

" ایسا نہ ہو کہ گرمی کی تاب نہ لائیں اور روزہ رکھ کر رنجور ہو جائیں "۔

توقف : فارسی میں "دیر" "وقفہ" اور "صبر و تحمل" "رکنا" کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ اردو میں یہ لفظ صرف "دیر" اور "وقفہ" کے معنوں میں مستعمل ہے۔ غالب نے صبر و تحمل کے مضمون میں بھی استعمال کیا ہے۔ غالب نے لکھا ہے :

" آدمی کو یہاں اتنا توقف نہیں کہ وہاں سے دیوان منگوا کر، نقل اتروا کر بھیج دوں "

سیاست : فارسی میں "ملکی انتظام" اور "سزا" دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اردو میں صرف "ملکی انتظام" کے مفہوم میں مستعمل ہے۔ غالب نے یہ لفظ "سزا" کے معنی میں اس طرح استعمال کیا ہے۔

" مجرم سیاست پاتے جاتے ہیں "۔

مسترد : فارسی میں یہ لفظ "واپس کرنا" اور "رد کرنا" دونوں معنوں میں مستعمل ہے۔ اردو میں صرف "رد کرنا" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ غالب اسے واپس کرنے کے مفہوم میں اس طرح استعمال کرتے ہیں :

" میں نے اصلاح دینے سے انکار کیا اور اشعار مسترد کر دیے "

بنام منشی سیل چند ۱۴ مارچ ۱۸۶۵ء

ہمدرد : غالب نے یہ لفظ ان معنوں میں استعمال کیا ہے کہ : " جو غم تم کو ہے وہی غم مجھے بھی ہے "۔ فارسی میں یہ لفظ "غم خوار" اور دکھ درد میں ساتھ دینے والے کے مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہ لفظ اردو میں دوسرے معنوں میں مستعمل ہے۔

غالب کی ایک پھوپھی کا انتقال ہو گیا۔ اس سے کچھ عرصے پہلے منشی نبی بخش حقیر کے

بھی کسی رشتہ دار کا انتقال ہوا تھا۔ غالبؔ نے حقیرؔ کو اپنی پھوپھی کی وفات کی اطلاع اِن الفاظ میں دی:

”میں بھی تمہارا ہمدرد ہوگیا۔ یعنی منگل کے دن ۱۸ ربیع الاول کو شام کے وقت وہ پھوپھی کہ میں نے بچپن سے آج تک اس کو ماں سمجھا تھا۔۔۔۔۔ مرگئی۔“

بنام منشی نبی بخش حقیر ۲۲ دسمبر ۱۸۵۳ء

قباحت : فارسی میں اس لفظ کے کئی معنی ہیں: ”برائی“ ”خرابی“ ”دقّت“ اور ”مشکل“ کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ غالبؔ نے اسے فارسی کے اس مفہوم میں بھی استعمال کیا ہے، جو اردو میں مستعمل نہیں ہے۔ لکھتے ہیں:

”ایک شعر کی قباحت تم پر ظاہر کرتے ہیں۔“

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ ۴ اکتوبر ۱۸۶۱ء

ہرزہ : ”ورنہ خط ہرزہ پھرا کرے۔“

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ دسمبر ۱۸۵۲ء

بے سروپا : غالبؔ نے یہ لفظ ”بے ساز و سامان“ اور ”تباہ حال“ کے مفہوم میں اس طرح استعمال کیا ہے:

”جو بے سروپا وہاں پہنچا، امیر بن گیا۔“

سیاح ۳۰ جون ۱۸۶۰ء

مگر : اردو میں ”لیکن“ کے مفہوم میں مستعمل ہے۔ غالبؔ نے یہ لفظ شعر اور نثر دونوں میں شاید کے معنوں میں بھی استعمال کیا ہے۔ غالبؔ کا مشہور شعر ہے:

کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ
شرم تم کو مگر نہیں آتی

نثر میں غالبؔ لکھتے ہیں:

" حضور نے یہ کیا تحریر فرمایا ہے کہ ان بارہ غزلوں کی اصلاح میں کلامِ خوش مطلوب ہے، اگلی غزلوں کی طرح نہ ہوں۔ مگر اگلی غزلوں کی اصلاح پسند نہیں آتی۔"

بنام یوسف علی خاں ناظم ۳ دسمبر ۱۸۵۸ء

احیا : اردو میں "دوبارہ زندہ کرنے" کے مفہوم میں استعمال ہوتا ہے۔ فارسی میں "حی" کی جمع "احیا" "زندہ لوگوں" کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ غالب نے دوسرے مفہوم میں بھی استعمال کیا ہے۔

" دعا مانگتا ہوں کہ اب ان احیا میں سے کوئی میرے سامنے نہ مرے۔"

بنام حکیم غلام نجف خاں اپریل ۱۸۵۸ء

علاقہ : یہ لفظ اردو میں دلی لگاؤ، زمینی اور جغرافیائی حوالے وغیرہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ فارسی میں یہ لفظ نوکری اور ملازمت کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ غالب نے اس مفہوم میں بھی استعمال کیا ہے۔ مثلاً

" مجھ کو فکر جانی کی ہے کہ اسی علاقے میں تم بھی شامل ہو"

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ ۲۸ مارچ ۱۸۵۳ء

غالب نے اردو میں فارسی اور عربی کے ایسے الفاظ بھی استعمال کیے ہیں جو اردو میں مستعمل نہیں ہیں۔ مثلاً :

" اذعانی" بہ معنی "یقینی" :

" اذعانی ہے یہ امر کہ وہ بھی قافلے کے ساتھ ہوگا"

بنام حکیم غلام نجف خاں ستمبر ۱۸۵۸ء

" گزاف" بہ معنی یاوہ گوئی

" خط کے پہنچنے سے اظہارِ منت پذیری اگر گزاف نہیں تو کیا ہے"

بنام عبدالرزاق شاکر   قبل ۱۸۶۵ء

جدید اردو میں "لاف و گزاف" مستعمل ہے۔

"ریب" بہ معنی "شک"

"اس میں کیا ریب ہے"

بنام علاء الدین خاں علائی   یکم ستمبر ۱۸۶۲ء

"درنگ" بہ معنی "تاخیر"۔ غالب نے اس لفظ کا استعمال بہت کیا ہے:

"آپ کے خط کا جواب لکھنے میں درنگ اس راہ سے ہوئی"

بنام سید بدرالدین احمد کاشف   ۱۳ مئی ۱۸۶۳ء

"امین" بہ معنی "محفوظ"

"بہ ایں ہمہ امین بھی نہیں ہوں"

بنام میر مہدی مجروح   ہفتم فروری ۱۸۵۸ء

"بحل" بہ معنی "معاف کرنا"

ایک ظالم پانی پت، انصاریوں کے محلے کا رہنے والا لوٹ لے گیا۔ مگر میں نے اُس کو بحل کیا۔

بنام میر مہدی مجروح   ۷ مارچ ۱۸۵۹ء

"کون" بہ معنی "تعمیر" "وجود میں آنا"

"لکھنؤ کی ویرانی پر دل جلتا ہے، مگر تم کو یاد رہے کہ وہاں بعد اس فساد کے ایک کون ہوگا، یعنی راہیں وسیع ہو جائیں گی۔"

بنام میاں داد خاں سیاح   ۱۱ جون ۱۸۶۰ء

"انفراد" بہ معنی "تنہا" "اکیلی"

"یہاں جمنا بہ انفراد بہہ رہی ہے"

بنام انور الدولہ شفقؔ   ۱۹ جولائی ۱۸۶۰ء

"استعلاج" بہ معنی "علاج"

"بی بی بیمار ہے۔ اُس کا استعلاج منظور ہے"

بنام علاء الدین خاں علائیؔ ۲۱ جون ۱۸۶۳ء

"مُجموع" بہ معنی "تمام"

"ایک بہن، اُس کی مجموع اولاد وہاں"

بنام قدرؔ بلگرامی   ۲۲ فروری ۱۸۶۳ء

"زَلّت" بہ معنی "غلطی"

"ہر موقع پر خطا اور زَلّتِ مولف کا اشارہ کردوں گا"۔

بنام میر غلام حسنین قدرؔ بلگرامی   ۱۸۶۵ء

"مُبطِل" بہ معنی "باطل کرنے والا" "غلط ثابت کرنے والا"

"اور الف نون حالیہ کے وجود کا مُبطِل تو نہیں ہوا"

بنام مولوی ضیاء الدین خاں ضیاؔ   ۱۸۶۴ء

"مظنون" بہ معنی "شبہہ ہونا"

"آگرے سے کتابوں کا منگوانا بے ارسالِ قیمت مظنون ہے"

بنام مرزا ہرگوپال تفتہؔ   ۲۷ فروری ۱۸۵۹ء

غالبؔ کبھی آدھے اور کبھی پورے فقرے فارسی کے لکھ جاتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

"سرآغازِ فصل میں ایسے ثمرہائے پیش رس کا پہنچنا نوید ہزار گونہ میمنت اور شادمانی ہے"

بنام قاضی عبدالجمیل جنوںؔ

"اتحادِ اسمی دلیلِ مودتِ روحانی ہے"۔

بنام عبدالرزاق شاکر

"اور وہ امر بعد تعجبِ مفرط کے موجب نشاطِ مفرط ہوگا"۔

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ ۱۶ اپریل ۱۸۶۰ء

"صریرِ قلم ماتمیوں کے شیون کا خروش ہے"۔

بنام میر غلام بابا خاں ۶ ستمبر ۱۸۶۳ء

"بہ سببِ استعمالِ ادویہ حارہ کہ اس مرض میں اس سے گریز نہیں"۔

بنام منشی نبی بخش حقیر

"جس کے جی میں آئی، وہ متصدیِ تحریرِ قواعدِ انشا ہوگیا"۔

بنام مولوی ضیاء الدین خاں ضیا دہلوی ۱۸۶۴ء

غالب کبھی کبھی فارسی کی پوری ترکیب استعمال کرتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

"ایک مژہ برہم زدن نہیں تھا"۔

بنام علاء الدین خاں علائی

"آفتابِ سرِ کوہ ہیں"

بنام جواہر سنگھ جوہر ۹ اپریل ۱۸۵۳ء

"میں خود اس مثنوی کے واسطے خون در جگر ہوں"

بنام چودھری عبدالغفور سرور

"کیا جگر خون کن اتفاق ہے"

بنام نواب میر غلام بابا خاں ۶ ستمبر ۱۸۶۳ء

"نشتر کیوں کھایا، مگر یہ کہ بہ طریقِ خوشامد طبیب سے رجوع کی"۔

بنام علاء الدین خاں علائی ۱۸۵۸ء

"فرطِ خجلت سے سر در پیش ہو کر قصیدے کو اس لفافے میں بھیجتا ہوں"

بنام انور الدولہ شفق   ۲۸ اگست ۱۸۶۰ء

"اپنے اپنے عزیزانِ بہ سفر رفتہ کو لکھا"

بنام انور الدولہ شفق

انگریزی الفاظ کا تلفظ، املا اور اردو ترجمہ

ہندوستان پر انگریزوں کے سیاسی اقتدار کی وجہ سے ہندوستانیوں کے لیے انگریزی اجنبی زبان نہیں رہی تھی۔ دہلی کالج میں انگریزی ایک مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جا رہی تھی، جس کی وجہ سے ہندوستانیوں میں انگریزی داں طبقہ پیدا ہو چکا تھا۔ ثقافتی سطح پر انگریزی سے الفاظ مستعار لینے کا عمل بہت پہلے شروع ہو چکا تھا۔ انتظامیہ اور اردو اخباروں میں انگریزی الفاظ اور اصطلاحوں کا استعمال عام تھا۔ انگریزی الفاظ کا اردو میں ترجمہ کر لیا گیا تھا لیکن بیشتر انگریزی الفاظ اردو میں لے لیے گئے۔ ان مستعار الفاظ میں صوتی سطح پر بہت سی تبدیلیاں بھی وجود میں آئیں۔

غالبؔ کے انگریزوں سے بہت گہرے مراسم تھے۔ انگریزوں میں غالبؔ کے شاگرد، معتقد، دوست، مداح اور ممدوح، سب ہی طرح کے لوگ تھے۔ پنشن کے مقدمے کی وجہ سے زندگی بھر غالبؔ کی برطانوی حکومت سے مراسلت رہی۔ ان خطوط کا مسودہ عام طور سے غالبؔ فارسی میں لکھتے اور انگریزی میں ترجمہ کرا کے بھیجتے۔

غالبؔ نے فارسی اور اردو نظم و نثر دونوں میں خاصی بڑی تعداد میں انگریزی الفاظ اور بعض انگریزی الفاظ کے اردو ترجموں کا بے تکلف استعمال کیا ہے۔ یہ بتانا تو ممکن نہیں کہ غالبؔ انگریزی الفاظ کا تلفظ کس طرح کرتے تھے۔ ہاں ان الفاظ کی املا غالبؔ جس طرح کرتے تھے اُس سے تلفظ کا تھوڑا بہت اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

پہلے تو انگریزی الفاظ کے وہ اردو ترجمے ملاحظہ ہوں، جو غالب نے استعمال کیے ہیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ ترجمے خود غالب نے کیے تھے یا اُس عہد میں رائج تھے۔

تار برقی، تار بجلی	Telegram
دخانی جہاز	Steamer
انگریزی دیا سلائی	Match
جرنیلی بندوبست	Martial Law
حاکمِ اکبر	Governor-General
ڈبل خط پوسٹ پیڈ	Reply Post Card
آئینہ کی تصویر عکس کی تصویر	Photograph
بڑا پوسٹ ماسٹر	Post-master-General
کمشنری	Division
رجسٹری دار خط	Registered Letter

غالب نے بعض انگریزی الفاظ کی املا اس طرح کی ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب ان الفاظ کا تلفظ، مروّجہ تلفظ سے بہت مختلف کرتے تھے:

لارڈ	Lord
پان ٹوٹی	Town Duty
سکرتر یا سکرتری	Secretary
گورمنٹ	Government
لیکور	Liquor
برگذیر	Brigadier
بارک	Barrack

پنسن	Pension
کمپ	Camp
ٹپن	Tiffin
رپوٹ	Report
باہمی مشورہ	Council

بعض الفاظ میں جو صوتی تبدیلی نظر آتی ہے، وہ آج تک برقرار ہے۔ مثلاً :

کلکٹری	Collectorate
رجسٹری	Registered
بکس	Box
اسپتال	Hospital

لیکن بعض انگریزی الفاظ کی جو املا غالب نے کی ہے، وہ اردو کے لیے قابلِ قبول نہیں رہی۔ مثلاً :

اجنٹ	Agent
لمبر	Number
اسٹامپ	Stamp
چک	Cheque
سارتی فکٹ	Certificate
اسٹیسن	Station
رسیڈنٹ	Resident

اب وہ انگریزی الفاظ ملاحظہ ہوں۔ جن کی املا آج بھی تقریباً وہی ہے، جو غالب کی تحریروں میں ملتی ہے :

ٹکٹ	Ticket
ڈاکٹر	Doctor
اگریمنٹ (غالب نے "گریمنٹ" بھی لکھا ہے)	Agreement
انکم ٹیکس	Income Tax
پارسل	Parcel
ڈپٹی	Deputy
پوسٹ پیڈ	

غالب کے اردو خطوط کی مجموعی تعداد

	مکتوب الیہ	خطوط کی تعداد
۱	مرزا ہرگوپال تفتہ	۱۲۳
۲	نواب کلب علی خاں	۷۶
۳	منشی نبی بخش حقیر	۷۱
۴	نواب علاء الدین خاں علائی	۵۷
۵	میر مہدی مجروح	۵۰
۶	نواب یوسف علی خاں ناظم	۴۰
۷	منشی شیو نرائن آرام	۳۶
۸	میاں داد خاں سیاح	۳۵
۹	قاضی عبدالجمیل جنون	۳۰
۱۰	چودھری عبدالغفور سرور	۲۷
۱۱	خواجہ غلام غوث خاں بے خبر	۲۵
۱۲	حکیم غلام نجف خاں	۲۳
۱۳	میر غلام حسنین قدر بلگرامی	۲۲
۱۴	نواب انور الدولہ سعد الدین خاں شفق	۲۰
۱۵	مرزا حاتم علی مہر	۱۹
۱۶	حبیب اللہ ذکا	۱۶

۱۷	نواب یوسف مرزا	۱۲
۱۸	حکیم سید احمد حسن مودودی	۱۱
۱۹	نواب میر غلام بابا خاں	۱۰
۲۰	عبدالرزاق شاکر	۱۰
۲۱	مرزا شہاب الدین احمد خاں ثاقب	۱۰
۲۲	نواب امین الدین احمد خاں	۸
۲۳	منشی سیل چند منشی	۷
۲۴	سید فرزند احمد صفیر بلگرامی	۶
۲۵	ذوالفقار الدین حیدر خاں عرف حسین مرزا	۶
۲۶	صاحب عالم مارہروی	۶
۲۷	نواب میر ابراہیم علی خاں وفا	۵
۲۸	سید بدرالدین احمد کاشف المعروف بہ فقیر صاحب	۵
۲۹	ماسٹر پیارے لال آشوب	۵
۳۰	شاہزادہ بشیرالدین توفیق	۵
۳۱	محمد حسین خاں	۴
۳۲	مولوی نعمان احمد	۴
۳۳	جواہر سنگھ جوہر	۳
۳۴	شاہ عالم مارہروی	۳
۳۵	مرزا یوسف علی خاں عزیز	۳
۳۶	میر افضل علی عرف میرن صاحب	۳
۳۷	مرزا باقر علی خاں کامل	۳

۳۸	مولوی ضیاء الدین خاں ضیاؔ	۳
۳۹	منشی عبداللطیف	۲
۴۰	منشی نول کشور	۲
۴۱	منشی ہیرا سنگھ	۲
۴۲	ہرگوبند سہائے نشاطؔ	۲
۴۳	مرزا قربان علی بیگ خاں سالکؔ	۲
۴۴	مرزا شمشاد علی بیگ خاں رضواںؔ	۲
۴۵	میر احمد حسین میکشؔ	۲
۴۶	میر سرفراز حسین	۲
۴۷	سید سجاد مرزا	۲
۴۸	نواب زین العابدین خاں عرف کلن میاں	۲
۴۹	عباس علی خاں بیتابؔ رام پوری	۲
۵۰	میر ولایت علی	۲
۵۱	محمد نعیم الحق آزادؔ	۲
۵۲	نجف علی خاں	۲
۵۳	ولایت علی ولایتؔ و عزیزؔ صفی پوری	۲
۵۴	مردان علی خاں رعناؔ	۲
۵۵	مولوی احمد حسن خاں قنوجی	۲
۵۶	احمد حسین میناؔ مرزا پوری	۲
۵۷	بہاری لال مشتاقؔ	۲
۵۸	محمد محسن صدر الصدور	۱

۵۹	قاضی محمد نورالدین حسین فائق	۱
۶۰	میر بندہ علی خاں عرف مرزا میر	۱
۶۱	منشی سخاوت حسین	۱
۶۲	مہاراجا سردار سنگھ والیِ بیکانیر	۱
۶۳	مفتی سید محمد عباس	۱
۶۴	مرزا عباس بیگ	۱
۶۵	مولوی عبدالغفور نساخ	۱
۶۶	مولوی عزیز الدین عزیز و صادق	۱
۶۷	تفضل حسین خاں	۱
۶۸	مرزا محمد زکریا زکی	۱
۶۹	حکیم غلام رضا خاں	۱
۷۰	منشی کیول رام ہشیار	۱
۷۱	مولوی کرامت علی	۱
۷۲	مرزا رحیم بیگ	۱
۷۳	شاہ فرزند علی صوفی منیری	۱
۷۴	منشی محمد ابراہیم خلیل	۱
۷۵	فرقانی میرٹھی	۱
۷۶	محمود مرزا	۱
۷۷	مرزا امیرالدین احمد خاں فرخ مرزا	۱
۷۸	نواب مصطفیٰ خاں بہادر شیفتہ	۱
۷۹	حکیم غلام مرتضیٰ خاں	۱

۸۰	شیخ لطیف احمد بلگرامی	۱
۸۱	مظہر علی اور عبداللہ	۱
۸۲	نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر، رخشاں	۱
۸۳	حکیم ظہیرالدین احمد خاں	۱
۸۴	منشی غلام بسم اللہ	۱
۸۵	ظہیرالدین کی طرف سے اُن کے چچا کے نام	۱
۸۶	حکیم محب علی	۱
۸۷	محمد حسین خاں	۱
۸۸	شیخ احمد علی احمد رام پوری	۱
۸۹	محمد امیر	۱
۹۰	سید محمد زکریا خاں زکی دہلوی	۱
۹۱	بنام نامعلوم۔ (خط کا آغاز۔ نامہ و داد پیام ع۔ صدور لایا)۔	
۹۲	بنام نامعلوم۔ (خط کا آغاز۔ وہ عرضی کا کاغذ، افشاں کیا ہوا، اور عرضی کا مسودہ میں نے لالہ جگل کشور کو پرسوں دے دیا ہے)۔	
۹۳	بنام نامعلوم۔ (خط کا آغاز۔ جناب عالی! یہ خط فتح پور سے آپکے نام آیا ہے)۔	
۹۴	بنام نامعلوم۔ (خط کا آغاز۔ حضرت میرا حال کیا پوچھتے ہو؟)	
	کل تعداد	۸۷۳

خطوطِ غالبؔ کا تنقیدی مطالعہ

غالبؔ سے قبل اردو کا نثری سرمایہ اور مکتوب نگاری کا آغاز

اس عنوان کے تحت اردو کے اُس نثری سرمایے کا جائزہ لینا مقصود ہے، جو غالبؔ کی اردو مکتوب نگاری سے قبل وجود میں آ چکا تھا۔

انیسویں صدی شروع ہونے سے قبل اردو میں میرؔ، سوداؔ، دردؔ، انشاؔ اور مصحفیؔ جیسے عظیم المرتبت شاعر پیدا ہو چکے تھے۔ زبان اور فن، دونوں ہی اعتبار سے اردو شاعری پختگی حاصل کر چکی تھی۔ اردو کی بہترین کلاسیکی شاعری کا بڑا حصہ تخلیق ہو چکا تھا۔ لیکن نثر ابھی تک کم مایہ اور تہی داماں تھی۔

اردو نثر کے ابتدائی نمونے پندرھویں صدی سے ملنے شروع ہوتے ہیں۔ انیسویں صدی تک چار صدیاں ہوتی ہیں۔ اگر اس طویل عرصے میں لکھی جانے والی اُن نثری کتابوں کی فہرست مرتب کی جائے، جو مخطوطات کی شکل میں ہمیں دستیاب ہوئی ہیں تو بہت کھینچ تان کے بعد بھی ہماری فہرست پچیس تیس کتابوں سے آگے نہیں بڑھتی۔ اس کا امکان ہے کہ اردو نثر کے کچھ مخطوطات دست بردِ زمانہ کی نذر ہو گئے ہوں، تو اس فہرست میں پندرہ بیس کتابوں کا اور اضافہ کر لیجیے۔ یہ سب کتابیں تصوف، مذہب اور اخلاقیات کے موضوع پر ہیں یا ان میں سے کچھ داستانیں ہیں۔ اردو کا یہ نثری سرمایہ دوسری زبانوں اور خاص طور پر فارسی سے ترجمہ یا ماخوذ ہے۔

صدیوں تک فارسی ہندوستان میں ایک طاقتور مرکزی حکومت کی زبان رہی تھی۔ اس مرکزی حکومت کے تحت تمام علاقوں میں سرکاری زبان بھی فارسی ہی رہی۔ چوں کہ مرکز اور

اُس کے تحت تمام علاقوں میں سرکاری سطح پر فارسی کا چلن تھا۔ اس لیے اعلیٰ طبقے کے لکھنے پڑھنے کی زبان فارسی ہی تھی۔ اس طبقے میں وہ افراد بھی تھے جو ایران اور افغانستان سے خود آئے تھے یا جن کے آباؤ اجداد ان مقامات سے ہندوستان آئے تھے اور وہ ہندوستانی بھی جنھوں نے اعلیٰ ملازمتیں حاصل کرنے کے لیے فارسی پر قدرت حاصل کرلی تھی۔ فطری طور پر اس طبقے کی شعروادب کی زبان بھی فارسی ہی رہی۔ سرکاری اور ادبی مقاصد کے لیے فارسی کے استعمال نے مقامی زبانوں اور بولیوں کو زیادہ پنپنے کا موقع نہیں دیا۔ صوفیوں اور سنتوں نے اپنے مسلک کی تبلیغ کے لیے مقامی زبانوں کا استعمال ضرور کیا لیکن اس کا اثر ایک مخصوص طبقے تک ہی محدود رہا۔

مرکزی حکومت کے کمزور ہونے سے مختلف علاقوں کی تہذیبی و ثقافتی قدروں اور مقامی زبانوں کو ترقی کا موقع ملا۔ علاقائی وحدتیں وجود میں آئیں۔ تشخص کی تلاش میں اُن علاقائی خصوصیات نے فروغ حاصل کرنا شروع کیا، جنھیں فارسی اور ایرانی ذوقِ جمال نے اُبھرنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ مغلوں کا زوال شروع ہوتے ہی ہندوستان کی نئی مقامی زبانوں کا وہ ارتقا شروع ہوگیا جو کافی عرصے سے جامد تھا۔ اردو بھی ان زبانوں میں سے ایک تھی۔

اردو کا علاقہ وہی تھا۔ جس پر صدیوں تک فارسی نے حکومت کی تھی۔ اردو کھڑی بولی کی ترقی یافتہ شکل تھی اور کھڑی بولی دہلی اور اس کے آس پاس بولے جانے والی بولی تھی۔ فارسی اور عربی کے بے شمار الفاظ اردو میں داخل ہوگئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو کو فارسی کی بہت سی ایسی آوازیں اپنانی پڑیں جو اردو میں نہیں تھیں۔ اردو کو پہلی بار تحریری روپ اُن لوگوں نے دیا جو عام طور سے فارسی کے علاوہ اور کوئی دوسرا رسم الخط نہیں جانتے تھے۔ اس لیے وہ لوگ فارسی رسم الخط اپنانے پر مجبور تھے۔

اردو کو فارسی سے بہت قریب رہنے کا موقع ملا تھا۔ شمالی ہند میں اردو شاعری کا

آغاز اس طرح ہوا تھا کہ ایک مصرع فارسی کا ہوتا اور دوسرا اردو کا یا آدھا مصرع فارسی کا اور آدھا اردو کا یا "حرف و فعل" فارسی کے ہوتے۔ مختصر سے عرصے میں اردو زبان اور شاعری کو ذہنی کاوش کی خراد پر اس طرح اُتارا گیا کہ اردو میں میر، درد اور سودا جیسے بلند مرتبہ شاعروں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ اگرچہ اردو شاعری نے اصنافِ سخن، شعری روایات، اظہار کے پیرائے، بے شمار الفاظ، تشبیہات و استعارات، تلمیحات، رعایتِ لفظی اور بہت سے روایتی شعری مضامین فارسی سے مستعار لیے، لیکن بہت جلد اس نے خود کو فارسی سے آزاد کرا کے ایک باقاعدہ زبان کی حیثیت اختیار کر لی۔

اٹھارویں صدی کی آخری چند دہائیوں میں، دنیا کی ایک ترقی یافتہ زبان یعنی انگریزی نے ہندوستان کے لسانی منظر نامے میں اپنے وجود کا احساس دلانا شروع کیا۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ سولھویں صدی میں یورپ کے مختلف ممالک سے ہندوستان کے تجارتی تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ تجارتی کمپنیاں جب ہندوستان آئیں تو ہندوستانی عوام سے رابطے کے لیے کمپنی سے متعلق بعض افراد کو اردو سیکھنی پڑتی۔ ان کمپنیوں میں کچھ ایسے افراد بھی ہوتے جو اردو اور ہندوستان کی بعض دوسری زبانوں میں علمی دلچسپی لیتے، اس دلچسپی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان لوگوں نے اہلِ یورپ کے لیے اردو لغت اور قواعد تیار کیے تاکہ انھیں یہ زبان سیکھنے میں آسانی ہو۔ ان حضرات کی علمی کاوشوں پر ابھی تک خاطر خواہ تحقیق نہیں ہوئی ہے۔

اٹھارویں صدی کے نصف آخر میں کلکتے میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان کی سرزمین پر اپنے قدم مضبوطی سے جما لیے تھے۔ جب اس کمپنی نے صاحبانِ انگریز کو ہندوستانی زبانیں سکھانے کی ضرورت محسوس کی تو کلکتے میں ۱۰ جولائی ۱۸۰۰ء کو فورٹ ولیم کالج قائم کیا گیا۔ اس کالج میں یورپ کی تین جدید زبانوں یونانی، لاطینی اور انگریزی کے علاوہ عربی، فارسی، سنسکرت، ہندوستانی یعنی اردو، بنگالی، تیلگو، مرہٹی اور تامل پڑھانے

کا انتظام کیا گیا۔ کالج میں تصنیف و تالیف کے سلسلے میں اردو اور اردو بہ خط ناگری پر خاص طور سے زور دیا گیا۔ جب ۱۸۰۳ء میں انگریزوں نے دہلی پر اس طرح قبضہ کر لیا کہ مغل حکومت برائے نام رہ گئی تو انگریزی نے ہندوستان کی لنگوا فرانکا یعنی اردو کو براہِ راست متاثر کرنا شروع کر دیا۔ آہستہ آہستہ بہت سی انتظامی اور دفتری انگریزی اصطلاحیں اردو میں داخل ہونی شروع ہو گئیں۔۔

فورٹ ولیم کالج کی تصنیفات و تالیفات کے وجود میں آنے سے قبل اردو نثر فارسی کے زیرِ اثر تھی اور یہ اثر اس حد تک تھا کہ اردو کے نثر نگار کثرت سے فارسی الفاظ و ترکیبیں استعمال کرتے تھے بیشتر اوقات فقروں کی قواعدی ساخت بھی فارسی کے انداز پر ہوتی۔ فارسی انشا پردازی کے انداز پر غیر معمولی تکلف و تصنع سے کام لیا جاتا۔ ایک بات کہنے کے لیے بہت سے مترادفات کا استعمال کیا جاتا۔ سیدھی سادی بات تشبیہات و استعارات کے سہارے کہی جاتی۔ رعایتِ لفظی کا اس طرح استعمال کیا جاتا کہ بات سمجھنا آسان نہ رہتا۔ صنائعِ لفظی و معنوی کا خاص طور سے التزام کیا جاتا۔ زورِ بیان اور عبارت آرائی کے نام پر بے جا طوالت سے کام لیا جاتا۔ فارسی حروفِ ربط کا ترجمہ "پیچھے"، "بیچ"، "کے تئیں"، "اوپر" کیا جاتا۔ اضافت کے لیے "کا"، "کے سے"، "کے نے" وغیرہ مستعمل تھے۔

فورٹ ولیم کالج کے قیام میں آنے سے پچیس سال قبل یعنی ۱۷۷۵ء میں میر محمد عطا حسین خاں تحسینؔ نے "نوطرزِ مرصع" مکمل کی تھی۔ اس داستان کے آغاز کا پہلا پیراگراف ملاحظہ ہو:

> بیچ سرزمین فردوس آئین ولایت روم کے ایک بادشاہ تھا۔ سلیمان قدر، فریدوں فر، جہاں بان، دین پرور، رعیت نواز، عدالت گستر، بر آرندۂ حاجاتِ بستہ کاراں، بخشندۂ مرادات امیدواراں، فرخندہ سیر نام کہ اشعۂ شوارق فضلِ ربانی کا اور شعشہ بوارق فیض سبحانی کا ہمیشہ اوپر لوح پیشانی

> اس کے لمعاں و نور افشاں رہتا لیکن شبستانِ عمرِ دولت اس کے کا، فروغ شمع زندگانی کے سے کہ مقصد فرزند ارجمند سے ہے، روشنی نہ رکھتا تھا[۱]۔"

اس عبارت کے تقریباً تمام فقروں کی قواعدی ساخت فارسی انداز پر ہے۔ پہلے فقرے میں فارسی حرفِ ربط "در" کا ترجمہ "بیچ" کیا گیا ہے۔ اردو میں اس مفہوم کے لیے "میں" استعمال کرتے ہیں۔ اور یہ حرف ربط اسم سے پہلے نہیں اسم کے بعد آتا ہے۔ دوسرے فقرے میں صفت کے طور پر تمام فارسی ترکیبیں استعمال کی گئی ہیں"۔ اشعہ شوارق فصل ربانی کا اور شعشہ بوارق فیض سُبحانی کا" یہاں فارسی اضافت کا ترجمہ حرفِ ربط کے طور پر "کا" کیا گیا ہے، لیکن اس کا استعمال اردو قواعد کے خلاف ہے۔ "شبستانِ عمرِ دولت اس کے کا" میں "دولت اش" کا ترجمہ "دولت اس کے کا" کیا گیا ہے۔ فروغ شمعِ زندگانی کے سے" فارسی میں یہ اس طرح ہوگا "از فروغِ شمع زندگانی" "از" کا ترجمہ "کے سے" ہے اور اب جدید اردو قواعد کی رو سے یہ ترجمے اور فقروں کی ساخت قطعاً غلط ہے۔

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگرچہ اردو شاعری کو فارسی کے اثر سے آزاد ہوئے کافی عرصہ ہو چکا تھا لیکن اردو نثر ابھی فارسی ہی کے سائے میں چل رہی تھی۔

فورٹ ولیم کالج کی سب سے بڑی دین یہ ہے کہ اس نے اردو نثر کو فارسی کے اثر سے آزاد کیا۔ جان گلکرسٹ نے "باغ و بہار" کی تالیف کے لیے میر امن کو یہ ہدایت دی تھی۔

> " جان گلکرسٹ صاحب نے (کہ ہمیشہ اقبال اُن کا زیادہ رہے، جب تک گنگا جمنا بہے) لطف سے فرمایا کہ قصے کو ٹھیٹھ ہندوستانی گفتگو میں جو اردو کے لوگ ہندو، عورت، مرد، لڑکے بالے، خاص و عام آپس میں بولتے چالتے ہیں، ترجمہ کرو۔ موافق حکم حضور کے، میں نے بھی اسی محاورے سے لکھنا شروع کیا، جیسے کوئی باتیں کرتا ہے[۲]۔"

میر امن کو جان گلکرسٹ کی یہ ہدایت اردو نثر کے ارتقا کی اہم ترین منزل ہے۔ گلکرسٹ کی شعوری کوشش تھی کہ اردو نثر فارسی کے اثر سے باہر نکل کر خود اپنی سرزمین کی آزاد فضاؤں میں سانس لے۔ بہ ظاہر اس کی وجہ یہ تھی کہ "باغ و بہار" اور فورٹ ولیم کالج کی دوسری کتابیں درسی مقاصد سے تالیف یا ترجمہ کرائی گئی تھیں۔ اب تک اردو نثر اس طبقے کے لیے لکھی گئی تھی، جو فارسی سے بخوبی واقف تھا اور جس کے مشرقی مزاج کو عبارت کی رنگینی اور پیچیدگی بہت پسند تھی۔ اب پہلی بار کچھ ایسے لوگوں کو اردو سکھانے کے لیے اردو کی نثری تالیفات اور تراجم کی ضرورت پڑی، جن کی مادری زبان انگریزی تھی، اور جنھیں اپنے ادبی ذوق کی آسودگی سے زیادہ وہ زبان سیکھنے کی ضرورت تھی، جو ہندوستانی عوام سے رابطے کا کام کرسکتی ہو۔ اب آپ باغ و بہار کی داستان کا پہلا پیراگراف ملاحظہ فرمائیں:

> "اب آغاز قصے کا کرتا ہوں۔ ذرا کان دھر کر سنو اور منصفی کرو۔ سیر میں چار درویش کے یوں لکھا ہے اور کہنے والے نے اس طرح کہا ہے کہ آگے روم کے ملک میں کوئی شہنشاہ تھا کہ نوشیرواں کی سی عدالت اور حاتم کی سی سخاوت اُس کی ذات میں تھی۔ نام اس کا آزاد بخت تھا اور شہر قسطنطنیہ جس کو استنبول کہتے ہیں، اس کا پاے تخت تھا۔"[1]

"باغ و بہار" میں پہلی بار اردو نثر نے اپنی مکمل شناخت کرائی ہے اور پہلی بار اپنی قواعدی ساخت کی پابندی کی ہے۔ اس لیے اگر ہم یہ کہیں کہ جدید نثر کا آغاز فورٹ ولیم کالج کی "باغ و بہار" اور دوسری تالیفات سے ہوتا ہے تو غلط نہ ہوگا۔

یہ ممکن نہیں ہے کہ فورٹ ولیم کالج کا اثر اس عہد کے دوسرے نثر نگاروں پر نہ ہوا ہو۔ اس کالج میں لکھی جانے والی نثر نے یہ احساس عام کردیا تھا کہ اگر اردو نثر کو اپنی انفرادیت حاصل کرنی ہے تو فارسی اور عربی کے غیر مانوس الفاظ اور محمد شاہی روشوں سے گریز کرنا ہوگا۔ انشاء اللہ خاں انشا کی "رانی کیتکی کی کہانی" اس سمت میں ایک مبالغہ آمیز کوشش ہے۔

رجب علی بیگ سرور نے "فسانۂ عجائب" میں میر امن کی زبان پر اعتراض کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ خود میر امن کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکے۔ میر امن نے "باغ و بہار" میں اپنی زبان کے بارے میں جو کچھ کہا تھا۔ اس کی بازگشت سرور کے "فسانۂ عجائب" میں اس طرح ملتی ہے۔ بہ قول سرور اُن کے دوستوں نے درخواست کی :

> " تو اس قصۂ پراگندہ کو از آغاز تا انجام زبانِ اردو میں فراہم اور تحریر کرے تو نہایت منظور نظرِ اہل بصر ہو، لیکن تقصیر معاف ہو لغت سے صاف ہو..... جو روزمرہ اور گفت گو ہماری تمہاری ہے، یہی ہو۔ ایسا نہ ہو کہ آپ رنگینیِ عبارت کے واسطے دقّت طلبی اور نکتہ چینی کریں، ہم ہر فقرے کے معنی فرنگی محل کی گلیوں میں پوچھتے پھریں"۔[1]

ئے چل کر سرور لکھتے ہیں :

> " نظرِ ثانی میں جو لفظ دقّت طلب، غیر مستعمل عربی فارسی کا مشکل تھا، اپنے نزدیک اسے دور کیا اور جو کلمہ سہلِ ممتنع محاورے کا تھا، وہ رہنے دیا"۔[2]

سرور رنگیں بیانی سے ضرور کام لیتے ہیں لیکن "فسانۂ عجائب" کے کچھ حصے سادگی، شگفتگی اور فصاحت کے لحاظ سے "باغ و بہار" کے مقابلے میں رکھے جا سکتے ہیں۔ جو اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ رجب علی بیگ سرور جیسا نثر نگار بھی فورٹ ولیم کالج سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔

جدید اردو نثر کے ارتقا میں دوسری اہم منزل دلی کالج ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی ہے جو ۱۸۴۳ء میں دلی میں قائم ہوئی۔ اس سوسائٹی نے ہندوستانی طالب علموں کے لیے نصاب کی کتابیں تیار کیں، جن میں بیشتر مختلف علوم کی انگریزی کتابوں کا ترجمہ تھیں۔

فورٹ ولیم کالج نے اگرچہ جدید اردو نثر کی ابتدا کی تھی لیکن اُس کی مطبوعات، اخلاقیات، تاریخ، داستان، لغت اور صرف و نحو تک ہی محدود تھیں؛ دلی کالج ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی نے اپنے ترجموں کے ذریعے پہلی بار ہندوستانی ذہن کو مغربی فکر اور

مغربی ادب سے آشنا کیا۔

دلی کالج اور سوسائٹی کی مطبوعات نے اردو نثر کے جدید آہنگ کے لیے فضا بالکل ہموار کر دی اور اس نثر کو فروغ حاصل ہوا اردو اخبار نویسی سے۔

اگرچہ اردو کے پہلے اخبار" جامِ جہاں نما" کا ۱۸۲۲ء میں کلکتے سے اجرا ہوا لیکن دلی میں پہلا اردو اخبار" دہلی اخبار" کے نام سے ۱۸۳۷ء میں جاری ہوا، جس کے اڈیٹر مولوی محمد حسین آزادؔ کے والد مولوی محمد باقر تھے۔ اسی سال یعنی ۱۸۳۷ء میں سر سید احمد خاں کے بھائی سید محمد خاں نے" سید الاخبار" جاری کیا۔ ۱۸۴۸ء اور ۱۸۵۳ء کے درمیان دہلی سے کم سے کم بارہ اخبار شائع ہوتے تھے۔ ان کے نام ہیں" سراج الاخبار"، " صادق الاخبار" فارسی میں اور " دہلی اردو اخبار"، " سید الاخبار"، " مظہرِ حق"، " محبِ ہند"، " فوائد الناظرین"، " تحفۃ الحدائق" " قران السعدین"، " دقیق الاخبار"، " نورِ مغربی" اور " نورِ مشرقی" اردو میں۔ ان اخباروں کے بارے میں ایک دلچسپ بات یہ تھی کہ " سید الاخبار"، " محبِ ہند"، " قران السعدین" اور " فوائد الناظرین" کے خریداروں میں ہندوستانی کم اور انگریز زیادہ تھے۔ ظاہر ہے کہ اڈیٹروں کو اخبار کی زبان کا وہی معیار قائم کرنا پڑا ہوگا جو فورٹ ولیم کالج کے ترجموں کا تھا۔ یعنی صاف، سادہ، سلیس اور روزمرہ کی زبان۔

غالبؔ جدید اردو نثر کے موجد ہرگز نہیں تھے،

کیوں کہ اُن کی نثر نگاری کے آغاز سے تقریباً پچاس سال قبل اردو نثر جدیدیت کے راستے پر گامزن ہو چکی تھی۔ غالبؔ نے" قاطعِ برہان" کے سلسلے میں اردو نثر میں چار رسالے لکھے تھے۔ ان کے علاوہ مختلف کتابوں پر دیباچے اور تقریظیں اور کچھ متفرق تحریریں لکھیں۔ چوں کہ یہ چاروں رسالے" قاطعِ برہان" کے معرکے کے سلسلے میں لکھے گئے تھے اور ان میں الفاظ پر بحث کی گئی تھی۔ اس لیے ان رسالوں کی خوبی اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ صاف اور سادہ اردو نثر میں ہیں۔ اردو نثر میں غالبؔ کا اصل کارنامہ اُن کے

خطوط ہیں۔

یہ بھی ایک اہم مسئلہ ہے کہ اردو مکتوب نگاری میں کس نے پہلی بار طرزِ جدید کو اختیار کیا۔ حالی نے یادگارِ غالب میں غالب کی خطوط نویسی پر تبصرہ کرتے ہوتے لکھا تھا۔

> مرزا کی اردو خط وکتابت کا طریقہ فی الواقع سب سے نرالا ہے۔ نہ مرزا سے پہلے کسی نے خط وکتابت میں یہ رنگ اختیار کیا، اور نہ اُن کے بعد کسی سے اُس کی پوری پوری تقلید ہو سکی[1]

حالی نے غالب کے خطوط کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ حرف صحیح ہے۔ حالی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ غالب اردو مکتوب نگاری کے موجد اور باوا آدم ہیں، وہ تو صرف یہ کہہ رہے ہیں کہ خطوط میں غالب نے جو رنگ اختیار کیا، وہ منفرد تھا۔ یعنی غالب سے پہلے کوئی بھی اردو خط میں یہ انداز اختیار نہ کر سکا اور نہ کوئی اُن کی تقلید میں کامیاب ہو سکا یہی بات اُن کی شاعری کے بارے میں بھی کہی جاتی ہے۔ اُن کا مطلب یہ کہاں ہے کہ غالب فارسی اور اردو شاعری کے موجد تھے۔

جوشِ عقیدت میں ہمارے بہت سے ناقدین نے اردو مکتوب نگاری کا موجد غالب کو قرار دے کر مکتوب نگاری کی تاریخ ہی غالب سے شروع کی۔

ماسٹر رام چندر کے "محبِ ہند" (جلد نمبر ۲۹، بابت دسمبر ۱۸۴۹ء و جنوری ۱۸۵۰ء) میں مکتوب نگاری کے فن پر ایک چھوٹا سا نوٹ شائع ہوا تھا۔ جس میں جدید اصول بیان کیے گئے تھے۔ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی نے اس نوٹ کے حوالے سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اردو مکتوب نگاری کے طرزِ جدید کے موجد ماسٹر رام چندر تھے اور بہ قول پنڈت کیفی "ظنِ غالب یہ ہے کہ ماسٹر رام چندر کا یہ مضمون مرزا غالب کی نظر سے ضرور گزرا ہوگا اور ان کی طبعِ وقاد نے اُس سے ضرور اثر لیا ہوگا۔"

ماسٹر رام چندر کا نوٹ دسمبر ۱۸۴۹ء میں شائع ہوا تھا۔ جب کہ اب تک کے دستیاب

خطوط میں غالبؔ کا قدیم ترین اردو خط وہ ہے، جو ۱۸۴۷ء یا اس سے قبل غالبؔ نے تفتہؔ کو لکھا تھا۔ گویا ماسٹر رام چندر کا نوٹ شایع ہونے سے تقریباً ڈیڑھ یا دو سال قبل۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ اس تاریخ سے قبل بھی غالبؔ نے اردو میں ایسے خطوط لکھے نہ ہوں۔

غالبؔ کی "پنج آہنگ" کے ابتدائی تین آہنگ ۱۸۲۵ء میں لکھے گئے۔ لیکن "پنج آہنگ" کی طباعت کی نوبت اگست ۱۸۴۹ء میں آئی۔ اگرچہ آہنگ اول میں غالبؔ نے خطوط نویسوں کی سہولت کے لیے القاب و آداب اور شکر و شکوہ اور شادی و غم کے متعارفہ اور رسمی الفاظ تحریر کیے ہیں" لیکن اسی آہنگ میں یہ بھی لکھا ہے کہ " اس روش سے بیگانگی میرا شیوہ ہے"۔ اسی آہنگ میں غالبؔ نے مکتوب نگاری کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہمیں چاہیے کہ مکتوب الیہ کی حیثیت کے مطابق القاب ملا کر اپنا مدعا بیان کرنا شروع کر دیں۔ طویل القاب و آداب اور خیریت و عافیت پوچھنا حشو و زائد ہے۔ خط لکھنے والے کو چاہیے کہ تحریر کو تقریر سے دور نہ کرے اور تحریر کو گفتگو کا رنگ دے"۔

ممکن ہے کہ غالبؔ نے یہ الفاظ ۱۸۲۵ء میں آہنگِ اول لکھتے ہوئے نہ لکھے ہوں بلکہ طباعت کے وقت اضافہ کیے ہوں، تب بھی ماسٹر رام چندر کا نوٹ شایع ہونے سے کم سے کم چار مہینے پہلے لکھے تھے کیوں کہ "پنج آہنگ" کا پہلا اڈیشن ۱۸۴۹ء میں شایع ہوا تھا۔

غالبؔ اگرچہ انگریزی نہیں جانتے تھے، لیکن انگریزی مکتوب نگاری کے اصول و ضوابط سے پوری طرح واقف تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پنشن کے سلسلے میں برطانوی حکومت سے اُن کی خط و کتابت تھی۔ غالبؔ کو حکومت کے خط انگریزی میں ملتے تھے۔ اور غالبؔ حکومت کے افسران کو انگریزی اور فارسی دونوں زبانوں میں خط لکھتے تھے۔ غالبؔ خط کا مسودہ فارسی یا اردو میں تیار کرتے تھے اور ایسے لوگوں سے ترجمہ کرواتے تھے جو انگریزی اور انگریزی مکتوب نگاری کے فن سے بخوبی واقف تھے نیشنل آرکائوز نئی دہلی

میں غالؔب کے وہ خطوط محفوظ ہیں جو انھوں نے برطانوی حکومت کے اعلیٰ افسران کو پنیشن کے سلسلے میں لکھے تھے۔ ان خطوط میں مطلب کی بات بیان کی گئی ہے۔ ایک فقرہ بھی زائد نہیں ہے۔ حد تو یہ ہے کہ خیر و عافیت اور دعائیہ کلمے وغیرہ بھی نہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے مکتوب لکھنے کا انداز غالؔب نے انگریزوں اور انگریزی داں ہندوستانیوں سے سیکھا ہوگا۔ اور اس عہد میں برطانوی حکومت سے انگریزی میں خط و کتابت صرف غالؔب ہی کی نہیں، بیشتر لوگوں کی تھی۔ اس لیے جدید طرز پر مکتوب نگاری کے آغاز کا سہرا نہ تو ماسٹر رام چندر کے سر باندھا جا سکتا ہے اور نہ غالؔب کے سر۔ "طرزِ جدید" کا شعور عام ہو چکا تھا۔

تو کیا اردو نثر اور اردو مکتوب نگاری میں غالؔب کی کوئی اہمیت نہیں؟ جی نہیں، ایسا نہیں ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ غالؔب اردو نثر کے موجد ہیں اور نہ اردو مکتوب نگاری کے باوا آدم۔ لیکن غالؔب کے خطوط اردو مکتوب نگاری کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ کیوں کہ غالؔب کے جدت پسند ذہن نے اس فن کو نیا آب و رنگ دیا ہے۔ غالؔب نے خود بھی کبھی دعویٰ نہیں کیا کہ آسان، صاف، سادہ اور تکلف و تصنع سے پاک زبان میں اردو مکتوب نگاری کا انھوں نے آغاز کیا ہے۔ ہاں غالؔب نے بارہا یہ دعویٰ ضرور کیا ہے کہ انھوں نے مراسلے کو مکالمہ اور خط کو ملاقات کا بدل بنا دیا ہے اور ان کا یہ دعویٰ سو فی صدی درست ہے۔

غالؔب کی اردو نثر نگاری کے بارے میں شیخ محمد اکرام نے لکھا ہے:

> "حقیقتاً یہ زمانہ (۱۸۵۷ء - ۱۸۶۹ء) مرزا غالؔب کی اردو نثر کا تھا[۱]۔"

ڈاکٹر ظ۔ انصاری کا بیان ہے کہ:

> "اس زمانے (یعنی ۱۸۵۷ء) میں اور اُس کے بعد جب تک وہ (مرزا غالؔب) زندہ رہے ان کی توجہ نثر پر رہی۔ فارسی میں کم اور اُردو میں زیادہ[۲]۔"

ان دونوں حضرات کے بیانات بالکل درست ہیں، لیکن اس سلسلے میں سب سے دلچسپ

بیان ڈاکٹر معین الرحمٰن کا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

> " انقلاب ۱۸۵۷ء نے ہم سے شاعر غالب کو چھین لیا۔ جب کہ نثر نگار غالب کا ظہور اس انقلاب کے بعد ہوا!"

شیخ محمد اکرام اور ڈاکٹر ظ۔ انصاری دونوں کے بیانات درست ہیں۔ لیکن ڈاکٹر معین الرحمٰن کے بیان سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ غالب نے ۱۸۵۷ء کے بعد شعر و شاعری ترک کر کے پوری توجہ نثر کی طرف مبذول کر دی۔ یہ صحیح نہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ڈاکٹر معین الرحمٰن کے اس بیان کی خاصی پذیرائی ہوئی۔

پروفیسر آلِ احمد سرور نے کہا کہ اس بیان میں ڈاکٹر معین الرحمٰن نے سامنے کی حقیقت کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ محمد عبدالرحمٰن چغتائی نے اس فقرے کی داد دیتے ہوئے لکھا کہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن نے اپنے اس موقف کو بڑی خوبصورتی سے نبھایا ہے۔ اور اس کی تائید میں ایسی محکم شہادتیں پیش کی ہیں اور خوش تدبیری سے نتائج نکالے ہیں کہ ان کی بات مانے بغیر چارہ نہیں۔

مجھے اس فقرے کے دونوں حصوں سے اختلاف ہے۔ انقلاب ۱۸۵۷ء نے ہم سے شاعر غالب کو نہیں چھینا، کیوں کہ شاعر غالب ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے ہم سے چھینے جا چکے تھے اور نہ ہی نثر نگار غالب کا ظہور ۱۸۵۷ء کے بعد ہوا کیوں کہ یہ ظہور بہت پہلے ہو چکا تھا۔

پہلے اُن کی شاعری کو لیجیے۔ یہ تو عام طور پر ہوتا ہے کہ فنکار مدت تک تخلیق کی طرف متوجہ نہیں ہوتا اور جب اس کا موڈ آتا ہے تو ساری کسر نکل جاتی ہے لیکن غالب کے ساتھ معاملہ دوسرا تھا۔ ذاتی زندگی کی ناکامی نے ان کے دل و دماغ کو اس بُری طرح متاثر کیا تھا کہ ان کے تخلیقی سوتے بہت پہلے خشک ہونے لگے تھے۔

غالب کی زندگی کا سب سے پہلا المناک واقعہ پینشن کے معاملے میں اُن کی ناکامی

تھی۔ غالب بہت امیدوں سے کلکتے گئے تھے۔ کلکتے کے سفر اور وہاں کے قیام نے انہیں بہت مقروض کر دیا تھا۔ جب جنوری ۱۸۳۱ء میں اُن کے خلاف فیصلہ ہوا تو اُن کی دنیا اندھیر ہوگئی۔ اور بہ قول غالب "قرض الگ۔ رسوائی الگ اور مستقبل کا خوف الگ"۔ اس واقعے سے غالب ایسے دل برداشتہ ہوئے کہ انھیں شعر گوئی سے دلچسپی نہیں رہی۔ بہ قول مولانا امتیاز علی خاں عرشی:

> "اور پھر جنوری ۱۸۳۱ء میں مقدمہ اُن کے خلاف فیصل ہوا، تو مستقبل کے خوفناک تصور نے اُن کے دل و دماغ کو سخت اذیت پہنچائی اور پہلی بار اُن کی طبیعت نے فکر شعر و سخن سے تنفر کا اظہار کیا۔ اب وہ غزل کہتے تھے مگر دوستوں کے اصرار پر اور قصائد بھی لکھتے تھے مگر مالی پریشانیوں کے بھوت کو دفع کرنے کے لیے"[۱]

مولوی سراج الدین احمد سے غالب کی ملاقات کلکتے میں ہوئی تھی اور کلکتے سے واپسی پر اُن سے خط و کتابت ہوئی۔ مولوی صاحب کے نام غالب کا ایک فارسی خط ہے جس پر تاریخِ تحریر نہیں ہے۔ مولانا عرشی کا خیال ہے کہ یہ ۱۸۳۵ء یا ۱۸۳۶ء میں لکھا گیا۔ غالب لکھتے ہیں:

> "تازہ غزل بھیجنے کے بارے میں آپ کا ارشاد سر آنکھوں پر۔ مگر دل کی خونابہ فشانی اور فکر کی جگر کاوی کے بغیر غزل موزوں نہیں ہوتی اگر مجھے غمِ روزگار سے تھوڑی سی بھی مہلت ملتی تو پھر آپ میری فکر کے جوہر دیکھتے۔ بہ ہر حال اس افسردگی کے باوجود جس وقت بھی کوئی شعر زبان پر آجائے گا اُسے سپردِ قلم کرکے، خدمتِ گرامی میں بھیج دوں گا۔"[۲] —— (فارسی سے ترجمہ)

۱۸۴۰ء میں جب رام پور کے نواب محمد سعید خاں تخت نشیں ہوئے تو اُن کے بھائی نواب عبداللہ خاں بہادر صدر الصدور میرٹھ نے اس موقع کے لیے غالب سے قصیدے کی فرمایش کی۔ غالب اُن کے نام ایک فارسی خط میں جواب دیتے ہیں:

> „لیکن کیا کروں کہ شعر گوئی کا تعلق دل سے ہے۔ جب دل ہی ٹھکانے نہ ہو تو زبانِ سخن کہاں سے ملے؟ آپ جیسے دیدہ ور صاحبِ دل سے بڑھ کر اس حقیقت کا شناسا اور کون ہوگا کہ شعر کہنے کے لیے دل کا یک سو ہونا ضروری ہے یقین کیجے کہ یہ دلِ صد پارہ جو میرے سینے میں ہے میرا دشمن بن گیا ہے اور اب سخن گستری اور معنی آفرینی کا اہل نہیں رہا ..... امید ہے کہ اس گزارش کے بعد آپ نظم و نثر کے لحاظ سے مجھے مردہ تصور فرمائیں گے اور دعائے خیر میں یاد رکھیں گے۔“ —— (فارسی سے ترجمہ)

اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب سخن گستری اور معنی آفرینی سے متنفر ہی نہیں ہوئے تھے بلکہ ذہنی اعتبار سے شعر گوئی کے قابل ہی نہیں رہے تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو غالب قصیدہ ضرور لکھتے، کیوں کہ اس کا پورا امکان تھا کہ غالب کو اس قصیدے پر انعام ملتا۔ یہ خیال رکھیے کہ اس وقت غالب کی عمر تقریباً ۴۳ سال ہے اور ابھی ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب میں سترہ سال باقی ہیں۔

غالب کے اردو دیوان کا پہلا اڈیشن ۱۸۴۱ء میں شائع ہوا تھا اس میں اشعار کی تعداد ۱۰۹۵ تھی۔ دوسرا اڈیشن ۱۸۴۷ء میں شائع ہوا تو یہ تعداد ۱۱۱۱ ہوگئی گویا چھ سال میں کم و بیش سولہ شعر کا اضافہ ہوا۔ تیسرا اڈیشن ۱۸۶۱ء میں شائع ہوا تو اس میں اشعار کی تعداد ۱۷۹۶ ہوگئی اور چوتھا اور غالب کی زندگی کا آخری اڈیشن ۱۸۶۲ء میں شائع ہوا تو یہ تعداد ۱۸۰۲ ہوگئی۔ ممکن ہے کہ غالب نے زیادہ تعداد میں شعر کہے ہوں لیکن انتخاب انہیں اشعار کا کیا۔ پھر بھی منتخب اشعار کی تعداد سے ان اشعار کی تعداد کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، جو اُس زمانے میں کہے ہوں گے۔

ان اعداد و شمار سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ۱۸۴۱ء اور ۱۸۴۷ء کے درمیان غالب نے شعر گوئی تقریباً ترک کر دی تھی اس لیے ۱۸۴۷ء کے اڈیشن میں صرف سولہ اشعار کا اضافہ

ہوا۔ ۱۸۵۰ء میں غالب قلعے میں ملازم ہو گئے تو بادشاہ اور شہزادوں کے اصرار پر انھیں مجبوراً اردو میں غزلیں کہنی پڑیں۔

غالب اپنی اس مجبوری کا ذکر انور الدولہ نواب سعد الدین خاں شفق کے نام اس طرح کرتے ہیں :

> " ہر چند ایک مدت سے طبیعت اردو شعر کہنے پر مائل نہیں لیکن کبھی کبھی بادشاہ کی رضا جوئی اور ملکۂ عالیہ کے فرمان کی تعمیل میں اردو میں بھی شعر کہنے پڑتے ہیں۔" (پنج آہنگ، اردو ترجمہ، ص ۱۵۰)

۲ ، جنوری ۱۸۵۵ء کے ایک خط میں سید بدر الدین احمد المعروف بہ فقیر کو لکھتے ہیں :

> " آپ ہندی اور فارسی غزلیں مانگتے ہیں۔ فارسی غزل تو شاید ایک بھی نہیں کہی ہاں ہندی غزلیں قلعے کے مشاعرے میں دو چار لکھی تھیں، سو وہ یا تمھارے دوست حسین مرزا صاحب کے پاس ہوں گی یا ضیاء الدین خاں صاحب کے پاس"

گویا قلعے کی ملازمت کے دوران غالب نے اُردو میں کچھ غزلیں کہیں اور فارسی میں شاید ایک بھی نہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ دیوانِ اردو کا جب تیسرا اڈیشن شائع ہوا تو اُس میں ۶۸۵ اور چوتھے اڈیشن میں مزید چھ شعر کا اضافہ ہوا۔ اگر پہلے اڈیشن کے سنہ طباعت یعنی ۱۸۴۱ء سے آخری اڈیشن کے سنہ طباعت ۱۸۶۲ء تک کہے گئے اردو اشعار کی سالانہ اوسط نکالی جاتے تو غالب نے اکیس سال میں کم و بیش ۷۲۷ اشعار یعنی اوسطاً چونتیس شعر فی سال کہے۔ اگر غالب قلعے میں ملازم نہ ہوئے ہوتے اور بادشاہ کی مجبوری نہ ہوتی تو ان اشعار کی تعداد غالباً اور بھی کم ہوتی۔

اس کا مطلب ہے کہ پنشن کے مقدمے میں ناکامی، مالی دشواری ۱۸۴۱ء اور پھر ۱۸۴۷ء میں جوئے کے الزام میں گرفتاری جیسے واقعات نے غالب کی تخلیقی قوت

۱۸۵۷ء سے بہت پہلے ہی سلب کر لی تھی۔ اور غدر نے نہیں بلکہ غالب کی زندگی کے اندوہناک واقعات نے شاعرِ غالب کو ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے ہم سے چھین لیا تھا۔

ڈاکٹر معین الرحمٰن کے بیان کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ: "نثر نگار غالب کا ظہور ۱۸۵۷ء کے بعد ہوا"۔ اگر معین الرحمٰن صاحب کہتے کہ غالب نے ۱۸۵۷ء کے بعد اردو نثر پر زیادہ زور دیا، تو یہ بات قابلِ اعتراض نہیں تھی۔ کیوں کہ غالب کا ۱۸۵۷ء سے پہلے فارسی اور اردو نثری سرمایہ اتنا کم نہیں ہے کہ اسے نظر انداز کر دیا جائے۔

غالب نے ۱۸۵۷ء سے قبل منشی نبی بخش حقیر، مرزا ہرگوپال تفتہ، نواب یوسف مرزا، بدرالدین احمد کاشف اور منشی عبداللطیف وغیرہ کے نام اردو میں جو خط لکھے ہیں، اُن میں سے سو کے قریب دستیاب ہوئے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ ان خطوط کا $\frac{1}{9}$ حصہ ۱۸۵۷ء سے قبل لکھا گیا تھا۔ اس کا امکان زیادہ ہے کہ ۱۸۵۷ء سے قبل کے غالب کے خطوط زیادہ تعداد میں ضائع ہوئے ہوں۔ غرض اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ نثر نگار غالب کا ظہور ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے ہو چکا تھا، ہاں ۱۸۵۷ء کے بعد غالب نے اردو نثر اور خاص طور سے اردو مکتوب نگاری پر زیادہ توجہ دی۔

غالب کا پہلا دستیاب اردو خط

یہ کہنا مشکل بلکہ ناممکن ہے کہ غالب نے اردو میں مکتوب نگاری کا آغاز کب کیا اور اُن کا پہلا اردو خط کون سا ہے۔ غالب کے عہد میں خط وکتابت کی زبان فارسی تھی اور اُن کی آخری عمر میں اردو نے فارسی کی جگہ لینی شروع کی تھی۔ اس لیے زندگی کے بڑے حصے تک غالب فارسی ہی میں خط وکتابت کرتے رہے، اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اُس دوران میں غالب نے اردو میں کوئی خط لکھا ہی نہ ہوگا۔ کچھ خطوط ضرور لکھے ہوں گے۔ اُن کو کچھ ایسے لوگوں کو بھی خط لکھنے پڑے ہوں گے جو صرف اردو ہی لکھ پڑھ سکتے تھے۔ غالب کے ایسے بیشتر خطوط محفوظ نہیں رہے جو انھوں نے شاعروں، ادیبوں اور عالموں کو لکھے تھے اور جو غالب کے خطوط کی ادبی اہمیت سے پوری طرح واقف تھے تو پھر ہم اُن لوگوں سے خطوط کو محفوظ رکھنے کی کیسے توقع کر سکتے ہیں جو اُن کی ادبی اہمیت سے قطعی واقف نہیں تھے۔ قاضی عبدالودود کا یہ خیال بالکل درست ہے:

> "غالب سے سروکار رکھنے والوں میں ایسے لوگ، جو لکھنا پڑھنا جاننے کے باوجود فارسی سے بالکل ناواقف ہوں یا اُس سے کافی واقفیت نہ رکھتے ہوں، ضرور ہوں گے اور وقتاً فوقتاً ایسے لوگوں سے مراسلت بھی ہوئی

> ہوگی۔ انھیں فارسی میں خط لکھنے کے معنی یہ ہوتے کہ خواہ مخواہ ترجمہ کرانے کی زحمت دی جائے۔ ناچار اردو ہی میں خط لکھنا پڑا ہوگا۔ اسی طرح کبھی کبھی ناخواندہ لوگوں کو بھی خط لکھنے کی ضرورت پڑی ہوگی اور انھیں بھی فارسی کی جگہ اردو میں خط لکھا ہوگا۔ غالب کی زوجہ امراؤ بیگم، گمانِ غالب ہے کہ ناخواندہ ہوں۔ بنارس و کلکتہ سے جو خط غالب نے انھیں بھیجے تھے اور جن کا ذکر چھجمل کے نام کے خطوط میں ہے، وہ کس زبان میں ہوں گے!"

غالب نے فارسی میں مراسلت ترک کرنے اور اردو میں باقاعدہ مکتوب نگاری شروع کرنے سے قبل یقیناً اردو میں خطوط لکھے ہوں گے، چاہے اُن کی تعداد کتنی ہی کم کیوں نہ ہو۔ اس لیے غالب کے پہلے اردو خط کی نشان دہی کرنا کسی طرح ممکن نہیں۔ البتہ غالب کے اُس پہلے اردو خط کی نشان دہی کی جاسکتی ہے، جو ہمیں دستیاب ہوا ہے۔ اور ہم اس زمانے کا تعین کرسکتے ہیں، جب غالب نے فارسی کے مقابلے میں اردو میں زیادہ خطوط لکھنے شروع کیے اور اس زمانے کا اندازہ لگا سکتے ہیں جب غالب کی اردو مکتوب نگاری میں باقاعدگی پیدا ہوئی۔

غالب کی اردو مکتوب نگاری کے آغاز کے بارے میں پہلا بیان مولانا الطاف حسین حالی کا ہے۔ انھوں نے یادگارِ غالب میں لکھا ہے:

> "معلوم ہوتا ہے کہ مرزا ۱۸۵۰ء تک ہمیشہ فارسی میں خط و کتابت کرتے تھے مگر سنہ مذکور میں جب کہ وہ تاریخ نویسی کی خدمت پر مامور کیے گئے اور ہمہ تن "مہرِ نیمروز" کے لکھنے میں مصروف ہوگئے، اُس وقت بہ ضرورت اُن کو اردو میں خط و کتابت کرنی پڑی ہوگی۔ وہ فارسی نثریں اور اکثر فارسی خطوط، جن میں قوتِ متخیلہ کا عمل اور شاعری کا عنصر نظم سے بھی کسی قدر غالب معلوم ہوتا ہے نہایت کاوش سے لکھتے تھے۔ پس جب اُن کی ہمت مہرِ نیمروز کی

ترتیب و انشا میں مصروف تھی، ضرور ہے کہ اُس وقت اُن کو فارسی زبان میں خط و کتابت کرنی اور وہ بھی اپنی طرزِ خاص میں، شاق معلوم ہوئی ہو گی۔ اس لیے قیاس چاہتا ہے کہ انھوں نے غالباً سنہ ۵۰ء کے بعد سے اردو زبان میں خط لکھنے شروع کیے ہیں۔ چنانچہ وہ ایک[1] خط میں لکھتے ہیں کہ "زبان فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے۔ پیرانہ سری اور ضعف کے صدموں سے محنت پژوہی اور جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی[2]۔ حرارت غریزی کو زوال ہے اور یہ حال ہے:

مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ
اب عناصر میں اعتدال کہاں“[3]

یہ تو ممکن ہے کہ جولائی سنہ ۱۸۵۰ء کے بعد غالبؔ نے فارسی کے مقابلے میں اردو میں زیادہ خطوط لکھنے شروع کر دیے ہوں جس طرح یہ ممکن نہیں کہ اس تاریخ سے پہلے انھوں نے اردو میں کوئی خط نہ لکھا ہو، اس کا بھی امکان نہیں کہ اس تاریخ کے بعد غالبؔ نے فارسی میں بالکل خط نہ لکھے ہوں۔ بعض ناقدوں نے حالیؔ کے اس بیان کی روشنی میں یہ لکھنا شروع کر دیا کہ غالبؔ نے اردو مکتوب نگاری کا آغاز جولائی سنہ ۱۸۵۰ء میں کیا تھا، یہ درست نہیں۔ حالیؔ کا قول ہے کہ: ”اس وقت بہ ضرورت ان کو اردو میں خط و کتابت کرنی پڑی ہو گی“ اس کا غالباً مفہوم یہ ہے کہ ”مہرِ نیم روز“ کا مواد اکٹھا کرنے کے لیے غالبؔ نے بعض لوگوں کو جو خطوط لکھے، وہ اردو میں تھے۔ ممکن ہے حالیؔ کا یہ مطلب نہ ہو لیکن ہمارے بعض نقادوں نے اس عبارت کا یہی مفہوم سمجھا ہے۔ یہ کسی طرح بھی درست نہیں۔ غالبؔ نے ”مہرِ نیم روز“ کا مواد خود اکٹھا کیا نہ اس کا مسودہ تیار کیا۔ انھوں نے ۱۹ نومبر سنہ ۱۸۵۲ء اور ۱۰ اپریل سنہ ۱۸۵۳ء کو جو خطوط منشی نبی بخش حقیر کو لکھے ہیں، اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ ”کار پردازانِ شاہی“ اردو میں مسودہ تیار کر کے بھیج دیا کرتے تھے۔ غالبؔ کا کام صرف اس اردو مسودے

کا فارسی میں ترجمہ کرنا تھا۔ اگرچہ کوئی قطعی ثبوت نہیں لیکن اس کا امکان ہے کہ یہ مسودہ حکیم احسن اللہ خاں کی نگرانی میں تیار ہوتا ہو یا مسودہ تیار ہونے کے بعد حکیم صاحب اس پر ایک نظر ڈال لیتے ہوں۔ بہرحال "مہر نیم روز" ۱۱۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ غالب نے جولائی ۱۸۵۰ء میں شروع کیا اور اگست ۱۸۵۴ء کو یعنی چار سال اور ایک مہینے میں یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اتنی بڑی مدت میں ۱۱۶ صفحات کا ترجمہ، غالب کو اتنا مصروف نہیں رکھ سکتا تھا کہ غالب کو فارسی میں خطوط لکھنے کی بھی فرصت نہ ملے!

غلام رسول مہر کے خیال میں غالب کے دستیاب شدہ خطوط میں سب سے قدیم خط وہ ہے، جو غالب نے جواہر سنگھ جوہر کو لکھا تھا۔ اور جس میں لنگی کی فرمایش کی تھی۔ اس خط پر تاریخ تحریر یکم دسمبر ۱۸۴۸ء ہے۔ اردو میں جواہر سنگھ جوہر کے نام تین خط ہیں۔ پہلے خط کے آخر میں غالب لکھتے ہیں:

> "کیوں صاحب، وہ ہماری لنگی اب تک کیوں نہیں آئی۔ بہت دن ہوئے جب تم نے لکھا تھا کہ اسی ہفتے میں بھیجوں گا۔"

امکان یہی ہے کہ یہ خط دسمبر ۱۸۴۸ء کے آخر میں یا ۱۸۴۹ء کے اوائل میں لکھا گیا۔ اس لیے غلام رسول مہر کے خیال میں اب تک غالب کے جو اردو خطوط ملے ہیں، اُن میں یہ قدیم ترین ہے۔

مولوی مہیش پرشاد کے مرتبہ "خطوطِ غالب" کی جلد اول میں (جوہر کے نام اردو خط اس جلد میں شامل نہیں ہیں اور دوسری جلد شائع نہ ہو سکی) غالب کا قدیم ترین خط وہ ہے جو غالب نے مرزا ہرگوپال تفتہ کے نام لکھا تھا۔ اس خط پر تاریخ تحریر نہیں ہے۔ مہیش پرشاد نے اس خط کی تاریخ تحریر اگست ۱۸۴۹ء متعین کی ہے۔ اگرچہ مولوی صاحب نے اپنے دلائل پیش نہیں کیے، لیکن انھوں نے اس تاریخ کا تعین غالباً اس بنیاد پر کیا ہے کہ اس خط میں غالب نے، تفتہ کے دیوانِ اول پر جو تقریظ لکھی تھی اُس کا ذکر کیا ہے۔

۲۰ اگست ۱۸۴۹ء کے "اسعد الاخبار" میں دیوانِ تفتہ کے بارے میں یہ اطلاع شائع ہوئی تھی:

> "دیوانِ تفتہ جو اس مطبع میں چھپا ہے، ربع سے زیادہ چھپ چکا ہے۔ وہ بھی اس موسم سرما میں انشاء اللہ تعالیٰ تمام ہوگا۔ اُس کی ضخامت ۴۵ جز کے قریب ہے اور قیمت چار روپے۔ بعد اختتام کے پانچ ہوجائیں گے....
> خصوصاً اسد اللہ خاں غالب دہلوی تو اس کے بہت ثنا خواں ہیں!"

اس اقتباس کے آخری فقرے میں غالباً اسی تقریظ کا حوالہ ہے۔ جو غالب نے لکھی تھی۔ اس لیے مولوی مہیش پرشاد کا یہ قیاس درست معلوم ہوتا ہے کہ تفتہ کے نام غالب کا زیرِ بحث خط اگست ۱۸۴۹ء میں لکھا گیا۔ گویا اب دو قدیم ترین خط ہوگئے۔ ایک تو جواہر سنگھ جوہر کے نام جو دسمبر ۱۸۴۸ء کے آخر میں یا ۱۸۴۹ء کے اوائل اور غالباً جنوری ۱۸۴۹ء میں لکھا گیا۔ اور دوسرا خط تفتہ کے نام، جو اگست ۱۸۴۹ء میں لکھا گیا۔

غالب کے ایک اور خط کا پتا چلتا ہے، جو ان دونوں خطوں سے پہلے کا ہے، وہ خط بھی مرزا ہرگوپال تفتہ کے نام ہے۔

مولوی مہیش پرشاد نے تفتہ کے نام غالب کے اس خط کی تاریخِ تحریر تو متعین نہیں کی، لیکن اسے ۲۱ اگست ۱۸۵۳ء اور ۱۳ جنوری ۱۸۵۴ء کے خطوط کے درمیان مرتب کیا ہے۔ اس خط میں غالب نے تفتہ کے دو فارسی اشعار پر اصلاح دی ہے، اور تفتہ کا ایک مصرع نقل کیا ہے:

زاہدا، ایں سخنت ہرزہ کہ گفتی، چہ شدی
حق غفورست، گناہے شدہ ام تا چہ شود

بازآر دلِ خود از چنیں کار
آزار چہ می کنی دلم را

اسی خط میں تفتہ کا ایک مصرع اور نقل کیا گیا ہے :

خارہا در راہش افشانم کہ چوں خواہد شدن

یہ دونوں شعر دیوانِ اول میں موجود ہیں۔ چوں کہ میرے پیشِ نظر تفتہ کا جو دیوانِ اول ہے، وہ ناقص الآخر ہے اور صرف م کی ردیف تک ہے اس لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ تیسرا شعر جس غزل کا ہے وہ بھی دیوانِ اول میں ہے یا نہیں۔

۱۸ دسمبر ۱۸۴۸ء کے اسعد الاخبار میں یہ اطلاع چھپی تھی کہ :

"ان دنوں میں دیوانِ تفتہ سکندر آبادی اس مطبع میں چھپنا شروع ہوا ہے اور یہ وہی دیوان ہے، جس کا اشتہار اخبار ہذا میں اواخر ۱۸۴۷ء میں دیا گیا تھا۔ بہ سبب عدیم الفرصتی کے، اب تک ملتوی رہا۔ اب اس کی تدبیر کی گئی"۔

دیوانِ تفتہ کے بارے میں اس اشتہار پر تبصرہ کرتے ہوئے قاضی عبدالودود لکھتے ہیں :

"اواخر ۴۷ء میں دیوان کا اشتہار چھپا تھا؛ مگر دیوان اس وقت کس شکل میں تھا اس کا مطلق علم نہیں، قیاس چاہتا ہے کہ مکمل ہو"۔ مجھے قاضی صاحب کے اس خیال سے اتفاق ہے کہ اواخر ۱۸۴۷ء میں دیوانِ تفتہ مرتب ہو چکا ہوگا۔ اس کا مطلب ہے کہ تفتہ کے نام غالب کا زیرِ بحث خط اوائل ۱۸۴۷ء میں لکھا گیا ہوگا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ تفتہ نے غالب کی اصلاح کو نہیں مانا۔ اور دونوں اشعار دیوان میں شامل کر لیے۔ اس کا امکان ہے کہ دیوان میں غزلیں شامل کرنے کے بعد غالب کو اصلاح کے لیے بھیجی گئیں اور غالب نے خط کا جواب اتنی تاخیر سے دیا کہ دیوان کا وہ حصہ چھپ چکا تھا جس میں یہ اشعار تھے۔ میرے خیال سے ایسا نہیں ہے، اس سلسلے میں میری دلیل یہ ہے کہ تفتہ کے دیوانِ اول کا جو نسخہ اس وقت میرے پیشِ نظر ہے، وہ تفتہ کی ملکیت رہ چکا ہے،

کیوں کہ بہت سی غزلوں پر لکھا ہوا ہے: "ایں غزل بعد نظرِ ثانی در دیوانِ دوم نوشتہ شد" بعض اشعار اور بعض مصرع قلمزد کر کے دوسرے لکھے گئے ہیں۔ اگر دیوان اول کی طباعت کے بعد غالب کی اصلاح تفتہ کو ملتی تو دیوانِ اول کے اس مطبوعہ نسخے پر تفتہ ان اشعار کو قلمزد کر کے اصلاح شدہ اشعار لکھ دیتے۔

اس پوری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اب تک غالب کے جتنے اردو خطوط کی بازیافت ہوئی ہے، ان میں قدیم ترین خط وہی ہے، جو تفتہ کے نام ۱۸۴۷ء میں لکھا گیا۔

جلال الدین صاحب کو ۱۹۷۵ء میں غالب کے سولہ فارسی اور پانچ اردو غیر مطبوعہ خطوط ایک قدیم مخطوطے میں ملے تھے۔ جلال الدین صاحب نے ان خطوط کا تعارف "ہماری زبان" نئی دہلی کی ۱۵ نومبر ۱۹۷۵ء کی اشاعت میں کرایا ہے۔ بہ قول اُن کے یہ خطوط فرخ آباد کے نواب تجمل حسین خاں، علی حسین خاں ناظم، امانت علی خاں بلیغ، امداد علی خاں صاحبزادہ عرف چھوٹے خاں فرخ آبادی اور حکیم امام الدین خاں دہلوی کے نام ہیں۔ اور یہ سب خطوط بہ قول جلال الدین صاحب ۲۵ اپریل ۱۸۴۶ء اور ۱۳ نومبر ۱۸۴۶ء کے درمیان لکھے گئے ہیں۔

ان خطوط کا تعارف کراتے ہوئے سات سال گزر چکے ہیں لیکن جلال الدین صاحب نے ابھی تک یہ خطوط شائع نہیں کیے۔ اس لیے مجھے شبہہ ہوتا ہے کہ یہ خطوط جعلی ہیں۔ اگر جلال الدین صاحب انہیں چھاپ کر میرا شبہہ غلط ثابت کر دیں تو اردو میں غالب کا پہلا دستیاب خط ۲۵ اپریل ۱۸۴۶ء کا قرار پائے گا۔

مکتوب نگاری کا فن

مکتوب نگاری، فنونِ لطیفہ کا حصہ نہ ہوتے ہوئے بھی ایک باقاعدہ بلکہ اور فنون کے مقابلے میں زیادہ لطیف اور زیادہ شائستہ فن ہے۔ اسی لیے بعض اہلِ قلم نے اسے لطیف ترین فن کہا ہے۔ اور فنون کی طرح اس فن میں بھی بہترین نقوش وہی ہیں جو خونِ جگر سے ابھارے گئے ہیں۔ دوسرے فنونِ لطیفہ کی طرح اس میں بھی خامۂ خوں چکاں کی ضرورت ہے۔ دنیا کے بہترین مکتوب نگار عام طور سے وہی لوگ ہوئے ہیں جو زندگی کے تپتے ہوئے ریگ زاروں پر سینے کے بل چلے ہیں اور اُن کے خطوط اس سفر کی روداد ہیں۔ ان خطوط میں فنکار کے جادو جگانے والے قلم نے ذاتی و شخصی غم والم کی داستانوں کو کبھی درد انگیز لب ولہجہ میں بیان کیا ہے اور کبھی طنز و مزاح کے سہارے انھیں شگفتہ بنا دیا ہے۔ ذاتی اور شخصی تجربوں کو اپنے سلیقے، شائستگی ولطافت اور شخصیت کے رچاؤ سے آفاقیت اور اجتماعیت سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔

اگر کوئی ہمارے ہمسایے کی زندگی کے تمام واقعات من عن سُنائے تو ہمیں زیادہ دلچسپی نہیں ہوگی، بلکہ شاید ہم بور ہو جائیں، لیکن اگر ہم کسی ایسے روزن سے جھانکیں جس کا رُخ ہمسایے کے گھر کی طرف ہو اور جس سے ہم اپنے ہمسایے کی نجی زندگی دیکھ سکیں اور اسے زندگی کے معمولی مشاغل میں مصروف دیکھیں تو دلچسپی ہمیں اس روزن سے ہٹنے نہیں دے گی۔

کھڑکیوں، پردوں اور چلمنوں کے پیچھے سے گھنٹوں جھانکتی رہنے والی آنکھیں انسان کی اس فطرت سے مجبور ہیں جو دوسرے لوگوں کے خطوط پڑھنے پر ہمیں اکساتی ہے۔ خود نوشت حالات اور روزنامچے بھی دلچسپ ہوتے ہیں لیکن خطوط کا مطالعہ اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہوتا ہے، خاص طور پر دوسرے کے خطوط کا۔ خود نوشت حالات اور روزنامے لکھتے ہوئے لکھنے والے کو ہمیشہ یہ احساس رہتا ہے کہ وہ ایک سے نہیں، ہزاروں افراد سے مخاطب ہے، اس لیے اپنی شخصیت، کردار اور خیالات اور نظریات پر کچھ نہ کچھ پردے ضرور ڈالے رہتا ہے۔ نجی خط صرف دو آدمیوں کا معاملہ ہے۔ عام طور پر مکتوب نگار کو یقین ہوتا ہے کہ خط مکتوب الیہ تک پہنچ کر عدم کی پُراسرار وادیوں میں گم ہو جائے گا اور اس کا راز ہمیشہ راز رہے گا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو دنیا کے بیشتر خطوط اور خاص طور پر محبت نامے جن میں عاشق کی روح جلوہ گر نظر آتی ہے وجود میں نہ آتے۔ یہ خطوط عام طور سے عاشق اور محبوب میں سے کسی ایک کے یا دونوں کے مرنے کے بعد شائع ہوتے ہیں۔ نپولین جس کی ساری زندگی قتل و غارت گری میں گزری اور انسانی تاریخ میں جس کی اہمیت کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ مختلف زبانوں میں اس پر تیس ہزار سے زیادہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں، جب اپنی محبوبہ جوزفین کو خط لکھتا ہے تو اس کا جسم اور روح دونوں دو زانو ہو جاتے ہیں اور وہ ایک عام انسان نظر آنے لگتا ہے۔ نپولین کے وہ خطوط خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں جو اس نے اٹلی سے جوزفین کو لکھے تھے۔ اس وقت وہ کمانڈر کی حیثیت سے انسانی خون کی ہولی کھیل رہا تھا۔ اگر یہ خط گم ہو جاتے تو شاید ہمیں کبھی یہ اندازہ نہ ہوتا کہ نپولین جیسے ظالم اور جابر کے سینے میں بھی انسان کا دل تھا۔ وہ بھی کسی انسان کے قدموں پر سر رکھ کر اپنے پورے سماجی کردار کی نفی کر سکتا تھا۔ اور جنسِ لطیف کے لیے اس کے احساسات اور جذبات بھی ایسے ہی نازک اور لطیف تھے جیسے محبت کرنے والے سر پھرے دیوانوں کے ہوتے ہیں۔ اردو میں اس کی مثال علامہ شبلی ہیں۔ اگر عطیہ کے نام ان کے خطوط ضائع ہو گئے ہوتے تو ہمیں

کبھی یہ نہیں معلوم ہوتا کہ شبلی جیسے عالم اور "الفاروق" و "سیرت النبی" کے مصنف کے سینے میں ایک دھڑکتا ہوا دل بھی تھا۔ اُن کا ایک ایسا کردار بھی تھا جو اُن کے تمام سماجی کردار کے متضاد تھا۔ عطیہ یورپ سے واپس آتی ہیں تو شبلی انھیں لکھتے ہیں :

> " ایک بے ریا دل، ایک مخلص دل، وفا شعار دل کی طرف سے مراجعت پر مبارک باد قبول ہو۔ میری زندگی کا یہ سخت المناک واقعہ ہے کہ مبارک باد میرے لب کے بجائے زبانِ قلم ادا کرتی ہے . . . تہنیت کی غزل الگ مرسل ہے جس کے ساتھ ایک مختصر ہدیہ ہے۔ کیا تم ان دونوں حقیر چیزوں کو قبول کر سکتی ہو؟ شہنشاہ ایڈورڈ اور پریزیڈنٹ فرانس کا معزز مہمان اس قدر اپنے رتبے سے اتر نہیں سکتا، ہاں یہ صحیح ہے لیکن یاد رکھو، آفتاب ذرہ پر بھی چمکتا ہے۔ میں خود نہ آسکا لیکن عن قریب اپنی ایک تصویر جو تیس برس کی عمر کی ہے اتفاق سے ہاتھ آگئی ہے، بھیجتا ہوں۔ وہ میری قائم مقامی کرے گی۔"

عطیہ کو آفتاب اور خود کو ذرہ کہنے والا، یہ وہ شخص ہے جو اپنے عہد کی بعض اہم ترین ہستیوں کی عظمت سے منکر تھا۔

نپولین، ہنری ہشتم، مادام دوبیری، ایلزبیتھ بیرٹ، رابرٹ براؤننگ، کیٹس، شیلی، بائرن، وکٹر ہیوگو، گائی ڈی موپاساں، والٹیئر، جارج برنارڈ شا کے خطوط یورپ کے مکتوبی ادب میں کلاسک کا درجہ رکھتے ہیں۔ اردو میں واجد علی شاہ اور ان کی بیگمات کے بعض خطوط اور شبلی، صفیہ اختر اور سجاد ظہیر کے محبّت نامے قابلِ ذکر ہیں۔

خط شخصی چیز ہے۔ اس میں صرف ایک آواز ابھرتی ہے اور وہ ہے مکتوب نگار کی آواز، جو سو فی صدی ذاتی ہوتی ہے۔ یہ آواز مکتوب نگار کی دوسری آوازوں سے مختلف ہوتی ہے، اس آواز سے بھی، جو مکتوب نگار کی سماجی آواز ہوتی ہے اور اس آواز سے بھی جو اس کے تخلیقی فن میں گونجتی ہے۔ یہ آواز ایک ایسے انسان کی ہوتی ہے جو عظیم فنکار ہوتے ہوئے بھی ایک عام

انسان ہے، اور عام انسانوں کی طرح کھاتا پیتا، جاگتا اور سوتا ہے، جو خلوت کدے میں اپنے چہرے اور تہ در تہ شخصیت پر سے تمام پردے ہٹا دیتا ہے۔ اگر مکتوب نگار کو زندگی کا فہم و ادراک ہے، اگر نبضِ کائنات پر اس کی انگلیاں ہیں اور اس کی ژرف نگاہی انسانی نفسیات کے پیچ و خم سے واقف ہے تو اس کی آواز آفاقی اور غیر فانی بن جاتی ہے۔ اردو میں اس کی مثال صرف غالب ہیں۔

زندگی کی طرح خطوں کا دامن بھی بہت وسیع ہوتا ہے۔ ان میں وہ تمام رنگ ہوتے ہیں جو زندگی کی قوس قزح کو تشکیل دیتے ہیں۔ ان میں ہجر کی داستانیں بیان کی جاتی ہیں، وصل کے مژدے سُنائے جاتے ہیں، مصائب و آلام کا ذکر کیا جاتا ہے، ناکامیوں پر اظہارِ غم ہوتا ہے، کامیابیوں پر اظہارِ مسرت ہوتا ہے، مبارک باد دی جاتی ہے، تعزیت کی جاتی ہے، نفرت و محبت، خلوص و ریا اور مہر و وفا غرض ہر طرح کے جذبات کی ترجمانی کی جاتی ہے۔

خطوط ایسے بھی ہوتے ہیں جو مکتوب نگار اپنی ذاتی غرض سے لکھتا ہے اور ایسے بھی جن سے دوسروں کی بھلائی مقصود ہوتی ہے۔ خطوط میں کبھی انسان غیظ و غضب میں بھرا ہوا شیر نظر آتا ہے اور کبھی اس کا مسکراتا ہوا شگفتہ چہرہ دکھائی دیتا ہے۔ خطوط ایسے بھی ہوتے ہیں جو قلم برداشتہ لکھے جاتے ہیں اور ایسے بھی جن میں غور و فکر کے سو سو بناؤ ہوتے ہیں۔ خطوط وہ بھی ہوتے ہیں جو صرف شائع کرنے کے لیے لکھے جاتے ہیں اور وہ بھی خطوط ہیں جنھیں شائع کرنے کی مکتوب نگار کبھی اجازت نہیں دیتا۔ خطوط کئی کئی صفحے کے بھی ہوتے ہیں اور چند لفظوں کے بھی۔

خط کاغذ کے ٹکڑوں پر بکھرے ہوئے محض بے جان الفاظ نہیں بلکہ زندہ شے ہیں۔ یہ بولتے ہیں۔ ایک دھڑکتے دل کی صدائیں دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔ مکتوب نگار کا مخاطب کوئی ہو اور وہ کسی بھی عہد کا انسان ہو، وہ اگر اس فن میں کامیاب ہے تو یہ خط زمین پر رہنے والے ہر عہد کے انسان کے لیے ہیں اور جب بھی یہ خط کوئی پڑھے گا اُسے محسوس ہوگا کہ وہ اسی زمانے میں پہنچ گیا ہے اور مکتوب نگار کا مخاطب وہی ہے۔ ۱۸۵۷ء میں دلّی اجڑنے کے واقعات

تاریخی کتابوں میں بھی درج ہیں اور غالبؔ نے اپنے خطوں میں بھی لکھے ہیں لیکن خطوطِ غالبؔ پڑھتے ہوئے ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے دلّی سو سال قبل نہیں آج اجڑ رہی ہے اور غالبؔ کے مخاطب میر مہدی مجروحؔ نہیں، ہم ہیں۔

غالبؔ نے کئی بار مکتوب نگاری کو بات چیت کہا ہے۔ بالکل یہی بات غالبؔ سے کئی سو سال قبل سسرو نے کہی تھی۔ ولیم کوپر نے یہی بات ذرا گھما کر کہی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ: "اپنے خیالات کو دوسروں تک پہنچانے میں انسان کو ہمیشہ خوشی ہوتی ہے۔ ترسیل کا ذریعہ زبان ہو یا خط ان دونوں کی جگہ کوئی اور شے نہیں لے سکتی۔ اس کا مطلب ہے جو شخص بھی اس فن کے رموز سے واقف ہوتا ہے وہ اس راز کو سمجھ لیتا ہے کہ مکتوب نگاری گفتگو کا نعم البدل ہے جو کاغذ اور سیاہی کی ایجاد نے ہم کو دیا ہے۔" لیکن خط اور گفتگو ایک دوسرے کا سو فی صدی بدل نہیں۔ خط گفتگو سے زیادہ مدلل ہوتا ہے، زیادہ واضح اور زیادہ بلیغ ہوتا ہے۔ اس میں بات سوچ سمجھ کر کی جاتی ہے۔

ممکن ہے مکتوب نگار کے پاس ایسی کوئی خبر یا بات نہ ہو جو وہ مکتوب الیہ تک پہچانا چاہتا ہو، اور اس کا واسطہ ایسے شخص سے ہو جس سے کچھ نہ کچھ باتیں ضرور کرنی ہوں۔ یا بہ قول غالبؔ:

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمھارے نام کے

ایسی صورت میں خبروں اور اہم باتوں کے علاوہ بھی بہت سی باتیں کہنے کی ہوتی ہیں۔ غالبؔ کا ایک خط ملاحظہ ہو۔ اس میں انھیں صرف یہ کہنا ہے "یہ کیسے ممکن ہے تمھارا خط آئے اور میں جواب نہ دوں۔" بس اتنی سی بات غالبؔ کی زبانی سنیے۔ منشی سخاوت حسین کو لکھتے ہیں:

"سُبحانَ اللہ! آپ کے خط کا جواب نہ لکھوں، اپنے کو نفرین کروں اگر شتاب نہ لکھوں۔ اس وقت ڈاک کے ہرکارے نے تمھارا خط دیا۔ ادھر پڑھا اُدھر جواب لکھنے کا قصد کیا۔ میں ایک شخص گوشہ نشین، فلک زدہ، اندوہ گیں،

نہ اہلِ دنیا نہ اہلِ دیں۔ مجھ جیسے نکمے آدمی کا جو کوئی مشتاق ہو اُس کے خط کا جواب لکھنا کیوں مجھ پر شاق ہو۔ ظاہراً تم خود مجمعِ حسنِ اخلاق ہو ورنہ کیوں تم کو میرا اس قدر اشتیاق ہو۔ یاں، ایک بری بھلی شاعری، اُس کا حال یہ کہ آگے جو کچھ کہا سو کہا، اب شاعر بھی نہیں رہا۔ بہ ہر حال، تمھاری فقیر نوازی کا شکر گزار اور طالب دیدار ہوں۔"

۴ فروری ۱۸۶۱ء

دیکھا آپ نے؟ کچھ بھی نہ کہا اور سب کچھ کہہ دیا۔ غالب کے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا۔ لیکن اندازِ بیان سے بات کو اتنا خوبصورت بنا دیا کہ ممکن نہیں مکتوب الیہ خوش نہ ہوا ہو۔

اچھے مکتوب نگار کی ایک خاص پہچان یہ بھی ہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی چیزوں میں بھی حُسن اور خوبصورتی تلاش کر لیتا ہو اور زندگی میں ہونے والے معمولی اور بہ ظاہر ناقابلِ توجہ واقعات کی اہمیت سے بخوبی واقف ہو۔

اعلیٰ درجہ کے خطوط کی اہمیت یہ ہے کہ وہ خواہ کتنے ہی نجی کیوں نہ ہوں اور موضوع کے اعتبار سے کتنے ہی محدود کیوں نہ ہوں اُن میں مکتوب نگار کے قلم نے ایسی گل افشانیاں کی ہوں۔ اور مکتوب میں ایسا تنوع، رنگارنگی و بوقلمی اور دلچسپی پیدا کی ہو کہ مکتوب نگار کی داستان ہر پڑھنے والے کی داستان بن گئی ہو۔ جو خصوصیات کسی فن پارے کو ادبِ عالیہ میں جگہ دیتی ہیں، ٹھیک وہی خصوصیات اعلیٰ مکاتیب کے لیے بھی ضروری ہیں، یعنی ہر عہد کے لوگوں کے ذوق کی تشفی کا سامان ان میں موجود ہوتا ہے۔ ادبِ عالیہ زمان و مکان کی قیود سے آزاد ہو کر ہر عہد کے انسان کا تعلق اپنے تخلیقی دور سے قائم کرتا ہے۔ یونان کے عہدِ قدیم سے ہمارا تعلق ہومر کی ایلیڈ اور اوڈیسی کے واسطے سے ہے۔ قدیم ہندوستان سے ہماری جذباتی وابستگی رامائن اور مہابھارت کی وجہ سے ہے۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی تصویر ہمارے ذہنوں میں وہ ہے جو غالب نے پیش کی ہے۔

خطوں کی اہمیت صرف ان کے موضوعات ہی کی وجہ سے نہیں ہوتی بلکہ اُن کے

اسلوب کی بھی اہمیت ہے۔ رجب علی بیگ سرور اور غلام غوث خاں بے خبر کے خطوط میں بھی تنوعِ مضامین ہے۔ ان میں بھی اپنے عہد کی تصویریں ملتی ہیں۔ لیکن یہی تصویریں سرور اور بے خبر کے مکاتیب میں مدھم اور غیر دلکش ہیں، غالب کے ہاں جیتی جاگتی اور دلاویز نظر آتی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ غالب کے کمالِ فن نے ان میں زندگی ڈالی ہے۔ خطوطِ غالب کی زبان اور اسلوب نہ صرف اردو کے اعلیٰ ترین مکتوباتی ادب کا نمونہ ہیں بلکہ پوری اردو نثر کا قابلِ فخر سرمایہ ہیں۔ اسی لیے ممکن نہیں کہ اردو نثر کی کوئی تاریخ لکھی جائے اور اس میں خطوطِ غالب کا ذکر نہ ہو۔

سوانح نگاری کے بہترین مآخذ خطوط ہوتے ہیں فنکار کے خاندانی حالات اس کی زندگی کے بیشتر واقعات، اُس کے عقائد و نظریات، اس کی سیرت و شخصیت کا پورا علم ان ہی خطوط سے ہوتا ہے۔ فنکار اپنے پیش رو فنکاروں کے بارے میں کیا رائے رکھتا ہے، اپنے ہم عصروں کو کس نظر سے دیکھتا ہے، اپنے فن اور خود اپنی ذات کے بارے میں اس کی کیا رائے ہے، یہ سب بہت واضح انداز میں تو فنکار کے خطوط میں، اور اکثر ذرا مبہم آپ بیتیوں اور روزنامچوں میں ملے گا۔

خطوط کی ادبی اہمیت کسی طرح بھی تخلیقی کارناموں سے کم نہیں جس طرح ادب کی مختلف اصنافِ سخن کا مطالعہ دلچسپی سے کیا جاتا ہے۔ اس طرح خطوط بھی دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں، بلکہ بعض حضرات کا تو یہ خیال ہے کہ اختصار کی وجہ سے اس صنف کو نثر کی دوسری اصناف پر فوقیت حاصل ہے اور لوگ ناول اور افسانے کے مقابلے میں خطوط کا مطالعہ زیادہ پسند کرتے ہیں۔

بعض لوگ محض اپنے خطوط کی وجہ سے زندہ ہیں۔ بیگماتِ اودھ کے خطوط اگرچہ دوسرے اور تیسرے درجہ کے ہیں اور اکثر خطوط دوسرے لوگوں سے لکھوائے گئے ہیں لیکن ان بیگمات کا نام اردو ادب میں صرف ان خطوط کی وجہ سے زندہ رہے گا۔ اگر غلام غوث خاں بے خبر اردو میں خط نہ لکھتے تو تاریخِ ادبِ اردو میں اُن کا نام صرف غالب کے مکتوب الیہ کی حیثیت ہی سے

آتا۔ غالب کی مقبولیت کا راز اُن کے اردو خطوط میں بھی ہے۔ حالی نے ذرا مبالغے سے کام لیتے ہوئے یادگار غالب میں لکھا ہے :

> " جہاں تک دیکھا جاتا ہے مرزا کی عام شہرت ہندوستان میں جس قدر اُن کی اردو نثر کی اشاعت سے ہوئی ہے ویسی نظمِ اردو اور نظمِ فارسی اور نثرِ فارسی سے نہیں ہوئی۔"

میتھیو آرنلڈ نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ: "کارلائیل ان مضمونوں اور تاریخوں کے بل پر انگریزی ادب میں زندہ نہیں رہے گا جن سے پوری الماری بھری ہوئی ہے بلکہ وہ بیش قیمت مراسلت جو اس کے اور ایمرسن کے درمیان ہوئی تھی، اُس کے سر پر بقائے دوام کا تاج رکھے گی۔"

مکتوب نگاری کا کوئی اصول اور ضابطہ مرتب نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اگر کسی مکتوب کے لکھے جانے کا کوئی محرک نہ ہو یا وہ کسی خط کے جواب میں نہ لکھا گیا ہو تو اسے مکتوب کہنا بہت مشکل ہے۔ ہر اس تحریر کو جو خط کی فارم میں لکھی گئی ہو مکتوباتی ادب میں جگہ دینا مناسب نہیں، کیوں کہ بعض اوقات اس فارم میں انشا پردازی کے جوہر بھی دکھائے جاتے ہیں یا اُن کی تحریر کا محرک کوئی اور مقصد ہوتا ہے۔ اردو میں ابوالکلام آزاد کے خطوط، قاضی عبدالغفار کے "لیلیٰ کے خطوط" کا محرک وہ نہیں تھا جو خط لکھنے کا ہوتا ہے۔ آزاد کے خطوط اچھے انشائیے ہیں، اسی طرح لیلیٰ کے خطوط دلچسپ ناول کی تکمیل کرتے ہیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو کی (DISCOVERY oF INDIA) تاریخ کی الماری میں رکھی جائے گی۔ جانسن کے بعض خطوط جو اس نے چیسٹر فیلڈ کے نام لکھے ہیں، مولانا آزاد کے خطوط کے ساتھ رکھے جائیں گے۔

مکاتیب کا ادبی مرتبہ کچھ بھی ہو، وہ بُرے ہوں یا اچھے، عظیم آدمی کے ہوں یا معمولی انسان کے، ادیب اور شاعر کے ہوں یا سیاست داں کے، ان میں ادبی خوبیاں ہوں یا نہیں، لیکن فنِ تاریخ نویسی کے نقطۂ نظر سے اُن کی اہمیت ہمیشہ باقی رہے گی۔ کوئی مورخ اس عہد میں

لکھے گئے خط کو نظر انداز نہیں کر سکتا، جس عہد کی وہ سیاسی اور سماجی تاریخ مرتب کر رہا ہے۔ ذاتی خطوط اور صاحبِ اقتدار کے کاروباری خطوط سے انتہائی اہم مواد حاصل کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ خطوں کے ذریعے ہی ہمیں یہ بھی پتا چلتا ہے کہ وہ واقعات جو تاریخی کتابوں کی زینت ہیں، کبھی زندہ حقیقت بھی تھے۔ تاریخی واقعات معلوم کرنے کے ماخذ اور بھی ہیں لیکن یہ جاننے کے لیے کہ ان لوگوں کا ردِ عمل کیا تھا جو ان واقعات کے ذمہ دار تھے اور وہ لوگ کیا سوچ رہے تھے جن پر ان واقعات کا اثر ہوا تھا، ہمیں ذاتی خطوں، روزنامچوں اور آپ بیتیوں کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں کا ایک حساس ذہن پر کیا اثر ہوا، دلّی کی تباہی اور بربادی نے ایک شاعر کے قلب و ذہن کو کس طرح متاثر کیا، اگر یہ معلوم کرنا ہے تو کوئی تاریخی کتاب آپ کا ساتھ نہیں دے گی۔ البتہ میر تقی میر کی "ذکرِ میر" میں یہ تاثرات جگہ جگہ بکھرے ہوئے ملیں گے۔ مرزا مظہر اور شاہ ولی اللہ کے خطوط میں بادشاہوں امیروں اور رئیسوں کی بالتفصیل داستانیں تو نہیں ملیں گی لیکن ان کے پیدا کیے ہوئے حالات پر اس عہد کے ذہین انسان کے تاثرات ضرور ملیں گے۔ خطوں اور روزنامچوں میں فنکار جس طرح چاہے حکایتِ خوں چکاں لکھے، اس میں ہاتھ قلم ہونے کا خطرہ نہیں ہے۔

مکتوب نگاری کا فن آسان ترین فن ہے۔ اس کے لیے باقاعدہ کسبِ فن کی ضرورت نہیں، کسی استاد سے صلاح مشورہ بھی ضروری نہیں۔ موٹی موٹی کتابوں کی ضرورت نہیں۔ اس کے لیے یہ جاننے کی بھی ضرورت نہیں کہ آپ سے پہلے اساتذہ اس فن میں کیا کیا کمالات دکھا گئے ہیں پھر بھی خط کے لیے قلم اور دوات سے زیادہ اور کچھ چیزوں کی ضرورت ہے۔

غزل کی طرح خط لکھنا بہت آسان ہے، لیکن ایک اچھا خط یا اچھی غزل لکھنا بہت مشکل ہے۔ جس طرح یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص کا لکھا ہوا خط اہم ہو اسی طرح یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر عظیم مکتوب نگار کے تمام خطوط ایک ہی درجے کے ہوں۔ آج ہر روز ڈاک سے کروڑوں بلکہ اربوں خط ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے ہیں۔ ان میں کتنے خط ہیں جو مکاتیبی ادب میں

جگہ پا سکیں گے۔ شاید مہینوں بلکہ برسوں میں دو یا تین۔ اس بات کو ایچ۔ ڈی۔ تھورو نے ذرا مختلف انداز میں یوں کہا ہے: "جہاں تک خطوں کا تعلق ہے پوسٹ آفس کے بغیر بھی میرا کام چل سکتا ہے، کیوں کہ ساری زندگی میں مجھے صرف ایک یا دو خط ایسے ملے ہیں کہ جنھیں پڑھ کر محسوس ہوا کہ ڈاک کے پیسے وصول ہو گئے۔"

مکتوب نگاری کی تاریخ اتنی قدیم ہے جتنی فنِ تحریر کی۔ کاغذ ایجاد ہونے سے پہلے جب انسان درخت کے پتوں، دھات کی پلیٹوں، چمڑوں اور مٹی کی لوحوں پر لکھتا تھا تب بھی خط لکھے جاتے تھے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجے جاتے تھے۔ تقریباً تین ہزار سال قبل مغربی ایشیا کے حکمرانوں کی خط و کتابت مصر کے فراعنہ سے تھی۔ ۱۸۸۷ء میں کمرنا کے مقام پر کھدائی کے دوران تین سو مٹی کی لوحیں نکلی تھیں جن پر فراعنہ کے نام خطوط کندہ تھے۔ یونان کے رزمیہ نگار ہومر اور مورخ ہیروڈوٹس کی تحریروں سے پتا چلتا ہے کہ قدیم یونان میں خط و کتابت کا رواج تھا۔ انسانی تاریخ میں یہ اعزاز اہلِ روم کی قسمت میں لکھا تھا کہ وہ مکتوب نگاری کو باقاعدہ فن بنائیں ادبی مؤرخ اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ اس دور میں روم کے قابل اور پڑھے لکھے لوگ بہت دور واقع صوبوں کی گورنری کے لیے بھیجے جاتے تھے۔ اپنے صوبے کے حالات بتانے اور روم کے حالات جاننے کے لیے خط و کتابت ناگزیر تھی۔ سسرو اسی عہد کا مکتوب نگار ہے۔

جب اسلام وجود میں آیا تو عرب میں یہ فن غیر ترقی یافتہ صورت میں موجود تھا۔ خط لکھنا ایک پیشہ تھا۔ اس پیشے کے اختیار کرنے والے کو کاتب کہا جاتا تھا۔ آنحضرتؐ کے عہد میں اس فن نے خاطر خواہ ترقی کی۔ خود آنحضرتؐ کے خطوط موجود ہیں۔ مسلمانوں میں خط و کتابت کی ترقی کے تقریباً وہی اسباب ہیں جو روم میں تھے، یعنی سیاسی ضرورت۔ حضرت عمرؓ کو یہ شرف حاصل ہے کہ انھوں نے خط و کتابت کی اہمیت کے پیشِ نظر پہلی بار دارالانشا قائم کیا۔ ایک مرکزی محکمہ مدینہ میں تھا، باقی تمام صوبوں میں سرکاری سطح پر ایسے محکمے قائم

کیے گئے۔ دار الانشا صرف لائق اور قابل لوگوں کے سُپرد ہوتا۔ حضرت عمر کا اصرار تھا کہ صوبہ دار اپنے اپنے صوبوں کے حالات اس طرح بیان کریں کہ پوری تصویر سامنے آجائے۔ چنانچہ صوبہ دار ہمیشہ اس کا خیال رکھتے۔ ابن العاص نے مصر کی فتح پر حضرت عمر کو جو خط لکھا تھا وہ اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ اس عہد میں خط و کتابت صرف کاروبار تک ہی محدود نہیں تھی، بلکہ بعض دوسری خصوصیات کی وجہ سے انہیں دنیا کے مکتوباتی ادب میں اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ اس خط کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

> امیر المومنین کا مکتوب گرامی، خدا انہیں تا دیر سلامت رکھے، ورود فرما ہوا جس میں مجھ سے مصر کے متعلق تفصیلات طلب کی گئی ہیں۔ امیر المومنین ! مصر ایک نہایت زرخیز اور سرسبز و شاداب جگہ ہے۔ اس کا طول ایک مہینے اور عرض دس مہینے کی مسافت ہے۔ اسے ایک خاکی رنگ کے پہاڑ اور خاکستری رنگ کے ایک ریگ زار نے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے۔ اس کے وسط میں دریائے نیل بہتا ہے۔ جس کا خرام سحرِ مبارک ہے اور روانی شبِ مسعود۔ اس کا بہاؤ کبھی تیز ہوتا ہے اور کبھی سُست، جیسے آفتاب و ماہتاب کی رفتار۔ مخصوص اوقات میں اس کی لہریں اتنی سفید اور شیریں ہوجاتی ہیں کہ دودھ کی دھاریں معلوم ہونے لگتی ہیں اور مکھیاں ان پر بھنبھناتی ہیں۔ زمین کے چشمے اور تیز رو نالے جب اس میں طغیانی پیدا کر دیتے ہیں تو وہ چنگھاڑنے لگتا ہے اور جب اس کی موجیں بلند ہوکر کناروں کو پھاند جاتی ہیں تو چھوٹی چھوٹی کشتیوں اور ہلکی ہلکی ڈونگیوں کے سوا ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا غیر ممکن ہوجاتا ہے۔ اور وہ کشتیاں، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بادلوں میں جنھیں ڈھلتے دن کی چاندنی کھیے، تیر رہی ہیں۔ جب اس کی طغیانی شباب کو پہنچ جاتی ہے تو وہ جس شان سے چڑھا تھا اُسی شان سے اُلٹے پاؤں اتر جاتا ہے۔ اس وقت

> لوگ نکلتے ہیں زمین گود کر اس میں دانہ ڈالتے ہیں اور پروردگار سے اس کے پھلنے اور پھولنے کے اُمیدوار ہوتے ہیں۔ جو لوگ محنت نہیں کرتے وہ بھی بغیر کسی جدوجہد کے اس سے پھل پاتے ہیں۔ جب دانہ پھوٹتا ہے تو نمی اسے پانی پلاتی ہے اور زمین اسے غذا بہم پہنچاتی ہے۔ اور اس وقت یا امیرالمومنین، مصر کی زمین رنگ برنگ کے چولے بدلتی ہے۔ ابھی چمکتا موتی ہے تو ابھی عنبر اشہب، ابھی زمرد سبز ہے تو ابھی گندمی چہرہ۔ پاک ہے وہ خالقِ کائنات جس نے مصر کو ان نعمتوں سے نوازا اور رونق و آبادی سے امتیاز بخشا۔ البتہ یہاں کسی بڑے آدمی کے متعلق معمولی آدمی کی بات نہیں مانی جاتی، اور یہاں کا خراج وقتِ معینہ سے پہلے وصول نہیں ہو سکتا۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ یہاں کی آمدنی کا تہائی حصہ نہروں اور پلوں کے کام میں صرف ہوتا رہے۔ جب یہاں کے حالات استحکام پذیر ہو جائیں گے تو آمدنی بڑھ جائے گی۔ آغاز و انجام میں خدائے بزرگ و برتر ہی توفیق عطا کرنے والا ہے۔

حضرت عمرؓ سے پہلے حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں حضرت عثمان بن عفان اور حضرت زید بن ثابت کاتب کے فرائض انجام دیتے تھے۔ حضرت عمرؓ کے کاتب حضرت زید بن ثابت اور حضرت عبداللہ بن اُبَیّ بن خلف تھے۔ حضرت عثمانؓ یہ کام مروان بن حکم سے لیتے تھے۔ حضرت علیؓ کے عہد میں حضرت عبد بن اُبَیّ رافع اور حضرت سعید بن نجران الہمدانی یہ کام کرتے تھے۔

اسلامی حکومتوں میں بنو امیہ اور بنی عباس کے عہد میں اس فن نے خوب ترقی کی اور اس محکمہ کا نام "دیوان الانشا" پڑ گیا۔ مامون الرشید کے زمانے سے ہی فارسی زبان کو اچھی خاصی اہمیت حاصل ہو گئی تھی۔ عجمیوں نے جہاں جہاں اپنی حکومتیں قائم کیں وہاں سے عربی کو نکال دیا، جس کا اثر فطری طور پر خط و کتابت پر بھی پڑا۔ یہاں سے فارسی انشا کی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ جب ہلاکو خان نے دولتِ عباسیہ کا خاتمہ کر دیا تو عربی کا رہا سہا وقار بھی ختم ہو گیا اور

فارسی انشا کو فروغ پانے کا موقع مل گیا۔

خط لکھنے والوں کو پہلے کاتب کہا جاتا تھا۔ لیکن اب فارسی زبان کے زیرِ اثر انھیں دوات دار، دبیر اور منشی کہا جانے لگا۔ مسلمانوں میں وزارت کا مستقل عہدہ قائم ہونے تک منشیوں کو بادشاہ سے سب سے زیادہ تقرب حاصل تھا۔

فنِ مکتوب نگاری پر فارسی میں بہت کتابیں لکھی گئیں۔ خطوط کے مجموعے مرتب ہوئے۔ رشید الدین فضل اللہ کے مکاتیب کا مجموعہ منشآتِ رشیدی کے نام سے مرتب ہوا۔ مولانا عبدالرحمٰن جامی کے خطوط "رقعاتِ جامی" مکاتیبی ادب کا اہم سرمایہ ہیں۔

انگریزی کے مکتوب نگاروں میں سب سے پہلے ولیم کوپر اور چارلس لیمب کے نام آتے ہیں۔ یہ دونوں زندگی کے ہنگاموں سے دور تھے لیکن ان دونوں کو خط لکھنے کا شوق تھا۔ روزمرہ زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات سے انھوں نے اپنے خطوط کا مواد حاصل کیا ہے۔ عورتوں میں تھومس کارلائل کی بیوی جین کارلائل اور فرانس کی مادام ڈی سیوین نے غیر فانی خطوط لکھے ہیں۔

شگفتنِ گل ہاے ناز

کسی بھی فن کار کی تخلیقی قوتیں عام طور پر پچاس برس کی عمر کے بعد سلب ہونی شروع ہو جاتی ہیں۔ اس کے بعد یہ تو ممکن ہے کہ فنی سطح پر ہیئت اور اسلوب میں کچھ اور زیادہ پختگی اور نکھار پیدا ہو جائے لیکن جہاں تک اُس کے تخلیقی عمل کا تعلق ہے، جس میں فکر، احساس اور جذبہ شامل ہے، فنکار زیادہ تر خود کو دہرانے لگتا ہے۔ اس کی اصل وجہ کیا ہے، اس پر تو ماہرینِ نفسیات ہی بہتر طریقے سے روشنی ڈال سکتے ہیں لیکن عام خیال یہی ہے کہ پچاس کے بعد چوں کہ فنکار کے قویٰ مضمحل ہونے لگتے ہیں، اس لیے جذبے اور احساس میں وہ شدت باقی نہیں رہتی اور فکر کے سوتے خشک ہونے لگتے ہیں۔ تاہم اس عمر میں عقلیت اور قوتِ استدلال بڑھ جاتی ہے۔ فکر و خیال میں منطقی پہلو زیادہ اجاگر ہونے لگتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فنکار جوش اور ولولے سے محروم ہو جاتا ہے۔ غالبؔ نے اپنی اس کیفیت کا اظہار نظم اور نثر دونوں میں کیا ہے:

سخن میں خامۂ غالبؔ کی آتش افشانی
یقیں ہے ہم کو بھی، لیکن اب اُس میں دم کیا ہے

یہی بات نثری پیرائے میں ایک خط میں غالبؔ نے ان الفاظ میں کہی ہے:

> ”صناعت شعر اعضا و جوارح کا کام نہیں، دل چاہیے، دماغ چاہیے، ذوق چاہیے، امنگ چاہیے۔ یہ سامان کہاں سے لاؤں جو شعر کہوں۔ چونسٹھ برس کی عمر، ولولۂ شباب کہاں؟ رعایتِ فن، اس کے اسباب کہاں اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔“

بنام چودھری عبدالغفور سرور

شاعری اور خاص طور سے غزل کا حسنِ ایجاز و اختصار، رمز و کنایہ، اشاریت، اجمال اور آہنگ میں ہے۔ شاعری عام طور سے عقلیت اور منطقی استدلال کی متحمل نہیں ہوتی، جب کہ نثر مطالبہ کرتی ہے، عقلیت کا فکری اور منطقی استدلال کا اور تفصیل و جزئیات اور قطعیت اور معروضیت کا۔

شاعری آرایشِ گفتار کے بغیر ممکن نہیں، اور آرایشِ گفتار کے لیے جس یک سوئی، جوش و ولولہ، ذہنی و جسمانی طاقت و صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے، غالب عمر کے آخری حصے میں اُس سے محروم ہو چکے تھے۔ اسی لیے وہ شاعری اور خاص طور سے فارسی شاعری اور فارسی نثر نگاری سے دامن بچانے لگے تھے۔ حال آں کہ غالب کی زندگی کا بڑا حصہ وہ ہے، جس میں ذہنی پریشانیوں نے بھی انھیں شعر گوئی سے باز رکھا۔

غالب کے قویٰ مضمحل ضرور ہو چکے تھے، لیکن اُن کے دماغ کی آگ روشن تھی بلکہ کائنات کے شعور اور ذات کی آگہی نے اس آگ کو روشن تر کر دیا تھا۔ تجربوں اور مشاہدوں نے فکر میں زیادہ پختگی و بالیدگی، احساس میں زیادہ گہرائی اور گیرائی اور جذبات میں ٹھہراؤ پیدا کر دیا تھا۔

غالب نے اردو میں خطوط ضرورتاً لکھنا شروع کیے تھے، لیکن خطوط نویسی میں اظہار کے امکانات نے بہت جلد ان کے اندر چھپے ہوئے اس فنکار کو جگا دیا جو ردیف و قافیے کی مشقت سے تھک کر سو گیا تھا۔ پچاس برس کے بعد فنکار کے ذہن، جذبے

اور فکر میں ہونے والی وہ تبدیلیاں جو تخلیقی عمل کے راستے میں رکاوٹ بن جاتی ہیں، نثر کے اس نئے وسیع اور کشادہ میدان میں غالب کے لیے بہت بڑا اثاثہ ثابت ہوئیں۔

غالب کی نثر نگاری کا آغاز فارسی کی "پنج آہنگ" سے ہوا۔ یہ کتاب ۱۸۲۵ء میں مرتب ہوئی تھی لیکن اس کے شائع ہونے کی نوبت ۱۸۴۹ء میں آئی۔ "پنج آہنگ" کے ابتدائی دو آہنگوں میں سے غالب نے پہلے آہنگ میں القاب و آداب لکھنے کے طریقوں سے بحث کی اور دوسرے آہنگ میں بعض مصادر، مصطلحات اور فارسی الفاظ کے معنی وغیرہ بیان کیے ہیں۔ باقی تین آہنگوں میں غالب کے اشعار، تقاریظ اور عباراتِ متفرقہ اور فارسی خطوط کا انتخاب شامل ہیں۔ غالب کی دوسری فارسی کتاب "مہرِ نیم روز" ہے۔ یہ خاندانِ تیموریہ کی تاریخ کی پہلی جلد ہے۔ دوسری جلد مکمل کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اس کا اردو مسودہ غالب کو ملتا تھا اور غالب اس کا فارسی میں ترجمہ کر دیا کرتے تھے۔ ۱۸۵۷ء تک غالب کا نثری سرمایہ فارسی میں یہ دو کتابیں اور خاصی تعداد میں فارسی اور اردو خطوط تھا۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب کی وجہ سے غالب تنہائی اور گوشہ گیری کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے۔ کہیں سے مولوی محمد حسین تبریزی کی مشہور لغت "برہانِ قاطع" اور "دساتیر" ہاتھ آگئیں۔ زندگی کے تلخ حقائق سے فرار حاصل کرنے اور ذہنی اعتبار سے خود کو مصروف رکھنے کے لیے غالب نے خود کو ان کتابوں کے مطالعے میں غرق کر دیا۔ "برہانِ قاطع" کے مطالعے کے دوران انھیں محمد حسین تبریزی سے اختلاف ہوا۔ ایک دلچسپ مشغلہ ہاتھ آگیا۔ انھوں نے حاشیے پر اختلافات درج کر دیے۔ اس طرح گویا غالب کے علمی کام کا آغاز ہوا۔ ابھی غالب "برہانِ قاطع" کا مطالعہ کر ہی رہے تھے کہ انھیں روزنامچے کے انداز میں ایک کتاب "دستنبو" لکھنے کا خیال آیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ "دستنبو" لکھنے کے لیے انھوں نے برہانِ قاطع کا مطالعہ شروع کیا ہو۔ الفاظ کی اصل اور اُن کے معنی پر غور کرتے ہوئے غالب کو خیال آیا کہ "دستنبو" ایسی فارسی میں لکھی جائے جس میں ایک لفظ بھی عربی کا نہ آئے۔

"دستنبو" کی تالیف کا اصل مقصد تو یہ تھا کہ غالب برطانوی حکومت پر اپنی بے گناہی ثابت کریں لیکن انھوں نے سوچا کہ کیوں نہ لگے ہاتھوں انگریزوں پر اپنی فارسی دانی کا سکہ بھی بٹھا دیا جائے۔ بہ ہر حال، بے کاری میں ایک اور مشغلہ ہاتھ آیا۔ کچھ وقت "دستنبو" کے لکھنے میں لگا اور کچھ اس کی طباعت کے اہتمام میں۔ کچھ عرصے بعد "برہانِ قاطع" پر اعتراضات ترتیب دے کر "قاطعِ برہان" کے نام سے شائع کیے۔ کتاب کا چھپنا تھا کہ خود غالب پر اعتراضات کی بوچھاڑ ہوگئی۔ بعض اہلِ علم "برچھیاں اور بھالے لے کر غالب کی طرف دوڑے۔ پھر تو ایک مستقل مشغلہ ہاتھ آگیا۔ اس معرکے میں غالب نے "نامۂ غالب" اور "تیغِ تیز" دو رسالے اپنے نام سے شائع کیے اور دو رسالے "لطائفِ غیبی" میاں داد خاں سیاح کے نام سے اور "سوالاتِ عبدالکریم" عبدالکریم کے نام سے شائع کیے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ غالب نے یہ علمی کام زندگی کے اس حصے میں کیا، جب انھیں سب سے زیادہ ذہنی پریشانیوں کا سامنا تھا۔ صحت جواب دے چکی تھی، اور بہ قول اُن کے بے "دست و پا" ہو چکے تھے۔ یہ سب وقت گزارنے کے مشغلے تھے۔ اس سلسلے کا سب سے اہم مشغلہ تھا خطوط نویسی۔ علمی مشاغل میں مصروف رہ کر غالب کچھ دیر کے لیے خود کو بھول جانے میں کامیاب ہو جاتے تھے لیکن خطوط کے سہارے تو انھوں نے ایک بزم سجا رکھی تھی۔ جس میں اُن کے عزیز، دوست، معتقد، مداح، ممدوح اور شاگرد سب ہی شریک تھے۔ اس بزم کی فضا اکثر شگفتہ اور تصنع و تکلف سے پاک رہتی۔ غالب اِن اہلِ بزم کو اپنے دکھ درد میں شریک کرتے۔ اپنی ناکامیوں کا ماتم کرتے اور کامیابیوں پر خوشی اور مسرت کا اظہار کرتے۔ یہی نہیں بلکہ غالب اس بزم میں شریک ہونے والوں کی خوشی اور غم میں خود بھی برابر کے شریک رہتے۔

غالب کے خطوط کی نثر میں صرف منطقی استدلال ہی نہیں بلکہ اس میں ٹھہرا ہوا جذبہ اور ایک منفرد طرزِ فکر و احساس ہے جو موجِ تہ نشیں کی طرح جاری و ساری نظر آتا ہے۔ ان

خطوط میں غالبؔ کی خلّاقانہ صلاحیت، اور نثر کے ہم آہنگ متوازن شاعرانہ صناعی بھرپور امکانات کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ ان میں تجربات اور احساسات کی رنگارنگی ہے۔ اجتماعی تجربے بھی ہیں اور ذاتی وارداتیں بھی۔ ایک فرد کی آواز بھی ہے اور پورے عہد کی گونج بھی۔ خطوطِ غالبؔ اُس عہد کے ہندوستان کی تاریخ میں رونما ہونے والی اہم ترین سیاسی، سماجی اور تہذیبی، فکری اور جذباتی تبدیلیوں کا ردِّعمل بھی ہیں اور ایک فرد کی مایوسیوں شکستوں اور ناکامیوں کی داستان بھی۔ غرض انسان کی روزمرہ زندگی اور اس کے مسائل کی گونج بھرپور طریقے پر اردو نثر میں پہلی بار خطوطِ غالبؔ ہی میں سُنائی دیتی ہے۔

وہ غالبؔ، جو شاعری میں پوری کائنات سے مبارزہ طلب ہے اور ہر بڑی طاقت سے نبرد آزما ہے، خطوط میں اپنی معمولی ضرورتوں اور احتیاجوں کے حصار میں گرفتار نظر آتا ہے، وہ اہلِ ثروت کے سامنے کاسۂ گدائی لیے کھڑا ہے۔ نواب کلب علی خاں کے دربار میں گڑگڑا کر دُعائیں دے رہا ہے۔ کبھی کہتا ہے "خدا حضرت کو سلامت رکھے، مجھ سے اپاہج نکمّے کو بہ عوضِ خدمت تنخواہ دیتے ہو"۔ اور کبھی عرض کرتا ہے "مختصر یہ کہ اب میری جان اور آبرو آپ کے ہاتھ ہے مگر حضور، جو عطا فرمانا ہے جلد ارشاد ہو:

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آتے، درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

شاعری میں خود بینی و خود داری کا یہ عظیم تصور پیش کرنے والا انسان انگریزوں کے ہندوستانی منشی کی خوشامد میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتا ہے۔ غلام غوث خاں بےخبر دوسرے بلکہ تیسرے درجے کے شاعر ہیں۔ چوں کہ صوبہ غرب و شمال کے لفٹنٹ گورنر کے میر منشی ہیں، غالبؔ انھیں لکھتے ہیں:

> " اودھ اخبار میں حضرت کی غزل نظر فروز ہوئی۔ کیا کہنا ہے۔ ابداع اس کو کہتے ہیں، جدتِ طرز اس کا نام ہے۔ جو ڈھنگ تازہ نوایانِ ایران کے

خیال میں نہ گزرا تھا، وہ تم بروے کار لائے۔"

۱۰ جنوری ۱۹۶۶ء

امیر خسرو کے علاوہ غالب ہندوستان کے کسی اور فارسی شاعر کو تسلیم نہیں کرتے تھے، لیکن اپنے ایک شاگرد اور تیسرے درجے کے شاعر نواب انور الدولہ سعد الدین خاں بہادر شفق کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

> "خوشامد میرا شیوہ نہیں ہے۔ جو اُن غزلوں کی حقیقت میری نظر میں ہے، وہ مجھ سے سُن لیجیے اور میرے داد دینے کی داد دیجیے۔ مولانا قلق نے متقدمین یعنی امیر خسرو و سعدی و جامی کی روش کو سرحد کمال کو پہنچایا ہے اور میرے قبلہ و کعبہ مولانا شفق اور مولانا ہاشمی اور مولانا عسکری متاخرین یعنی صائب و کلیم و قدسی کے انداز کو آسمان پر لے گئے ہیں۔"

غالب نے شاعری میں اپنی ایک تخیلی اور مثالی شخصیت کا بُت تراش رکھا تھا لیکن خطوط میں ہمیں جو شخصیت نظر آتی ہے، اُس میں انسانی کردار کی بلندی بھی ہے اور پستی بھی۔ خودداری اور خودنگری بھی ہے اور خوشامد، تملق اور دریوزہ گری بھی۔ حق و صداقت بھی ہے اور دروغ گوئی و مصلحت کوشی بھی۔

دل پھر طوافِ کوے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے

کی تفسیر بھی ان خطوط میں نظر آتی ہے۔

تہی دستی، مفلسی، ناقدری، بے عزتی اور ناکامی غالب کی حسرتِ تعمیر کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکی۔ زندگی کے آخری لمحوں تک وہ زندہ رہنے کے لیے جہاد کرتے رہے۔

اگر غالب میں غیر معمولی قوتِ ارادی اور زندہ رہنے کا سلیقہ نہ ہوتا تو وہ مرنے سے بہت پہلے مر گئے ہوتے۔

ان خطوط میں زندگی اپنی تمام رعنائیوں ، دلکشیوں ، بلندیوں ، پستیوں اور پیچیدگیوں کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے۔ شاعری میں غالب کی آواز ہمیں کافی دور سے سُنائی دیتی ہے، لیکن خطوط میں وہ ہمارے ساتھ بیٹھ کر ہم سے محوِ گفتگو ہیں۔ شاعری میں وہ ہمارے دکھ درد اور ہماری نفسیاتی الجھنوں کا مداوا ایک مفکر فلسفی، صوفی اور ایک اخلاقی مصلح کی حیثیت سے کرتے ہیں لیکن خطوط میں وہ ایک حقیقت پسند اور عملی انسان کی حیثیت سے ہمارے دکھ درد اور خوشی وغم میں شریک ہوتے ہیں۔ ان خطوط میں ہمیں ایک منطقی دماغ کا نہیں بلکہ ایک حساس اور دھڑکتے ہوئے دل اور سانس لیتی زندگی کے وجود کا احساس ہوتا ہے۔

ان خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کی دنیا بہت وسیع ہے۔ اگر صرف اُن انگریز عہدیداروں کے حالات کا جائزہ لیا جائے جن سے غالب کے تعلقات تھے یا جن سے پنشن کے سلسلے میں غالب نے رابطہ قائم کیا تھا تو انیسویں صدی کے نصف اول کے ہندوستان میں برطانوی حکومت کی تاریخ کا بہت بڑا حصہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ اگر ان فارسی شاعروں اور لغت نویسوں کا تذکرہ مرتب کیا جائے، جن کا ذکر غالب کے خطوط میں آیا ہے تو فارسی ادب کی ایک ایسی تاریخ مرتب ہو جائے گی، جس میں فارسی کے اہم ترین ایرانی اور ہندوستانی شعرا کا ذکر ہوگا۔ اسی طرح اردو شاعروں اور ادیبوں کا بھی نسبتاً ایک مختصر سا تذکرہ ان خطوط کی بنیاد پر مرتب کیا جاسکتا ہے۔ اگر ہم صرف "دستنبو" اور غالب کے خطوط کے حوالے سے ۱۸۵۷ء کی بغاوت کا مطالعہ کریں تو اس سے متعلق بیشتر اہم واقعات اور شخصیتیں ہماری نظر میں آجاتی ہیں۔ اِس لیے غالب کے عہد کی سماجی، تہذیبی اور سیاسی زندگی کے مطالعے کے لیے بھی خطوطِ غالب اہم ترین مآخذ ہیں۔

غالب کے عہد کی بعض ریاستوں مثلاً رام پور، بیکانیر، الور، بھرت پور، فیروز پور، لوہارو، حیدر آباد، اودھ، جے پور، باندہ وغیرہ کے حالات پر بھی غالب کے

خطوط سے کچھ نہ کچھ روشنی پڑتی ہے۔

غالب کی گفتگو میں جو خود اعتمادی اور ان کی شخصیت میں جو تاب و توانائی ہے، اس کے لیے شخصیت کا منفرد ہونا ضروری ہے اور منفرد شخصیت اسی کی بنتی ہے، جس نے اپنی انا کی نگہداری کی ہو۔

خطوطِ غالب کے جلوۂ صد رنگ میں سب سے زیادہ تیکھا اور شوخ رنگ غالب کی اَنا اور انفرادیت کا ہی ہے۔ انفرادیت تو ہر انسان کی ہوتی ہے لیکن عام انسانوں کی انفرادیت کی لو اتنی مدھم ہوتی ہے کہ مخصوص سماجی گروہ یا طبقے کی اجتماعی انفرادیت کی تیز روشنی میں گم ہو کر رہ جاتی ہے اور صرف انسانی نفسیات کے ماہرینِ نفسیات ہی اس دبی ہوئی اور کمزور انفرادیت کو تلاش کر پاتے ہیں۔

انفرادیت کو فروغ اَنا سے حاصل ہوتا ہے۔ جس انسان کی اَنا میں جتنی زیادہ قوت ہوگی اتنی ہی اس کی انفرادیت بلند ہوگی، اَنا کے سرچشمے مختلف ہیں۔ خاندانی وقار، علم و فن، سیاسی اقتدار اور دولت وغیرہ۔ اَنا سے انفرادیت حاصل ہوتی ہے اور انفرادیت سے شہرت اور عزت۔ شہرت فرد کے سماجی گروہ تک محدود رہے گی یا پورے ملک میں پھیلے گی یا زماں و مکاں کی قیود سے آزاد ہوگی، اس کا انحصار انفرادیت کی قوت پر ہوتا ہے۔ فرد میں انفرادیت کی لے جتنی زیادہ تیز ہوگی، اتنی ہی اس کی شہرت ہوگی۔ غالب کی اَنا میں زبردست توانائی ہے۔ اور اس اَنا کے سرچشمے تین ہیں۔ خاندانی وقار، مہارتِ فن اور فارسی دانی۔ جاگیرداری نظام میں خاندانی برتری کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ لہٰذا فرد کی قدر و قیمت اُس کی اپنی صلاحیتوں کی بنیاد پر نہیں بلکہ اُس کے حسب نسب پر ہوتی ہے۔

غالب کو اپنی انفرادیت قائم رکھنے کے لیے خاندان کے سلسلے میں دروغ گوئی سے بھی کام لینا پڑا۔ بہ قول قاضی عبدالودود :

" غالب نے پہلے اپنے کو ترک ایبک افراسیابی النسل کہا اور بغیر اس کے کہ

> اس کی تردید کریں، سلجوقیوں کو ہمگونر کا دعوے کیا، اس کے بعد اپنے کو سلجوقی کہا اور بالآخر سنجر و برکیارق کی اولاد ہونے کے مدعی ہوتے ...... ڈاکٹر یوسف حسین کے اس خیال سے مجھے اتفاق ہے کہ غالبؔ اوزبک تھے۔ ہند میں اس کے ساتھ خوشگوار تصورات وابستہ نہیں، ذہن ایبک کی طرف گیا، جو اور کچھ نہیں تو اس کا قافیہ ہو سکتا تھا؟!"

فارسی دانی کا لوہا منوانے کے لیے غالبؔ نے "قاطعِ برہان" کا قضیہ کھڑا کر دیا۔ یہ غالبؔ کی ضعیفی کا زمانہ تھا۔ اور غالبؔ پر بہت زیادہ حملے ہو رہے تھے، لیکن غالبؔ نے ہمت نہیں ہاری۔ یہ معرکہ ادبی مباحث سے گزر کر گالی گلوچ تک پہنچا اور نوبت یہاں تک آئی کہ غالبؔ کو عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑا۔ اگرچہ "برہانِ قاطع" پر غالبؔ کے کافی اعتراضات بے بنیاد تھے۔ لیکن یہ ادبی معرکہ غالبؔ کی حد سے بڑھی ہوئی انفرادیت کا بہت بڑا ثبوت ہے۔

فارسی پر غیر معمولی قدرت ثابت کرنے کے لیے غالبؔ کو کبھی کبھی اپنے مزاج کے خلاف پینترے بازیوں سے بھی کام لینا پڑا ہے۔ مثلاً انھوں نے "دستنبو" بہ قول اُن کے خالص فارسی قدیم میں لکھی ہے۔ اس کے بارے میں مرزا ہرگوپال تفتہ کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

> "میں نے آغاز یازدہم مئی ۱۸۵۷ء سے سی و یکم جولائی ۱۸۵۸ء تک روداد شہر اور اپنی سرگذشت یعنی پندرہ مہینے کا حال نثر میں لکھا ہے اور التزام اس کا کیا ہے کہ "دساتیر" کی عبارت یعنی پارسی قدیم لکھی جائے اور کوئی لفظ عربی نہ آئے"۔ —————— ہفدہم اگست ۱۸۵۸ء

پوری احتیاط کے باوجود عربی کے کچھ الفاظ "دستنبو" میں شامل ہو ہی گئے۔

فارسی زبان پر اپنی غیر معمولی قدرت ثابت کرنے کے لیے اگر غالبؔ نے "دستنبو" اور "قاطعِ برہان" جیسی کتابیں لکھیں یا دوستوں اور شاگردوں کے نام خطوں میں ہندوستانی

فرہنگ نویسوں اور شاعروں کو جو بُرا بھلا کہا اور گالیاں دیں تو چلیے کوئی بات نہیں۔ ستم یہ ہے کہ غالب نواب کلب علی خاں سے الجھ گئے اور یہ نہ سوچا کہ اگر نواب صاحب نے ناراض ہو کر تنخواہ بند کر دی تو دن میں تارے نظر آنے لگیں گے۔ ہوا یہ کہ غالب اور نواب صاحب میں کچھ فارسی الفاظ پر بحث ہو گئی۔ نواب صاحب نے ایک خط میں غالب کو لکھا کہ "ارتنگ و ارژنگ" متحد المعنی ہیں اور "آشیاں ساختن و بستن و چیدن" گھونسلا بنانے کے معنی میں آتا ہے۔

غالب نے نواب صاحب کو اس کے جواب میں لکھا:

> "فقیر اشعارِ قدما کا معتقد، اُن لوگوں کے کلام کا عاشق۔ مگر جو لغات اُن کے کلام میں ہیں، اُن کے معنی تو اہلِ ہند نے اپنے قیاس سے نکالے ہیں، میں اُن کے قیاس پر کیوں کر تکیہ کروں۔ اب جو پیر و مرشد نے لکھا کہ "ارتنگ و ارژنگ" متحد المعنی اور "آشیاں ساختن و بستن و چیدن" گھونسلا بنانے کے معنی پر ہے، تو میں نے بے تکلف مان لیا، لیکن نہ اُن صاحبوں کے قیاس کے بہ موجب، بلکہ اپنے خداوندِ نعمت کے حکم کے مطابق"[1]، ۱۷ اکتوبر ۱۸۶۶ء

ظاہر ہے کہ اس خط کا نواب صاحب پر بُرا اثر ہوا۔ انھوں نے غالب کی تنخواہ تو بند نہیں کی لیکن پھر اپنی نثر اصلاح کے لیے غالب کو کبھی نہیں بھیجی۔

غالب وبائے عام میں نہیں مرنا چاہتے۔ وہ جب ڈاڑھی منڈواتے ہیں تو سر پر بھی اُسترا پھروا لیتے ہیں۔ انھیں اپنی وہ ہیئت و حالت قطعی پسند نہیں تھی، جو عوام الناس کی ہو۔ خط کے لفافوں کے انتخاب میں بھی ان کی انفرادیت جلوہ گر نظر آتی ہے۔ انھیں منشی شیو نرائن آرام کے بھیجے ہوئے لفافے صرف اس لیے پسند نہیں کہ اُن پر عام انداز میں "بہ مقام" اور "در مقام" اور "ماہ و تاریخ" چھپا ہوا ہے۔

یہ غالب کی اَنا ہی تھی جو انھیں دوستوں کو بار بار یہ لکھنے پر مجبور کرتی تھی کہ خط کے

پتے پر صرف اُن کا نام اور دلّی لکھا جائے۔ اگر کوئی پتا ذرا تفصیل سے لکھتا تو ناراض ہو جاتے بعض اوقات اپنی ناراضگی کا اظہار بہت دلچسپ انداز میں کرتے ہیں۔ ایک دفعہ علائی کی جو شامت آئی تو غالب سے اُن کا پتا پوچھ لیا۔ غالب تو بھڑک اُٹھے۔ علائی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :

> " سنو صاحب، حسن پرستوں کا ایک قاعدہ ہے کہ وہ امرد کو دو چار برس گھٹا کر دیکھتے ہیں۔ جانتے ہیں کہ جوان ہے لیکن بچہ سمجھتے ہیں۔ یہ حال تمھاری قوم کا ہے۔ قسم شرعی کھا کر کہتا ہوں کہ ایک شخص ہے کہ اُس کی عزت اور نام آوری جمہور کے نزدیک ثابت اور متحقق ہے اور تم صاحب بھی جانتے ہو مگر جب تک اُس سے قطع نظر نہ کرو اور اُس مسخرے کو گمنام و ذلیل نہ سمجھ لو تو تم کو چین نہ آئے گا۔ پچاس برس سے دلّی میں رہتا ہوں، ہزارہا خط اطراف و جوانب سے آتے ہیں۔ بہت لوگ ایسے ہیں کہ محلہ نہیں لکھتے۔ بہت لوگ ایسے ہیں کہ محلۂ سابق کا نام لکھ دیتے ہیں۔ حکام کے خط فارسی اور انگریزی، یہاں تک کہ ولایت کے آئے ہوئے، صرف شہر کا نام اور میرا نام۔ یہ سب مراتب تم جانتے ہو اور اُن خطوط کو تم دیکھ چکے ہو اور پھر مجھ سے پوچھتے ہو کہ اپنا مسکن بتا۔ اگر میں تمھارے نزدیک امیر نہیں، نہ سہی، اہلِ حرفہ میں سے بھی نہیں ہوں کہ جب تک محلہ اور تھانہ نہ لکھا جائے، ہرکارہ میرا پتا نہ پائے۔ آپ صرف "دہلی" لکھ کر میرا نام لکھ دیا کیجیے۔ خط کے پہنچنے کا میں ضامن۔" ۴ اپریل ۱۸۶۱ء

نواب انور الدولہ نے غالب کا پتا ذرا تفصیل سے لکھ دیا۔ دیکھیے گل افشانیِ گفتار:

> " خط کا عنوان دیکھ کر میں سمجھا کہ شاید شہر کے محلّات کی کوئی فہرست یا پڑوسیوں کے جمع و خرچ کا حساب ہے۔" ———— (فارسی سے ترجمہ)

غالب کی یہی اَنا اُن کے خطوط میں بے شمار روپ دھارے نظر آتی ہے یہی انفرادیت ایک طرف حسین نگار خانوں کی تخلیق کرتی ہے تو دوسری طرف اردو کو ایک نئے آب و رنگ اور نئے تب و تاب سے آشنا کرتی ہے۔

القاب و آداب

غالب نے نواب انور الدولہ شفق کے نام ایک خط میں لکھا ہے:

> „ پیر و مرشد! یہ خط لکھنا نہیں ہے، باتیں کرنی ہیں اور یہی سبب ہے کہ میں القاب و آداب نہیں لکھتا۔" ۲۹ جون ۱۸۵۶ء

ہمارے بعض ناقدوں نے غالب کے اس بیان سے یہ نتیجہ نکال لیا کہ غالب نے خطوط میں القاب و آداب لکھنا ترک کر دیا تھا۔ خطوطِ غالب کے مطالعے سے یہ بات غلط ثابت ہوتی ہے۔ مرزا ہرگوپال تفتہ کے نام غالب نے ایک سو تیئس خطوط میں سے صرف بیس خطوط میں القاب نہیں لکھے۔ نواب علاء الدین خاں علائی کے نام اٹھاون خطوط ہیں جن میں سے صرف چھ خطوط ایسے ہیں، جن میں القاب نہیں لکھے گئے۔ میاں داد خاں سیاح کے نام پینتیس خطوط میں ایک خط بھی ایسا نہیں جس میں القاب نہ ہو۔ میر مہدی مجروح کے نام پچاس میں سے صرف چھ، چودھری عبدالغفور سرور کے نام ستائیس میں سے دو، خواجہ غلام غوث خاں بے خبر کے نام پچیس میں سے تین اور نواب انور الدولہ شفق کے نام بیس میں سے صرف دو خطوط ایسے ہیں جو القاب سے عاری ہیں۔ گویا غالب کے القاب اور آداب کے استعمال کے بارے میں جو کچھ ہمارے نقاد کہتے رہے ہیں، وہ درست نہیں۔ دراصل غالب نے شفق کے نام خط میں جو کچھ لکھا ہے اُس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انھوں نے القاب لکھنا بالکل بند کر دیا بلکہ وہ کہنا چاہتے ہیں کہ لمبے لمبے، پُر تکلف اور پُر تصنع القاب کا استعمال

انھوں نے بند کر دیا ہے۔ غالب نے "پنج آہنگ" کے آہنگِ اول میں اپنا یہ موقف اس طرح بیان کیا ہے :

> " مکتوب الیہ کو اس کی حیثیت کے مطابق پکارتا ہوں (یعنی القاب لکھتا ہوں) القاب اور آداب اور عافیت حشو زائد ہے" (فارسی سے ترجمہ)

اردو خطوط میں القاب لکھتے ہوتے غالب کا بالکل یہی رویہ ہے۔ وہ مخاطب کی حیثیت کے مطابق چھوٹا سا القاب لکھ کر، مطلب کی بات بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ایسے خطوط کی تعداد بہت کم ہے، جن میں القاب نہیں لکھے گئے۔

عام طور سے صرف القاب پڑھ کر ہمیں مکتوب الیہ سے غالب کے ذہنی رشتے کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ ان القابوں میں بے تکلفی، بے ساختگی اور گفتگو کا انداز ہے۔ کبھی کبھی یہ القاب خط کے مضمون کے مطابق ہوتے ہیں۔ غالب نے علائی کے نام خطوط میں حسبِ ذیل القاب لکھے ہیں :

> " اجی مولانا علائی۔ مرزا علائی مولائی۔ میری جان۔ صاحب۔ جانا عالیشانا۔ مرزا۔ میاں۔ سعادت و اقبال نشان۔ یار بھتیجے گویا بھائی مولانا علائی وغیرہ"

تفتہ کے نام خطوط کے القاب ملاحظہ ہوں :

> " مہاراج۔ بندہ پرور۔ کاشانۂ دل کے ماہِ دو ہفتہ، منشی ہر گوپال تفتہ۔ نورِ نظر و لختِ جگر۔ اجی مرزا تفتہ۔ برخوردار۔ میرے مہربان۔"

میر مہدی مجروح کے نام ایک خط میں جو القاب لکھا ہے، اُس سے خط کے مضمون کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ غالب لکھتے ہیں : " جویائے حالِ دہلی و الور سلام لو۔" اور یہ صرف القاب ہی نہیں بلکہ ایک موضوع مصرع بھی ہے۔

غالب اپنے چھوٹوں کو مہاراج۔ سید صاحب۔ میاں۔ صاحب۔ سید۔ فرزندِ دلبند۔ مرزا۔ میری جان۔ برخوردار۔ بھائی، نورِ چشم۔ راحتِ جاں۔ اقبال نشاں

جانِ من - سعادت و اقبال نشان - سعادت نشانا وغیرہ جیسے القاب لکھتے ہیں۔

جب غالب اپنے ہم عمروں اور ایسے لوگوں کو خط لکھتے، جن کا کچھ سماجی وقار تھا، خواہ وہ غالب کے شاگرد ہی کیوں نہ ہوں، تو غالب القاب میں بے تکلفی سے کام نہ لیتے۔ خواجہ غلام غوث خاں بے خبر، نواب انور الدولہ شفق اور شہزادہ بشیر الدین جیسے لوگوں کو پیر و مرشد - بندہ پرور - جناب عالی - قبلہ و کعبہ - قبلہ حاجات اور خداوندِ نعمت جیسے القاب لکھتے ہیں:

بعض لوگ ایسے بھی تھے، جن کی سماجی حیثیت سے مرعوب ہو کر غالب طویل اور پُر تصنع القاب بھی لکھتے تھے۔ نواب میر غلام بابا خاں کے نام خطوط میں غالب نے اسی طرح کے القاب لکھے ہیں:

> " سبحان اللہ تعالیٰ شانہٗ ما اعظم برہانہٗ جناب مستطاب، نواب میر غلام بابا خاں "
>
> " ستودہ بہر زبان و نامور بہر دریا، نواب صاحب، شفیقِ کرم گستر، مرتضوی تبار، نواب میر غلام بابا خاں بہادر"
>
> " نواب صاحب، جمیل المناقب، عمیم الاحسان، عالی شان، والا دودمان، زاد مجدکم "

۱۸۵۷ء سے وفات کے وقت تک غالب کو نوابانِ رام پور کے نام سو روپے کی وصولیابی کی اطلاع کے لیے مہینے میں کم سے کم ایک خط لکھنا ضروری تھا۔ وہ خطوط الگ ہیں، جو غالب نے مزید روپے طلب کرنے یا کلام پر اصلاح یا دوسرے معاملات کے سلسلے میں لکھے ہیں۔ اتنے خطوط میں ہمیشہ ایک نیا القاب لکھنا غالب کے لیے بہت مشکل تھا۔ انھوں نے اس مسئلے کا حل یہ نکالا ہے کہ نواب یوسف علی خاں ناظم اور اُن کی وفات کے بعد نواب کلب علی خاں کو اکثر خطوط میں "حضرت ولیِ نعمت آیۂ رحمت سلامت" لکھا۔

صرف تین چار خطوط میں "جناب عالی" "حضور" یا "ولی نعمت آیۂ رحمت" (بغیر حضرت کے) لکھ کر اپنی قائم کردہ روایت سے انحراف کیا ہے۔

کبھی کبھی غالبؔ القاب کو مقفّیٰ کر کے شروع ہی سے پڑھنے والے کی خط میں دلچسپی قائم کر دیتے ہیں۔ نواب یوسف مرزا کو لکھتے ہیں "میری جان۔ خدا تیرا نگہبان"۔ شیخ عبداللطیف بلگرامی کو القاب لکھتے ہیں "میاں لطیف۔ مزاج شریف"۔ میر سرفراز حسین کے نام خط کا آغاز ان الفاظ سے کرتے ہیں "میری جان کے چین۔ مجتہد العصر میر سرفراز حسین"۔ میاں دادخاں سیاحؔ کو ایک خط میں القاب لکھتے ہیں"۔ سعادت و اقبال نشاں۔ منشی میاں دادخاں"۔

اردو خطوط نویسی کو غالبؔ کی دین یہ نہیں ہے کہ انھوں نے القاب اور آداب لکھنے بند کر دیے بلکہ اُن کی دین یہ ہے کہ ایک تو القاب کو مختصر کیا اور دوسرے القاب کو مکتوب الیہ سے اپنے ذہنی رشتے کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ جس کی وجہ سے القاب میں تصنع اور تکلف کے بجائے ایک فطری انداز پیدا ہو گیا۔ اور "یہاں سب خیریت ہے اور آپ کی خیریت خداوند کریم سے نیک مطلوب ہے" جیسی چیزوں سے اردو خطوط کو نجات دلائی۔

غالبؔ کا آئینِ نامہ نگاری

غالبؔ نے ۲۰ نومبر ۱۸۵۵ء کے ایک خط میں قاضی عبدالجمیل جنوںؔ کو لکھا ہے:

> "دوسرا سبب یہ کہ شوقیہ خطوط کا جواب کہاں تک لکھوں اور کیا لکھوں؟ میں نے آئینِ نامہ نگاری چھوڑ کر مطلب نویسی پر مدار رکھا ہے۔ جب مطلب ضروری التحریر نہ ہو تو کیا لکھوں"

یہ بات بالکل درست ہے کہ غالبؔ کے خطوط کی بنیاد زیادہ تر مطلب نویسی پر ہے۔

غالب کوشش کرتے ہیں کہ سیدھی سادی اور مختصر زبان میں اس طرح بات کہیں کہ پڑھنے والا فوراً اُن کا مافی الضمیر سمجھ لے۔ بہ حیثیت شاعر غالب بہت مشکل پسند اور خاصے پیچیدہ ہیں۔ وہ اردو کے واحد شاعر ہیں جن کے کلام کی اتنی شرحیں لکھی گئیں اور بہت سے اشعار کی شرح لکھتے ہوئے ان کے شارحین کے درمیان خاصا اختلاف بھی رہا۔ پھر خطوط میں غالب اتنی سادگی اور صفائی کیوں برتنا چاہتے ہیں، اس کا جواب غالب نے خود اپنے ایک فارسی خط میں دیا ہے۔ مرزا علی بخش خاں کو کلکتے سے لکھتے ہیں؛

> ”مطالب بہت زیادہ ہیں اور پیچیدہ ہیں۔ چاہتا ہوں کہ کم سے کم لفظوں میں اپنی بات کہہ دوں اور تحریر کو تقریر کا آئینہ بنا دوں۔ غور کیجے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ میرا مقصود کیا ہے۔ اور آپ کو اس سلسلے میں کیا کرنا ہے“
>
> (فارسی سے ترجمہ)

غالب نے ایک اور فارسی خط میں مرزا علی بخش خاں کو لکھا ہے:

> ” جانِ برادر! بات کو خواہ مخواہ طول دینے سے اثر بھی کم رہ جاتا ہے، اور پیچیدگیاں بھی پیدا ہوجاتی ہیں، اس لیے چاہتا ہوں کہ بات کو مختصر کہہ کر مؤثر بناؤں اور سُننے والا بھی بات کی تہہ تک جلد پہنچ جائے۔ محض کار برآری پر آمادہ کرنا گو کہ مقصد نہیں ہے مگر ایسی صورت میں جب کہ کہنے والا یہ کوشش کرے کہ تحریر تکلم سے اتنی اجنبی نہ ہو کہ تحریر و تکلم میں باہم دگر نسبت اور پیوستگی باقی نہ رہے اور ایک کا عکس دوسرے کے چہرے پر نہ پڑ سکے۔“ (فارسی سے ترجمہ)

اگر کوئی دوست یا شاگرد غالب کو ایسا خط لکھتا جس میں ژولیدہ بیانی ہوتی اور مطلب کی باتوں کے بجائے اِدھر اُدھر کی بے مقصد باتیں کی گئی ہوتیں تو غالب ناراض ہوجاتے۔ میر مہدی مجروح نے ایک خط میں نہ جانے کون سے ایسے واقعات اور کون سی ایسی باتیں

لکھ دیں، جن میں غالب کو دلچسپی نہیں تھی۔ خط پڑھ کر غالب کتنے بے مزہ ہوتے، اس کا اندازہ مجروح کے نام خط کی اس دلچسپ عبارت سے لگائیے:

> واہ حضرت! کیا خط لکھا ہے۔ اِس خرافات کے لکھنے کا فائدہ؟ بات اتنی ہی ہے کہ میرا پلنگ مجھ کو ملا۔ میرا بچھونا مجھ کو ملا۔ میرا حمام مجھ کو ملا۔ میرا بیت الخلا مجھ کو ملا۔ رات کا وہ شور، کوئی آئیو، کوئی آئیو، فرو ہوگیا۔ میری جان بچی۔ میرے آدمیوں کی جان بچی۔"

بنام میر مہدی مجروح ۲۶ ستمبر ۱۸۶۲ء

غالب خطوط نویسی میں سادگیِ بیان پر بہت زور دیتے۔ انھیں خطوں میں پر تصنع اور پر تکلف عبارت ہرگز پسند نہیں تھی۔ غالب نے میر مہدی مجروح کو خط لکھا جس میں سیدھی سادی زبان میں مطلب کی باتیں لکھ دیں۔ خط غالباً مختصر تھا۔ مجروح نے خط کے مختصر ہونے کی شکایت لکھی، غالب نے بہت دلچسپ انداز میں اس شکایت کا جواب ان الفاظ میں لکھا:

> ہاں صاحب! تم کیا چاہتے ہو؟ مجتہد العصر کے مسودے کو اصلاح دے کر بھیج دیا، اب اور کیا لکھوں؟ تم میرے ہم عمر نہیں، جو سلام لکھوں۔ میں فقیر نہیں جو دعا لکھوں۔ تمھارا دماغ چل گیا ہے۔ لفافے کو کریدا کرو، مسودے کو بار بار دیکھا کرو۔ پاؤ گے کیا؟ یعنی تم کو وہ محمد شاہی روشیں پسند ہیں۔ یہاں خیریت ہے، وہاں کی عافیت مطلوب ہے۔ خط تمھارا بہت دن کے بعد پہنچا۔ جی خوش ہوا۔ مسودہ بعد اصلاح کے بھیجا جاتا ہے۔ برخوردار میر سرفراز حسین کو دینا اور دعا کہنا اور ہاں حکیم میر اشرف علی اور میر افضل علی کو بھی دعا کہنا۔ لازمہ سعادت مندی یہ ہے کہ ہمیشہ اسی طرح خط بھیجتے رہو۔"
>
> کیوں سچ کہیو، اگلوں کے خطوط کی تحریر کی یہی طرز تھی یا اور، ہائے، کیا اچھا شیوہ ہے۔ جب تک یوں نہ لکھو، وہ خط ہی نہیں ہے۔

> چاہِ بے آب ہے، ابرِ بے باراں ہے۔ نخلِ بے میوہ ہے۔ خانۂ بے چراغ ہے۔ چراغِ بے نور ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ تم زندہ ہو۔ تم جانتے ہو کہ ہم زندہ ہیں۔ امرِ ضروری کو لکھ لیا۔ زوائد کو اور وقت پر موقوف رکھا اور اگر تمھاری خوشنودی اسی طرح کی نگارش پر منحصر ہے تو بھائی ساڑھے تین سطریں ویسی بھی میں نے لکھ دیں۔ کیا نماز قضا نہیں پڑھتے اور وہ مقبول نہیں ہوتی؟ خیر ہم نے بھی وہ عبارت جو مسودے کے ساتھ نہیں لکھی تھی، اب لکھ بھیجی قصور معاف کرو، خفا نہ ہو۔"

بنام میر مہدی مجروح ۲۲ ستمبر ۱۸۶۱ء

مرزا حاتم علی مہر نے غالب کو خط لکھا اور اُس میں محمد شاہی روشوں سے کام لیا۔ غالب نے اُن کے خط کا جواب دیا ہے، اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مہر کے خط میں پرشکوہ الفاظ اور پر تصنع عبارت تو تھی لیکن کوئی ایسی بات نہیں تھی جو غالب کے لیے دلچسپی کا باعث ہو۔ جس پر غالب نے برافروختہ ہو کر لیکن بہت دلچسپ انداز میں اس خط کا جواب دیا۔ لکھتے ہیں:

> "اگر تم مناسب جانو، تو ایک بات میری مانو، رقعاتِ عالمگیری یا انشائے خلیفہ اپنے سامنے رکھ لیا کرو۔ جو عبارت اُس میں سے پسند آیا کرے، وہ خط میں لکھ دیا کرو۔ خط مفت میں تمام ہو جایا کرے گا اور تمھارے خط کے آنے کا نام ہو جایا کرے گا۔"

بنام مرزا حاتم علی مہر ۲۰ دسمبر ۱۸۵۸ء

اب تک غالب کے خطوط کے جو اقتباسات پیش کیے گئے، اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید غالب "شوقیہ خطوط" لکھنے کے خلاف تھے اور انھوں نے اپنے عہد کے مروجہ آئین نامہ نگاری کو ترک کر کے صرف مطلب نویسی پر ہی اپنے خطوط کی بنیاد رکھی تھی۔ لیکن

یہ بات سوفی صدی درست نہیں۔ غاؔلب نے بہت بڑی تعداد میں "شوقیہ خطوط" بھی لکھے ہیں اور اپنے شاگردوں اور دوستوں سے، ایسے خطوط کا مطالبہ بھی کیا ہے۔ دراصل غاؔلب کہنا یہ چاہتے ہیں کہ ضروری نہیں کہ مکتوب نگار خط میں صرف "مطلب نویسی" کرے، یعنی " اپنے مقصد بر آری" کے لیے خط لکھے اور باتیں بھی لکھے لیکن صرف ایسی باتیں کہ جن میں مکتوب الیہ کو دلچسپی ہو۔

غاؔلب ہرگز یہ نہیں چاہتے کہ دوسرے لوگ غاؔلب کو صرف مطلب کی باتوں کے علاوہ اور کچھ نہ لکھیں۔ انھوں نے تفتؔہ اور دوسرے لوگوں کو بار بار تاکید کی ہے کہ اپنی خیریت کے خطوط بار بار بھیجتے رہا کریں۔ تفتؔہ کو لکھتے ہیں:

> "سنو صاحب! اپنے پر لازم کر لو، ہر مہینے میں ایک خط مجھ کو لکھنا۔ اگر کچھ کام آپڑا، دو خط، تین خط، ورنہ صرف خیر و عافیت لکھی اور ہر مہینے میں ایک بار بھیج دی۔"

مرزا ہرگوپال تفتؔہ ۱۹ جون ۱۸۵۸ء

ظاہر ہے کہ جب آدمی اپنی خیریت و عافیت کی اطلاع دینے کے لیے خط لکھے گا تو اس میں صرف مطلب نویسی اور مقصد نویسی کہاں سے آئے گی۔

خطوط میں مکالمہ نویسی

۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب کا غاؔلب کی زندگی پر سب سے برا اثر یہ پڑا کہ وہ تنہا رہ گئے۔ دوست، عزیز، شاگرد اور دوسرے ملنے والوں میں سے بیشتر مارے گئے، باقی فرار ہو گئے۔ اپنی اس تنہائی کا غاؔلب نے کیسے درد انگیز انداز میں ذکر کیا ہے۔ میر سرفراز حسین کو لکھتے ہیں:

> " وہی بالاخانہ ہے، اور وہی میں ہوں۔ سیڑھیوں پر نظر ہے کہ وہ میر مہدی

آئے، وہ میر سرفراز حسین آئے، وہ یوسف مرزا آئے، وہ میرن آئے، وہ یوسف علی خاں آئے۔ مرے ہوؤں کا نام نہیں لیتا۔ بچھڑے ہوؤں میں سے کچھ گنے ہیں۔ اللہ اللہ اللہ۔ ہزاروں کا ماتم دار ہوں، میں مروں گا تو مجھ کو کون روئے گا"

تفتہ سے خط نہ لکھنے کی شکایت کرتے ہوئے اپنی تنہائی کا حال بیان کرتے ہیں:

> مُجھ سے کیوں خفا ہو؟ آج مہینا بھر ہو گیا ہوگا، یا بعد دو چار دن کے ہو جائے گا کہ آپ کا خط نہیں آیا۔ انصاف کرو کتنا کثیر الاحباب آدمی تھا کوئی وقت ایسا نہ تھا کہ میرے پاس دو چار دوست نہ ہوتے ہوں۔ اب یاروں میں ایک شیو جی رام برہمن اور بال مکند اُس کا بیٹا، یہ دو شخص ہیں کہ گاہ گاہ آتے ہیں"۔
>
> بنام مرزا ہرگوپال تفتہ   ۱۹ جون ۱۸۵۸ء

غالب نے خطوں کے ذریعے اپنی خلوت میں جلوت اور اپنی تنہائی میں انجمن کی سی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ دن کا بڑا حصہ خط پڑھنے، ان کا جواب لکھنے اور لفافے بنانے میں صرف ہو جاتا۔ غالب اپنی اس مصروفیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> " میں اس تنہائی میں صرف خطوط کے بھروسے پر جیتا ہوں یعنی جس کا خط آیا، میں نے جانا کہ وہ شخص تشریف لایا . . . . دن اُن (خطوط) کے پڑھنے اور جواب لکھنے میں گزر جاتا ہے"
>
> بنام مرزا ہرگوپال تفتہ   ۲۷ دسمبر ۱۸۵۸ء

غالب خطوط نویسی کو گفتگو کا بدل سمجھتے ہیں۔ اردو میں باقاعدہ خطوط نویسی سے بہت قبل غالب کو یہ احساس ہو چکا تھا کہ خط میں تحریر کو تقریر کا آئینہ ہونا چاہیے۔ (غالب نے علی بخش خاں کے نام جس فارسی خط میں یہ بات کہی تھی، اس کا اقتباس پہلے نقل کیا

جا چکا ہے) اردو خطوط میں تو غالب نے بارہا اس بات کو دہرایا ہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ”اسی وقت تمھارا ایک خط اور یوسف مرزا کا ایک خط آیا۔ مجھ کو جو باتیں کرنے کا مزہ ملا تو دونوں کا جواب لکھ کر روانہ کیا۔“

بنام میر مہدی مجروح ۷ مارچ ۱۸۵۹ء

ایک اور فارسی خط میں غالب لکھتے ہیں:

> ”میں نے آسان راستہ اختیار کرلیا ہے۔ جو بھی لکھتا ہوں، اردو میں لکھتا ہوں۔ نہ سخن آرائی نہ خود نمائی۔ تحریر کو گفتگو بنالیا ہے“ (فارسی سے ترجمہ)

بنام منشی نول کشور ۔ جولائی ۱۸۶۰ء

خطوط کے ذریعے اس گفتگو کو غالب ”مکالمہ“ کہتے ہیں۔ مرزا تفتہ کا بہت دن سے خط نہیں آیا۔ غالب ایک خط میں اس کی شکایت ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ”میں تمھارے اور بھائی منشی نبی بخش صاحب اور جناب مرزا حاتم علی صاحب کے خطوط کے آنے کو، تمھارا اور اُن کا آنا سمجھتا ہوں۔ تحریر گویا وہ مکالمہ ہے، جو باہم ہوا کرتا ہے۔ پھر تم کہو، مکالمہ کیوں موقوف ہے۔“

بنام مرزا ہر گوپال تفتہ ۱۶ اکتوبر ۱۸۵۸ء

اب خطوطِ غالب کے کچھ اور اقتباسات ملاحظہ ہوں، جن میں غالب نے مراسلے کو مکالمہ کہا ہے:

> ”بھائی! مجھ کو اس مصیبت میں کیا ہنسی آتی ہے کہ ہم، تم اور مرزا تفتہ میں مراسلت و مکالمت ہوگئی ہے۔ روز باتیں کرتے ہیں۔ اللہ اللہ یہ دن بھی یاد آئیں گے۔“

بنام مرزا حاتم علی مہر ۲۲ ستمبر ۱۸۵۸ء

> ”مرزا صاحب! میں نے وہ اندازِ تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلے کو مکالمہ بنادیا

ہے۔ ہزار کوس سے بہ زبانِ قلم باتیں کیا کرو۔ ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔"

بنام مرزا حاتم علی مہر اواخر نومبر ۱۸۵۸ء

" بھائی! مجھ میں تم میں نامہ نگاری کاہے کو ہے، مکالمہ ہے۔"

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ ۱۷ ستمبر ۱۸۵۸ء

" یہ میں باتیں کر رہا ہوں۔ خط نہیں لکھتا۔ مگر افسوس کہ اس گفتگو میں وہ لطف نہیں، جو مکالمۂ زبانی میں ہوتا ہے۔ یعنی میں ہی بک رہا ہوں تم کچھ نہیں کہتے۔"

بنام منشی نبی بخش حقیر ۲۱ مئی ۱۸۵۲ء

یہ چار اقتباسات اس لیے نقل کیے گئے ہیں کہ خطوط میں غالبؔ نے جو "مکالمہ" کا لفظ استعمال کیا ہے، اُسے بعض نقادوں نے ڈرامے کے ڈائیلاگ کے مفہوم میں سمجھ کر یہ ثابت کیا ہے کہ غالبؔ نے خطوط نویسی کو مکالمہ یعنی ڈائیلاگ بنا دیا ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ مکالمے سے غالبؔ کی مراد محض "گفتگو" ہے۔ جیسا کہ ان چاروں اقتباسات سے ثابت ہوتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ غالبؔ نے خطوط میں باقاعدہ مکالمے بھی لکھے ہیں مگر سینکڑوں خطوط میں سے صرف چار یا پانچ میں غالبؔ نے اپنی بات مکالمے کے انداز میں بہت خوبصورت طریقے سے کہی ہے اگر یہی باتیں بیانیہ انداز میں کہی جاتیں تو شاید ان میں وہ لطف نہ پیدا ہوتا۔ پیر جی سے غالبؔ کی جو گفتگو ہوئی تھی اُسے کس خوبصورت پیرائے میں بیان کرتے ہیں:

> "پیر جی سے جب پوچھتا ہوں کہ تم خوب شخص ہو اور وہ کہتے ہیں" کیا کہنا ہے" اور میں پوچھتا ہوں "کس کا؟" تو وہ فرماتے ہیں" مرزا شمشاد علی بیگ کا۔"
>
> اِیں، اور کسی کا نام تم کیوں نہیں لیتے؟ دیکھو یوسف علی خاں بیٹھے ہیں۔ ہیرا سنگھ موجود ہے۔
>
> واہ صاحب، میں کیا خوشامدی ہوں، جو منہ دیکھی کہوں۔ میرا شیوہ

حفظ الغیب ہے۔ غائب کی تعریف کرنی کیا عیب ہے۔

ہاں صاحب! آپ ایسے ہی وضع دار ہیں۔ اس میں کیا ریب ہے۔

بنام نواب علاء الدین خاں علائی ۹ ستمبر ۱۸۶۲ء

ایک خط میں صرف تین مکالمے ہیں۔ باقی بات کہی گئی ہے۔ غالب کہتے ہیں کہ محمد علی بیگ آئے تو میں نے اُن سے لوہارو کی سواریوں کے بارے میں پوچھا:

"بھئی محمد علی بیگ، لوہارو کی سواریاں روانہ ہوگئیں؟

حضرت! ابھی نہیں۔

کیا آج نہ جائیں گی؟

آج ضرور جائیں گی، تیاری ہو رہی ہے۔"

بنام نواب علاء الدین خاں علائی یکم جون ۱۸۶۱ء

ان مکالموں سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کی تحریروں میں شعوری کوششوں کو دخل نہیں ہے۔ خط لکھتے لکھتے مکالموں کا انداز سمجھ میں آیا اور برجستہ لکھ دیے۔ لیکن میر مہدی مجروح کے نام ایک خط میں غالب نے طویل مکالمہ لکھا ہے۔ اس مکالمے کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے "اے جناب میرن صاحب، السلام علیکم" اس مکالمے میں چوں کہ شعوری کوشش کو دخل ہے۔ اس لیے اس میں تصنع آگیا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ غالب نے اس طرح کے مکالمے اور نہیں لکھے۔

غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

اسلوب، زبان کے اس غیر روایتی اور غیر رسمی استعمال کا نام ہے جو زبان کے عام اور مخصوص معیار سے مختلف ہو۔ مثال کے طور پر اگر یہ کہا جائے کہ "اُن کا انتقال ہوگیا" تو گویا یہ زبان کا روایتی اور رسمی استعمال ہے۔ اس میں کسی کی وفات کی اطلاع دینے کے لیے مخصوص معیاری،

الفاظ سے فقرے کی ساخت ہوتی ہے۔ یہی بات جب غالؔب ان الفاظ میں لکھتے ہیں:

"ہائے ہائے وہ نہ بچی۔"

تو اس میں غالؔب کا اپنا اسلوب بھی شامل ہو گیا۔ اب یہ محض اطلاع نہیں رہی بلکہ اس میں غالؔب کی نفسیاتی، سماجی اور ادبی شخصیت بھی شامل ہے۔ مرنے والی سے غالؔب کا ذہنی رشتہ، منشی نبی بخش حقیر (جن کے نام خط میں یہ فقرہ لکھا گیا) سے غالؔب کے تعلقات، غالؔب کا احساس اور جذبہ، اس موقع پر استعمال ہونے والی مخصوص معیاری زبان سے انحراف، لفظ "ہائے" کا استعمال، اور پھر "ہائے" کی تکرار، "اس کا انتقال ہو گیا" کے بجائے "وہ نہ بچی" لکھنا۔ غرض ان سب چیزوں نے مل کر اس چھوٹے سے فقرے کو ایک اسلوب دیا ہے۔

یہاں زبان کے اُن تمام اجزا کا جائزہ لینا ممکن نہیں، جن سے اسلوب بنتا ہے مختصراً یہ کہ زبان کی مخصوص صرفی و نحوی ترتیب مفہوم کی ادائیگی کے لیے مخصوص الفاظ کا استعمال، بعض ایسے الفاظ کا استعمال جو متروک ہو گئے ہوں، یا زبان میں کم استعمال ہوتے ہوں یا تحریر میں نہیں، صرف گفت گو میں مستعمل ہوں۔ کسی دوسری زبان کے الفاظ کا استعمال، الفاظ کی تکرار، بعض کلیدی الفاظ کا بہ کثرت استعمال اور صنائع و بدائع سے مل کر کسی شاعر یا ادیب کا اسلوب بنتا ہے۔

اسلوب تحریر میں بھی ہوتا ہے اور تقریر میں بھی۔ اور دونوں کی خصوصیات ایک دوسرے سے بہت مختلف ہوتی ہیں۔ گفت گو میں قواعدِ زبان اور صرف و نحو کی پابندی اس طرح نہیں کی جاتی جس طرح تحریر میں کی جاتی ہے۔ گفتگو میں عام طور سے فقروں کی صرفی و نحوی ساخت بہت زیادہ بدل جاتی ہے، کیوں کہ بولنے والا آنکھوں اور ہاتھوں کے اشاروں اور چہرے کے اتار چڑھاؤ سے بھی اپنے مقصد کے اظہار میں مدد لیتا ہے۔ گفتگو یا تقریر میں بولنے والا کسی ایک فرد یا ایک گروہ سے مخاطب ہوتا ہے، اس لیے وہ اس فرد یا گروہ کی ذہنی

صلاحیتوں اور فہم و ادراک کی قوتوں کے پیشِ نظر الفاظ کا استعمال کرتا ہے۔ گفتگو میں جملے چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں اور ان میں صیغۂ امر، استفہامیہ اور فجائیہ جملوں اور ندائیہ الفاظ کی کثرت ہوتی ہے۔ اس کے برعکس تحریری اسلوب میں عام طور سے طویل، توضیحی اور مرکب جملے ہوتے ہیں۔

تحریر میں سوچنے، دماغ پر زور ڈالنے، الفاظ کا انتخاب کرنے، ایک فقرے یا لفظ کو قلم زد کر کے اس کا متبادل لکھنے کے مواقع فراہم ہوتے ہیں۔ جب کہ تقریر یا گفتگو میں فقروں کی ساخت الفاظ کا انتخاب، تشبیہات و استعارات وغیرہ کا استعمال برجستہ فی البدیہہ اور کچھ حد تک غیر شعوری ہوتا ہے۔ تحریر میں ذہنی مشقت کی ضرورت ہوتی ہے، جب کہ تقریر میں محنت کی ضرورت نہیں۔ بے تکلف مکتوب نگاری تحریر اور تقریر کے درمیان کی چیز ہے۔ درمیان کی چیز اس لیے کہ ایک تو خط لکھتے وقت مکتوب نگار کو اتنی ذہنی مشقت اور محنت نہیں کرنی پڑتی جتنی کہ عام نثر لکھنے میں کرنی پڑتی ہے اور دوسرے اس میں عام گفتگو کے مقابلے میں سطح کچھ بلند ہوتی ہے۔ گفتگو میں سوچ سوچ کر بولنے کا موقع نہیں ہوتا جب کہ خط لکھتے ہوئے مکتوب نگار ٹھہر ٹھہر کر اور سوچ سوچ کر لکھ سکتا ہے۔

اردو مکتوب نگاری کے دور میں غالب اوسطاً ایک دو صفحے روز خطوط کی شکل میں لکھتے تھے، لیکن اردو نثر میں دیباچے اور تقریظیں لکھتے ہوئے بہت گھبراتے تھے۔ کیوں کہ بہ قول اُن کے، اُن میں "ذہنی مشقت" کی استعداد نہیں رہی تھی۔ اگرچہ ابتدا میں غالب پسند نہیں کرتے تھے کہ اُن کے اردو خطوط شائع کیے جائیں۔ لیکن کچھ عرصے بعد وہ کوشش کر رہے تھے کہ اُن کے خطوں کا مجموعہ جلد چھپ جائے۔ ان حالات میں بھی جب خواجہ غلام غوث خاں بے خبر نے خطوطِ غالب پر دیباچہ لکھنے کی فرمائش کی تو غالب نے اپنی بیماری کا بہانہ کر کے ٹال دیا۔ کچھ دن بعد بے خبر نے پھر تقاضا کیا تو غالب جواب دیتے ہیں :

” اگر ایک بندۂ قدیم، کہ عمر بھر فرماں پذیر رہا ہو، بڑھاپے میں ایک حکم

بجا نہ لاوے، تو مجرم نہیں ہو جاتا۔ مجموعۂ نثر اردو کا انطباع اگر میرے لکھے ہوئے دیباچے پر موقوف ہے، تو اُس مجموعے کا چھپ جانا بالفتح میں نہیں چاہتا بلکہ چُھپ جانا بالضم چاہتا ہوں"۔

غالبؔ خطوط لکھنے میں غیر معمولی دلچسپی لیتے تھے۔ لیکن اردو اور فارسی نثر لکھنے سے اتنا کتراتے تھے کہ کبھی کبھی اپنے عزیز شاگردوں کو سخت سُست بھی کہہ دیا کرتے تھے۔ مرزا ہرگوپال تفتہؔ نے جب اپنے دوسرے دیوان کی تقریظ کی فرمایش کی تو غالبؔ اپنے مخصوص انداز میں لکھتے ہیں :

> "دیباچہ و تقریظ کا لکھنا ایسا آسان نہیں ہے کہ جیسا تم کو دیوان کا لکھ لینا۔ کیوں روپیہ خراب کرتے ہو اور کیوں چھپواتے ہو . . . . . اب یہ دیوان چھپوا کر اور تیسرے دیوان کی فکر میں پڑو گے تم تو دو چار برس میں ایک دیوان کہہ لوگے، میں کہاں تک دیباچہ لکھا کروں گا"۔

مکتوب نگاری غالبؔ کو اتنی پسند تھی کہ بہ قول اُن کے بیشتر وقت خط لکھنے اور پڑھنے میں صرف ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خطوط کے ذریعے بہت سے لوگوں سے رابطہ بنا رہتا اور ذہنی مشقت بھی نہ کرنی پڑتی۔ ان خطوط میں غالبؔ کی تخلیقی قوتوں کو بہت وسیع میدان مِل گیا تھا۔ ایسا میدان جس میں غالبؔ اپنی شعری صلاحیتوں کا اظہار کر کے نثر میں جادو جگا سکتے تھے۔ روزمرہ کے مسائل پر گفتگو کر سکتے تھے۔ سیاسی اور سماجی حالات پر تبصرہ کر سکتے تھے، اور مرقع کشی و کردار نگاری کے فن کا مظاہرہ کر سکتے تھے۔

اگرچہ فورٹ ولیم کالج میں اردو نثر سادہ اور سلیس ہونی شروع ہو گئی تھی لیکن نثر کی سادگی کا حسن غالبؔ ہی کے ہاتھوں نکھرا۔ غالبؔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑی سے بڑی بات کہنے پر قادر ہیں۔ ان جملوں کی ساخت سے اثر آفرینی میں اضافہ ہوتا ہے۔ غالبؔ جو بات کہنا چاہتے ہیں، وہ مخاطب کے دلنشیں ہو جاتی ہے۔ مرزا علاء الدین خاں علائیؔ کے نام

ایک خط کا یہ حصہ ملاحظہ ہو۔ اس خط میں غالب نے کیسی خوبصورت مرقع کشی کے سہارے اپنی مصیبت بیان کی ہے۔ جملے چھوٹے چھوٹے ہیں۔ جہاں حروفِ عطف کے سہارے دو جملوں کو ملایا ہے وہاں بھی عبارت میں پیچیدگی پیدا ہونے نہیں دی:

> "میاں! میں بڑی مصیبت میں ہوں۔ محل سرا کی دیواریں گر گئی ہیں۔ پاخانہ ڈھ گیا، چھتیں ٹپک رہی ہیں۔ تمھاری پھوپھی کہتی ہیں، ہائے دبی! ہائے مری۔ دیوان خانے کا حال محل سرا سے بدتر ہے۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا، فقدانِ راحت سے گھبرا گیا ہوں۔ چھت چھلنی ہے، ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔ مالک اگر چاہے کہ مرمت کرے تو کیوں کر کرے؟ مینہ کھلے تو سب کچھ ہو، اور پھر اثنائے مرمت میں بیٹھا کس طرح رہوں۔ اگر تم سے ہو سکے تو برسات تک، بھائی سے مجھ کو وہ حویلی، جس میں میر حسن رہتے تھے، اپنی پھوپھی کے رہنے کو اور کوٹھی میں سے وہ بالا خانہ مع دالانِ زیریں، جو الٰہی بخش خاں مرحوم کا مسکن تھا، میرے رہنے کو دلوا دو۔ برسات گزر جائے گی، مرمت ہو جائے گی، پھر صاحب اور میم اور بابا لوگ اپنے قدیم مسکن میں آ رہیں گے۔" ۲۷ جولائی ۱۸۶۲ء

غالب کے چھوٹے جملے عام طور سے چار لفظوں سے لے کر سات لفظوں تک کے ہوتے ہیں۔ وہ جملہ طویل ہوتا ہے، جس میں وضاحت کے طور پر فقرے شامل ہوتے ہیں۔ اس اقتباس میں جس جملے کی ابتدا "اگر تم سے ہو سکے" سے ہوتی ہے، طویل ہے۔ اس میں حویلی اور بالاخانے کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس سے کم لفظوں میں یہ وضاحت ممکن نہیں تھی اور پھر بات اس طرح کہی گئی ہے کہ مخاطب کے ذہن میں کسی طرح کی پیچیدگی پیدا نہیں ہوتی۔

غالب کے بیشتر خطوط تقریر اور تحریر کے درمیان کی چیز ہیں۔ ندائیہ الفاظ، بیانیہ اور خطیبانہ انداز اختیار کر کے غالب اپنے خطوط کو تقریر اور گفتگو سے اتنا قریب کر دیتے ہیں کہ مجلسی اور اجتماعی فضا پیدا ہو جاتی ہے اور ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ غالب مکتوب الیہ

ہی کو نہیں بلکہ بہت سے افراد کو مخاطب کر رہے ہیں۔ ایسے خطوط کی تعداد بھی خاصی ہے جنھیں پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ غالب انیسویں صدی کے مجروح، علائی یا تفتہ وغیرہ سے نہیں بلکہ براہِ راست ہم سے مخاطب ہیں۔ ان خطوط میں غالب روزمرہ، محاوروں، کہاوتوں، تشبیہوں، استعاروں، فارسی ترکیبوں اور اردو و فارسی شعروں کا استعمال اس لیے نہیں کرتے کہ انھیں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار مقصود ہے بلکہ اس لیے کرتے ہیں کہ وہ اپنی بات زیادہ سے زیادہ وضاحت کے ساتھ اور مؤثر طریقے سے مکتوب الیہ تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ اسی کوشش نے خطوطِ غالب کے ادبی حُسن کو چمکایا ہے اور اُن کی آواز میں وہ انفرادیت پیدا کی ہے کہ آج بھی ہزاروں آوازوں میں ان کی آواز اپنی شناخت قائم کی ہوئی ہے۔

اب نواب علاء الدین خاں علائی کے نام غالب کے خط کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ”کل تمھارے خط میں دو بار یہ کلمہ مرقوم دیکھا کہ دلّی بڑا شہر ہے، ہر قسم کے آدمی وہاں بہت ہوں گے۔ اے میری جان! یہ وہ دلّی نہیں ہے، جس میں تم پیدا ہوئے ہو؛ وہ دلّی نہیں ہے، جس میں تم نے علم تحصیل کیا ہے؛ وہ دلّی نہیں ہے، جس میں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آتے تھے۔ وہ دلّی نہیں ہے، جس میں سات برس کی عمر سے آتا جاتا ہوں؛ وہ دلّی نہیں ہے، جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں۔ ایک کیمپ ہے: مسلمان: اہلِ حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ۔ باقی سراسر ہنود۔ معزول بادشاہ کے ذکور، جو بقیۃ السیف ہیں، وہ پانچ پانچ روپیہ مہینا پاتے ہیں۔ اناث میں سے جو پیرزن ہیں، وہ کٹنیاں اور جوانیں کسبیاں۔ امراے اسلام میں سے اموات گنو، حسن علی خاں، بہت بڑے باپ کا بیٹا، سو روپیے روز کا پنسن دار، سو روپیے مہینے کا روزینہ دار بن کر نامرادانہ مر گیا۔ میر نصیر الدین، باپ کی طرف سے پیرزادہ، نانا اور نانی کی طرف سے امیرزادہ، مظلوم مارا گیا۔ آغا سلطان، بخشی محمد علی خاں کا بیٹا جو خود بھی

> بخشی ہو چکا تھا، بیمار پڑا۔ نہ دوا، نہ غذا، انجام کار مر گیا۔ تمہارے چچا کی سرکار سے تجہیز و تکفین ہوئی۔ احیا کو پوچھو، ناظر حسین مرزا، جس کا بڑا بھائی مقتولوں میں آیا، اُس کے پاس ایک پیسا نہیں، ٹکے کی آمد نہیں۔ مکان اگرچہ رہنے کو مل گیا ہے، مگر دیکھیے چھٹا رہے یا ضبط ہو جائے۔ بڈھے صاحب، ساری املاک بیچ کر، نوش جان کر کے، بہ یک بینی و دو گوش بھرت پور چلے گئے۔ ضیاء الدولہ کی پانسو روپے کرایے کی املاک واگذاشت ہو کر پھر قرق ہو گئی۔ تباہ، خراب لاہور گیا؛ وہاں پڑا ہوا ہے۔ دیکھیے، کیا ہوتا ہے؟ قصہ کوتاہ، قلعہ اور جھجر اور بہادر گڑھ اور بلب گڑھ اور فرخ نگر، کم و بیش تیس لاکھ روپے کی ریاستیں مٹ گئیں۔ شہر کی امارتیں خاک میں مل گئیں۔ ہنرمند آدمی یہاں کیوں پایا جاوے۔" بنام نواب علاء الدین خاں علائی ١٦ فروری ١٨٦٢ء

اس خط میں "اے میری جان" کے خطابیہ الفاظ اور پھر "وہ دلی نہیں ہے" کی پانچ بار تکرار سے گفت گو اور تقریر اور براہِ راست مخاطب کرنے کا انداز پیدا ہو گیا ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں ایسے واقعات بیان کیے گئے ہیں، جن کے لیے سینکڑوں صفحے درکار ہیں۔ حسن علی خاں، میر نصیر الدین، آغا سلطان کی وفات کی خبر مختصر لفظوں میں دی ہے۔ اس اختصار میں مرنے والے کا تعارف، اس کی سماجی حیثیت اور موت کی وجہ غرض سب ہی کچھ شامل ہے۔ مثال کے طور پر اس اقتباس کا یہ جملہ لیجیے۔ "میر نصیر الدین، باپ کی طرف سے پیرزادہ، نانا اور نانی کی طرف سے امیرزادہ، مظلوم مارا گیا۔" اس فقرے میں غالب نے میر نصیر الدین کا تعارف کراتے ہوئے بتایا ہے کہ وہ صاحبِ طریقت بھی تھا اور دولت مند بھی۔ "مظلوم مارا گیا" ان تین فقروں میں غالب نے بتایا ہے کہ ہنگامہ ١٨٥٧ء میں میر نصیر الدین بے قصور تھا۔ پھر بھی خاکیوں کی گولی کا نشانہ بنا۔ "مظلوم" کے لفظ کے استعمال سے اپنے جذبات اور احساسات اور میر نصیر الدین سے اپنی ہمدردی کا بالواسطہ طور پر کیسے مؤثر انداز میں اظہار کیا ہے۔

اس اقتباس کا ایک فقرہ اور لیجیے: "(بادشاہ کے) اناث میں سے جو پیرزن ہیں، وہ کٹنیاں اور جوانیں کسبیاں"۔ فروری ۱۸۶۲ء کی اجڑی ہوئی دلّی، خاندانِ تیموریہ کی معاشی بدحالی، برطانوی سامراج کے ظلم وستم کی داستان کو اس سے زیادہ مختصر، درد انگیز اور مؤثر انداز میں پیش نہیں کیا جاسکتا۔ غالب نے پورے خط میں ہندوستانیوں سے اپنی ہمدردی اور برطانوی سامراج کے خلاف براہِ راست ایک لفظ بھی نہیں کہا لیکن واقعات کے بیان کے لیے ایسے الفاظ کا انتخاب کیا ہے کہ غالب کے ذہنی اور روحانی کرب کو مکمل طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ یہی وہ تمام خصوصیات ہیں جنھوں نے غالب کے اسلوب کو انفرادیت بخشی ہے۔

مقفّٰی عبارتیں

جب کوئی نثر نگار خوبصورت لفظوں، ترکیبوں اور محاوروں، تشبیہوں اور استعاروں سے نثر کو رنگین اور دلکش بنانے کی کوشش کرتا ہے یا اسے مقفّٰی اور مسجع کر کے اس میں شعریت کا جادو جگانا چاہتا ہے تو عام طور سے عبارت کا مفہوم الفاظ کے اس انبار میں گم ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ مقفّٰی یا پُرتکلف عبارت لکھتے وقت الفاظ، لکھنے والے کے بس میں اتنے نہیں ہوتے جتنا خود لکھنے والا الفاظ کے بس میں ہوتا ہے۔ خوبصورت اور دلکش الفاظ کبھی کبھی لکھنے والے کے ذہن اور اس کے قلم کو بہکا کر کہیں کا کہیں لے جاتے ہیں۔

اس معاملے میں غالب بہت محتاط ہیں، انھیں چوں کہ نظم ونثر دونوں میں اظہار پر پوری قدرت حاصل ہے، اس لیے وہ اپنے ذہن کی باگ ڈور کبھی الفاظ کے ہاتھ میں نہیں دیتے۔ غالب کے ایسے اردو خطوط کی تعداد بہت کم ہے جو پورے کے پورے مقفّٰی ہوں، عام طور سے خط میں دو تین فقرے ہی مقفّٰی ہوتے ہیں اور یہ مقفّٰی فقرے ایسی برجستگی اور بے ساختگی کے ساتھ آتے ہیں کہ اُن سے نثر کے حُسن میں اضافہ اور اظہار

میں زور ہی پیدا ہوتا ہے۔ غالب نے صرف وہی خطوط مکمل طور پر مقفّیٰ عبارت میں لکھے ہیں جن میں اُن کے پاس کہنے کے لیے کوئی خاص بات نہیں ہے اور خط لکھنا ضروری ہے۔ ان خطوط میں بھی غالب یہ خیال رکھتے ہیں کہ ایسے الفاظ اور فقروں کی تعداد کم سے کم ہو، جو عبارت کو مقفّیٰ کرنے کی وجہ سے مجبوراً لکھنے پڑتے ہیں۔

چودھری عبدالغفور سرور کے نام غالب نے ایک مقفّیٰ خط لکھا ہے۔ اس کا پہلا پیراگراف ملاحظہ ہو:

> "بہت دن کے بعد پرسوں آپ کا خط آیا۔ سرنامے پر دستخط اور کے اور نام آپ کا پایا۔ دستخط دیکھ کر مفہوم ہوا، خط کے پڑھنے سے معلوم ہوا کہ تمھارے دشمن بہ عارضۂ تپ و لرزہ رنجور ہیں۔ اللہ اللہ، ضعف کی یہ شدت کہ خط کے لکھنے سے معذور ہیں۔ خدا وہ دن دکھائے کہ تمھارا خط تمھارے دستخطی آئے۔ سرنامہ دیکھ کر دل کو فرحت ہو، خط پڑھ کر دونی مسرت ہو۔ جب تک ایسا خط نہ آئے گا، دلِ سودا زدہ آرام نہ پائے گا۔ قاصدِ ڈاک کی راہ دیکھتا رہوں گا۔ جنابِ ایزدی میں سرگرمِ دعا رہوں گا۔"

اس عبارت کو پڑھنے سے محسوس نہیں ہوتا، کہ عبارت کو مقفّیٰ کرنے کی وجہ سے کچھ الفاظ یا فقرے زائد آ گئے ہیں۔ بہت کھینچ تان کے خط کشیدہ الفاظ اور فقروں کو زائد کہا جا سکتا ہے۔ قافیوں نے عبارت میں روانی اور خاص قسم کی موسیقیت پیدا کر دی ہے۔

غالب مقفّیٰ عبارت لکھتے ہوئے بھی پورا خیال رکھتے ہیں کہ اصل مقصد فوت نہ ہو جائے، اس لیے اُن کی اکثر مقفّیٰ عبارتیں ایسی ہیں کہ کچھ فقرے مقفّیٰ ہیں اور کچھ غیر مقفّیٰ۔ اس طرح عبارت بھی خوبصورت ہو گئی اور مفہوم الفاظ کی نذر بھی نہیں ہوا۔ ایک خط کا یہ حصہ ملاحظہ ہو:

> "پیر و مرشد کو میری بندگی اور صاحبزادوں کو دعا۔ خداوند مجھے مارہرہ بلاتے ہیں اور میرا قصد مجھے یاد دلاتے ہیں۔ اُن دنوں میں کہ دل بھی تھا اور

> طاقت بھی تھی، شیخ محسن الدین مرحوم سے بہ طریق تمنا کہا گیا تھا کہ جی یوں چاہتا ہے کہ برسات میں مارہرہ جاؤں اور دل کھول کر اور پیٹ بھر کر آم کھاؤں۔ اب وہ دل کہاں سے لاؤں، طاقت کہاں سے پاؤں۔ نہ آموں کی طرف وہ رغبت نہ معدے میں اتنے آموں کی گنجایش۔ نہار منہ میں آم نہ کھاتا تھا۔ کھانے کے بعد میں آم نہ کھاتا تھا۔ رات کو کچھ کھاتا ہی نہیں، جو کہوں بین الطعامین۔ ہاں، آخر روز بعد ہضم معدے، آم کھانے بیٹھ جاتا تھا۔ بے تکلف عرض کرتا ہوں اتنے آم کھاتا تھا، پیٹ اپھر جاتا تھا اور دم پیٹ میں نہ سماتا تھا۔ اب بھی اسی وقت کھاتا ہوں مگر دس بارہ۔ اگر پیوندی آم بڑے ہوئے تو پانچ سات۔"

بنام چودھری عبدالغفور سرور

اس عبارت میں بہت کم فقروں کو مقفّٰی کیا گیا ہے اور ایک لفظ بھی ایسا نہیں ہے جو قافیہ پیمائی کی وجہ سے لکھا گیا ہو۔ جن فقروں کو مقفّٰی کیا گیا ہے، اُن سے عبارت میں دلکشی اور روانی پیدا ہوئی ہے۔

غالب جس بات پر زور دینا چاہتے ہیں، اُسے کبھی کبھی مقفّٰی کر کے مکتوب الیہ کی توجہ اس بات کی طرف مبذول کراتے ہیں۔ غالب "دستنبو" کی طباعت کے لیے بہت پریشان تھے۔ خاص طور سے ان چھے سات جلدوں کی تیاری میں انھوں نے اپنا خون پسینہ ایک کر رکھا تھا جو وہ ملکۂ معظمہ اور حکامِ اعلیٰ کو مطلب برآری کے لیے بھیجنا چاہتے تھے۔ بار بار ان جلدوں کے بارے میں مرزا ہرگوپال تفتہ اور مرزا حاتم علی مہر کو لکھ رہے تھے۔ غالب کو خیال آیا کہ یہ تکرار ان حضرات کو ناگوار گزر رہی ہوگی۔ لیکن ان جلدوں کے بارے میں وہ پھر بھی بات کرنا چاہتے تھے۔ وہ انسانی نفسیات سے بہ خوبی واقف تھے۔ چنانچہ نہایت ہی خوبصورت اور دل نشیں انداز میں مزاح اور قافیہ آرائی کا سہارا لے کر بات

اس طرح کہی کہ تفتہ کو تکرار بُری بھی نہ لگے اور وہ اپنی بات بھی کہہ دیں :

> "رات سے ایک بات اور خیال میں آئی ہے مگر چوں کہ تحکم و کارفزائی ہے، کہتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ ڈرتے ڈرتے عرض کرتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ دو جلدیں طلائی لوح کی ولایت کے واسطے تیار ہوں گی اور وہ چار جلدیں، جو یہاں کے حکام کے واسطے درکار ہوں گی ......"

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ ۳۰ ستمبر ۱۸۵۸ء

دوجانے میں کسی کی شادی تھی۔ نواب علاء الدین خاں علائی نے غالب کو لکھا کہ دوجانے میں شادی کے موقع پر آپ کا انتظار تھا۔ غالب کی صحت جواب دے چکی تھی۔ اس لیے سفر کی زحمت نہیں اٹھا سکتے تھے۔ اور یوں بھی کچھ خاندانی معاملات ہوں گے، ناراض ہو گئے اور جھلّا کر ایسے دلکش انداز میں اپنی ناراضگی کا اظہار کیا کہ اُس میں حقیقتِ حال بھی ہے، مزاح بھی، غصہ بھی اور عبارت آرائی بھی۔ ملاحظہ ہو :

> "دوجانے میں میرا انتظار اور میرے آنے کا تقریبِ شادی پر مدار۔ یہ بھی شعبہ ہے انھیں ظنون کا جس سے تمہارے چچا (نواب ضیاء الدین خاں نیّر رخشاں) کو گمان ہے مجھ پر جنون کا۔ جاگیردار میں نہ تھا کہ ایک جاگیردار مجھ کو بلاتا۔ گویا میں نہ تھا کہ اپنا ساز و سامان لے کر چلا جاتا۔ دوجانے جا کر شادی کماؤں اور پھر اُس فصل میں کہ دنیا کرۂ نار ہو۔ لوہارو بھائی (نواب امین الدین خاں) کے دیکھنے کو نہ جاؤں اور پھر اس موسم میں کہ جاڑے کی گرمیِ بازار ہو۔"

بنام علاء الدین خاں علائی

مقفّیٰ عبارت کا ایک اور خط ملاحظہ ہو۔ پورے خط میں کام کی بات کی گئی ہے۔ عبارت مقفّیٰ ہے لیکن فقرہ تو کیا کوئی لفظ تک زائد نہیں ہے۔ قافیوں نے عبارت میں غیر معمولی اثر پیدا کر دیا ہے :

"جے پور کا امر محض اتفاقی ہے، بے قصد و بے فکر در پیش آیا ہے۔ ہوسناکانہ ادھر متوجہ ہوا ہوں، بوڑھا ہو گیا ہوں، بہرا ہو گیا ہوں، سرکارِ انگریزی میں بڑا پایہ رکھتا تھا، رئیس زادوں میں گنا جاتا تھا، پورا خلعت پاتا تھا۔ اب بدنام ہو گیا ہوں اور ایک بہت بڑا دھبا لگ گیا ہے۔ کسی ریاست میں دخل کر نہیں سکتا تھا مگر ہاں، استاد یا پیر یا مداح بن کر راہ و رسم پیدا کروں، کچھ آپ فائدہ اٹھاؤں، کچھ اپنے کسی عزیز کو وہاں داخل کر دوں، دیکھو کیا صورت پیدا ہوتی ہے۔

تا نہالِ دوستی کے بر دہد
حالیا رفتیم و تخمے کاشتیم

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ ۱۰ دسمبر ۱۸۵۲ء

غالب عام طور سے سادہ نثر لکھتے لکھتے دو فقروں کو مقفّٰی کر دیتے ہیں۔ یہ فقرے شعوری کوشش سے نہیں بلکہ بے ساختہ اور برجستہ قلم سے نکل جاتے ہیں، اسی لیے ان فقروں سے عبارت زیادہ بامعنی اور زیادہ مؤثر ہو جاتی ہے۔ ایسے چند فقرے ملاحظہ ہوں۔

"میرا حال بہ دستور ہے۔ دیکھیے خدا کو کیا منظور ہے"

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ ۵ مارچ ۱۸۵۸ء

"بڑا پرانا قصہ تم نے یاد دلایا۔ داغِ کہنۂ حسرت کو چمکایا"

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ ۱۹ اگست ۱۸۶۱ء

"تم تو بڑی عبارت آرائیاں کرنے لگے، نثر میں خود نمائیاں کرنے لگے"

بنام میر مہدی مجروح ۲۳ دسمبر ۱۸۵۸ء

"یعنی اگر کاپی کا قصہ تمام ہوجائے تو آپ کو آرام ہوجائے"

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ ۳ نومبر ۱۸۵۸ء

"شاہانہ آرایش ہے، آفتاب کی سی نمایش ہے"

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ ۲۰ نومبر ۱۸۵۸ء

"جناب مرزا صاحب کو میرا سلام کہیے اور یہ پیام کہیے"

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ ۳ نومبر ۱۸۵۸ء

"او میاں سید زادۂ آزادہ، دلّی کے عاشقِ دل دادہ"

بنام میر مہدی مجروح ۲۳ مئی ۱۸۶۱ء

چند اور مقفّیٰ فقرے ملاحظہ ہوں :

"غلہ گراں ہے، موت ارزاں ہے"

جو تمھارا ڈھنگ ہے، وہی میرا رنگ ہے"

کافر نعمت ہوجاؤں، اگر یہ آداب نہ بجا لاؤں"

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

غالبؔ بنیادی طور پر شاعر تھے اور شاعری میں زبان کے استعمال پر انھیں غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ اس لیے لفظ اُن کے ہاں "گنجینۂ معنی" کا طلسم ہے۔ غالبؔ کی فکر، احساس اور جذباتی کیفیتیں اُن کے ہم عصروں کے مقابلے میں زیادہ گہری اور پیچیدہ ہیں، غالبؔ کے عہد کی مروّجہ تخلیقی زبان اُن کا ساتھ نہیں دے پائی، اسی لیے اُن کے ڈکشن پر فارسی کے گہرے اثرات ہیں۔ اپنی بات کو مؤثر طریقے سے کہنے کے لیے شاعری میں غالبؔ تمثیلوں، علامتوں، تشبیہوں اور استعاروں کے استعمال میں غیر معمولی جدّت سے کام لیتے ہیں۔ اُن کی اسی شاعرانہ ادا نے اُن کے اُردو خطوط کی نثر کو بھی پُرلطف بنا دیا ہے۔ اردو میں خط لکھتے ہوئے اگرچہ غالبؔ عام بول چال اور روزمرہ کی زبان استعمال کرتے ہیں لیکن اپنی بات کہنے کے لیے وہ ایسی تشبیہوں اور استعاروں کو بھی کام میں لاتے ہیں، جن کے استعمال سے اُن کا اظہار زیادہ مؤثر، معنی خیز، تہہ دار اور شگفتہ ہو جاتا ہے۔ یہ تشبیہیں اور استعارے روایتی بھی ہوتے ہیں اور غیر روایتی بھی۔ غیر روایتی تشبیہوں اور استعاروں میں سے اکثر خود غالبؔ کی جدّت پسند طبیعت کی اپج کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

غالب ایک خط میں تفتہ کو لکھنا چاہتے ہیں کہ اُن کی صحت اتنا جواب دے چکی ہے کہ اصلاحِ شعر کا کام اب اُن کے بس کا نہیں رہا۔ اس خط میں غالب نے ایک ترکیب ”سک لمبر“ استعمال کی ہے۔ یہ دراصل (SICK NUMBER) ہے۔ ”سک لمبر“ اس فوجی کو کہتے ہیں جو اتنا بیمار ہو جائے کہ اُسے ہسپتال میں داخل کرنا پڑے یا اُسے اُس کے گھر بھیج دیا جائے۔ تنخواہ اُسے پوری ملتی ہے۔ اب غالب کے خط میں اسی ترکیب کا بطور استعارہ استعمال ملاحظہ ہو :

> ” رئیسِ رام پور سو روپیہ مہینا دیتے ہیں۔ سالِ گذشتہ اُن کو لکھ بھیجا کہ اصلاحِ نظم حواس کا کام ہے اور میں اپنے میں حواس نہیں پاتا۔ متوقع ہوں کہ اس خدمت سے معاف رہوں۔ جو کچھ مجھے آپ کی سرکار سے ملتا ہے، عوضِ خدماتِ سابقہ میں شمار کیجیے، تو میں ”سک لمبر“ سہی ورنہ خیرات خوار سہی“
>
> بنام مرزا ہرگوپال تفتہ ۱۴ دسمبر ۱۸۶۴ء

اس خط میں ”سک لمبر“ کے استعارے کے استعمال سے غالب نے اپنی سابقہ خدمات، نواب رام پور سے اپنے تعلقات اور صحت کی خرابی، غرض سب ہی کچھ بیان کر دیا ہے۔ اپنی پیرانہ سالی اور خرابیِ صحت کو دیکھتے ہوئے غالب کو یقین تھا کہ موت اُن سے بہت قریب آگئی ہے۔ تفتہ کے نام اِسی خط کے آخر میں غالب نے ”چراغ“ اور ”آفتاب“ کے استعاروں کے ذریعے اپنی حالت کا کیسا مؤثر اظہار کیا ہے۔ لکھتے ہیں :

> ” میں تو چراغِ دمِ صبح و آفتابِ سرِ کوہ ہوں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ“
>
> بنام مرزا ہرگوپال تفتہ ۱۴ دسمبر ۱۸۶۴ء

غالب کی اردو نثر میں استعاروں کا بڑا برجستہ استعمال ملتا ہے۔ غالب استعارے کی مدد سے پورا واقعہ اور اس سے متعلق اپنی ذہنی اور جذباتی کیفیت بھی بیان کر دیتے ہیں۔ ان استعاروں سے اُن کی نثر میں اختصار بھی پیدا ہو جاتا ہے اور اس تفصیل کی جانب بھی

پڑھنے والے کا ذہن منتقل ہو جاتا ہے جو غالب بیان کرنا چاہتے ہیں۔ نواب انور الدولہ شفق کو لکھتے ہیں :

> " نہ تم میری خبر لے سکتے ہو، نہ میں تم کو مدد دے سکتا ہوں۔ اللہ، اللہ، اللہ۔ دریا سارا تیر چکا ہوں، ساحل نزدیک ہے، دو ہاتھ لگائے اور بیڑا پار ہے"
>
> ۲۲ اکتوبر ۱۸۶۱ء

زندگی کے لیے 'دریا' کا استعارہ کیا خوب ہے اس سے اُن کی بات میں جدّت بھی پیدا ہو گئی اور ایجاز بھی۔ آخری عمر میں غالب بیماری اور ضعف سے تنگ آ گئے تھے۔ خطوں میں بارہا انھوں نے موت کی تمنا کا اظہار کیا ہے۔ اس عبارت میں اپنی اس دلی تمنا کا اظہار "دو ہاتھ لگائے اور بیڑا پار ہے" کہہ کر، کیسے خوبصورت انداز میں کیا ہے۔

غالب جس مکان میں رہتے تھے، اس کی حالت بہت خستہ تھی۔ ایک بار ایسی بارش ہوئی کہ تھمنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ اس بارش کی وجہ سے غالب کو جو پریشانیاں اٹھانی پڑیں، وہ اُن کی زبانی ملاحظہ ہوں :

> " جولائی سے مینہ شروع ہوا شہر میں سینکڑوں مکان گرے اور مینہ کی نئی صورت: دن رات میں دو چار بار برسے اور ہر بار اس زور سے کہ ندی نالے بہہ نکلیں۔ بالا خانے کا جو دالان میرے بیٹھنے اٹھنے، سونے جاگنے، جینے مرنے کا محل ہے، اگرچہ گرا نہیں لیکن چھت چھلنی ہو گئی۔ کہیں لگن، کہیں چلمچی، کہیں اگال دان رکھ دیا۔ قلمدان، کتابیں اٹھا کر توشہ خانے کی کوٹھڑی میں رکھ دیے۔ مالک، مرمت کی طرف متوجہ نہیں۔ کشتیِ نوح میں تین مہینے رہنے کا اتفاق ہوا۔"
>
> بنام مرزا ہرگوپال تفتہ ۱۴ اکتوبر ۱۸۶۲ء

برسات کے دنوں میں پرانے گھروں کا جو حال ہوتا ہے، اس کی صحیح کیفیت کا اندازہ یا تو نظم میں میر کی مثنوی 'در ہجوِ خانۂ خود' سے لگایا جا سکتا ہے یا پھر نثر میں غالب کے اس خط سے۔

ذرا "کشتیِ نوح" میں رہنے والے اس شخص کی ذہنی اور جسمانی اذیت کا اندازہ کیجیے جو خود نوح نہیں ہے۔

مرزا ہرگوپال تفتہ کی "سنبلستان" چھپ کر آئی۔ غالب کو اس کی طباعت بہت بری لگی۔ دیکھیے کیسے سادہ اور پرکار انداز میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں:

> "اجی مرزا تفتہ! تم نے روپیہ بھی کھویا اور اپنی فکر کو اور میری اصلاح کو بھی ڈبویا۔ ہائے، کیا بری کاپی ہے۔ اپنے اشعار اور اس کاپی کی مثال جب تم پر کھلتی کہ تم یہاں ہوتے اور بیگماتِ قلعہ کو پھرتے چلتے دیکھتے۔ صورت ماہِ دو ہفتہ کی سی اور کپڑے میلے، پائنچے لیر لیر، جوتی ٹوٹی۔ یہ مبالغہ نہیں بلکہ بے تکلف "سنبلستان" ایک معشوقِ خوبرو ہے، بدلباس ہے۔"
>
> بنام مرزا ہرگوپال تفتہ ۱۹ اپریل ۱۸۶۱ء

"سنبلستان" کے پسندیدہ اشعار کو بیگماتِ قلعہ اور اس کی ساقط المعیار طباعت کو "بدلباس معشوقِ خوبرو" سے تعبیر کرنا غالب ہی کا حصہ ہے۔

نواب کلب علی خاں نے غالب کو دو سو روپے بھیجے۔ غالب نے اس رقم سے قرض کا بوجھ اتار دیا اور اس واقعے کو یوں قلم بند کیا:

> "ان دنوں میں متفرقات کے قرض دار سرگرمِ تقاضا، بلکہ آمادۂ شور و غوغا تھے۔ دو سو روپیے کی ہنڈوی صراحیِ آبِ حیات ہو گئی۔ دامِ مرگ سے نجات ہو گئی۔"
>
> بنام نواب کلب علی خاں ۲۲ اگست ۱۸۶۵ء

آخر کے دو مقفّیٰ جملوں میں ہنڈوی کے لیے "صراحیِ آبِ حیات" کا استعارہ اور "دامِ مرگ" سے پیدا ہونے والا ایجاز یہ سب کیا کسی اچھے شعر سے کم ہیں۔

غالب سماعت بہت پہلے ہی کھو چکے تھے، رفتہ رفتہ بصارت میں بھی فرق آنے لگا۔

مسلسل بیماریوں نے اتنا نحیف و نزار کر دیا کہ اٹھنے بیٹھنے کی بھی طاقت نہ رہی۔ رام پور جانا چاہتے ہیں، مگر جائیں کیسے، بالا خانے سے نیچے اترنا، کسی طرح بھی جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ اس نقاہت کا حال اپنے مخصوص استعاراتی انداز میں یوں بیان کرتے ہیں:

> "بالا خانے پر رہتا ہوں، اتر نہیں سکتا۔ مانا کہ آدمیوں نے گود میں لے کر اتارا اور پالکی میں بٹھا دیا۔ کہار چلے۔ راہ میں نہ مرا اور رام پور پہنچ گیا۔ کہاروں نے جا کر "بے نظیر" میں میری پالکی رکھ دی۔ پالکی قفس اور میں طائرِ اسیر، وہ بھی بے پر و بال۔ نہ چل سکوں، نہ پھر سکوں۔"

بنام نواب کلب علی خاں ۱۴ اپریل ۱۸۶۷ء

غالب اپنی مصیبت کا بیان بھی کبھی کبھی مزے لے لے کر کرتے تھے۔ ایک بار اُن کے بدن پر اتنے پھوڑے ہوتے کہ چلنا پھرنا دوبھر ہو گیا۔ ان پھوڑوں نے انھیں اتنا نحیف و نزار کر دیا کہ مرتے دم تک اُن کے جسم میں طاقت نہ آ سکی۔ میاں داد خاں سیاح کو اس بیماری کی کیفیت بیان کرتے ہوتے لکھتے ہیں:

> " اشعار کی اصلاح سے میں نے ہاتھ اٹھایا۔ کیا کروں، ایک برس سے عوارضِ فسادِ خون میں مبتلا ہوں۔ بدن پھوڑوں کی کثرت سے سرو چراغاں ہو گیا ہے۔"

بنام میاں داد خاں سیاح ۱۷ اگست ۱۸۶۳ء

"عوارضِ فسادِ خوں" اور پھوڑوں کی کثرت کے ذکر کے بعد اچانک "سرو چراغاں" جیسی ترکیب غالب کی شگفتہ مزاجی اور زندہ دلی کا ثبوت ہے۔

غالب اپنی اردو نثر میں استعارے کا جس قدر استعمال کرتے ہیں، اُس سے کہیں زیادہ تشبیہہ کا استعمال اُن کے ہاں ملتا ہے۔ اُن کے خطوط سے تشبیہات کی کچھ مثالیں ملاحظہ ہوں:

> "ایک مدت سے میرا پاؤں پھل رہا تھا۔ چھوٹے چھوٹے دانے اطریقِ دائرہ کفِ پا

کے محیط تھے۔ ناگاہ جیسے ایک قوم میں سے ایک شخص امیر ہو جائے، ایک دانہ ان دانوں میں سے بڑھ گیا اور پک گیا اور پھوڑا ہو گیا۔

بنام منشی نبی بخش حقیر   اگست تا اکتوبر ۱۸۵۰ء

”بے درد (مالک مکان) نے مجھ کو عاجز کیا اور مدد لگا دی۔ وہ صحن بالا خانے کا، جس کا دو گز کا عرض اور دس گز کا طول، اس میں پاڑ بندھ گئی۔ رات کو وہیں سونا۔ گرمی کی شدت پاڑ کا قرب۔ گمان یہ گزرتا تھا کہ یہ کٹگھرہ ہے اور صبح کو مجھ کو پھانسی ملے گی۔“

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ   ۲۰ جولائی ۱۸۶۰ء

” اب اگرچہ تندرست ہوں، لیکن ناتواں اور سست ہوں۔ حواس کھو بیٹھا۔ حافظے کو رو بیٹھا۔ اگر اٹھتا ہوں تو اتنی دیر میں اٹھتا ہوں کہ جتنی دیر میں قدِ آدم دیوار اٹھے۔“

بنام نواب سعدالدین خاں بہادر شفق   ۵ فروری ۱۸۶۴ء

” لَاحَولَ وَلَاقُوَّۃَ، کس ملعون نے بہ سببِ ذوقِ شعر، اشعار کی اصلاح منظور رکھی اگر میں شعر سے بیزار نہ ہوں، تو میرا خدا مجھ سے بیزار۔ میں نے تو بہ طریقِ قہرِ درویش بہ جانِ درویش لکھا تھا۔ جیسے اچھی جورو بُرے خاوند کے ساتھ مرنا بھرنا اختیار کرتی ہے۔ میرا تمھارے ساتھ وہ معاملہ ہے۔“

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ

” آپ کی محبت دل و جاں میں اس قدر سما گئی ہے، جیسا اہلِ اسلام میں ملکہ ایمان کا۔“

بنام میر غلام بابا خاں   ۶ اپریل ۱۸۶۸ء

"ایک امیر کے ہاں پتا لگا۔ دوڑا ہوا گیا۔ کھچی موجود پائی لیکن کیا کھچی، جیسے نجف خاں کے عہد کے تورانیوں میں ہماری تمھاری ہڈی۔"

بنام نواب علاء الدین خاں علائی ۱۳ جنوری ۱۸۶۶ء

"اس قصیدے کا ممدوح شعر کے فن سے ایسا بیگانہ ہے، جیسے ہم تم اپنے اپنے مسائلِ دینی سے"

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ

"لیکن واللہ تمھارا حال اس ریگستان میں بعینہٖ ایسا ہے جیسا مسلم ابن عقیل کا حال کوفے میں تھا"

بنام علاء الدین خاں علائی ۱۳ فروری ۱۸۶۵ء

"اس نامۂ مختصر نے وہ کیا جو پارۂ ابر کشتِ خشک سے کرے"

بنام میر مہدی مجروح

"تمھارے دستخطی خط نے میرے ساتھ وہ کیا جو بوئے پیرہن نے یعقوب کے ساتھ کیا تھا۔"

بنام میر سرفراز حسین

"میں شاعرِ سخن سنج اب نہیں رہا۔ صرف سخن فہم رہ گیا ہوں۔ بوڑھے پہلوان کی طرح پیچ بتانے کی گوں ہوں۔"

بنام مرزا ہر گوپال تفتہ ۱۲ اپریل ۱۸۵۸ء

" عاشقانہ اشعار سے مجھ کو وہ بُعد ہے، جو ایمان سے کفر کو "

بنام علاء الدین خاں علائی ۲ جولائی ۱۸۶۰ء

خطوطِ غالب میں استعمال ہونے والی کچھ تشبیہات اوپر نقل کی گئی ہیں۔ یہ تشبیہات اکہری بھی ہیں، طویل اور توضیحی بھی ۔ غالب عام طور سے کسی واقعے سے متعلق اپنے جذباتی ردِ عمل اور ذہنی کیفیت کے اظہار کے لیے تشبیہہ کا استعمال کرتے ہیں۔ ایسی تشبیہات کی تعداد خاصی ہے، جو غالب نے اپنے گرد و پیش کی سماجی اور سیاسی زندگی سے اخذ کی ہیں۔ انھوں نے تشبیہات کا استعمال محض آرایشِ نثر کے لیے نہیں کیا بلکہ وہ تشبیہات کی مدد سے اظہار میں زیادہ معنویت اور اثر پیدا کرنا چاہتے ہیں۔

غالب کی ذہنی تربیت شعری اسلوب میں ہوئی تھی۔ اس لیے جب وہ نثر لکھتے ہیں تو اس میں اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو بھرپور لیکن متوازن انداز سے کام میں لاتے ہیں۔ شعر میں بات کم سے کم الفاظ میں ایجاز و اختصار کے ساتھ کہی جاتی ہے۔ شعر کی نحوی ساخت بھی عام طور سے نثر سے قدرے مختلف ہوتی ہے۔ مثلاً کبھی کبھی ایک ہی فعل کو اس طرح استعمال کیا جاتا ہے کہ اس سے ایک ساتھ دو مختلف فقروں کی تکمیل ہوتی ہے۔ غالب اردو نثر میں بھی افعال کا استعمال اس طرح کر کے اپنی نثر کو پر لطف اور دلکش بنا دیتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

" اب وہ تصویر کھینچا کریں اور تم انتظار "

بنام میر مہدی مجروح ۱۸ دسمبر ۱۸۶۰ء

" تونگر غرور سے مفلس سردی سے اکڑ رہا ہے "

"ناچار مسی بھی چھوڑ دی اور ڈاڑھی بھی"

بنام حاتم علی مہر   مارچ اپریل ۱۸۵۹ء

ایک فقرے میں فعل کی تکرار سے کیسا لطف پیدا کیا ہے

"دیکھیے یہ جبر اٹھ جائے یا یہ خود اٹھ جائیں"

بنام نواب حسین مرزا   ۹ نومبر ۱۸۵۹ء

ایک اور فقرے میں ایک فعل کی دو مختلف صورتیں ملاحظہ ہوں :

"دوسری کتاب دیکھیے، مجھ کو کیا دکھائے"

بنام منشی غلام غوث خاں بے خبر   اواخر دسمبر ۱۸۵۸ء

کبھی کبھی غالب دو فقروں میں دو مختلف باتیں کہتے ہیں اور حرفِ عطف "اور" کے ذریعے دونوں فقروں کو ملا کر ایک فقرہ بنا دیتے ہیں جس سے بیان میں شگفتگی اور اس کے ساتھ ساتھ طنز و مزاح بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ اس طرح کے فقروں کو اگر 'اور' سے نہ جوڑا جائے تو شاید لطف نہ پیدا ہو۔ خواجہ غلام غوث بے خبر کی فارسی غزل کی داد دیتے ہوئے غالب لکھتے ہیں :

> "جو ڈھنگ تازہ نوایانِ ایران کے خیال میں نہ گزرا تھا، وہ تم بروے کار لائے۔ خدا تم کو سلامت رکھے اور میرے اور دکنی جامع "برہان قاطع" کے جھگڑے میں بہ خلاف اور فارسی دانوں کے توفیقِ انصاف عطا کرے"

بنام خواجہ غلام غوث بے خبر ۱۰ جنوری ۱۸۶۶ء

غالب کی اس تحریر کا پس منظر یہ ہے کہ کسی نے غالب کو اطلاع دی تھی کہ بے خبر غالب کی "قاطع برہان" کی تردید میں ایک رسالہ لکھ رہے ہیں اور غالب کو یہ بات ناگوار گزری تھی۔

مرزا ہرگوپال تفتہ کو اپنا کلام چھپوانے کی بہت فکر رہتی تھی۔ غالب کو یہ بات شاید اس لیے پسند نہیں تھی کہ اگر شاعر اپنا سارا کلام چھپواتا رہے تو رطب و یابس بھی چھپ جاتا

ہے، جس سے شاعر کے ادبی وقار کو نقصان پہنچتا ہے۔ غالب نے کئی خطوط میں تفتہ کو لکھا ہے کہ کلام چھپوانے کی جلدی نہ کرو، لیکن تفتہ کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی۔ جب تفتہ نے "سنبلستان" کی طباعت کی اطلاع دی تو غالب جواب میں لکھتے ہیں :

> " سنبلستان کا چھاپا خدا تم کو مبارک کرے اور خدا ہی تمھاری آبرو کا نگہبان رہے"

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ ۲۰ جنوری ۱۸۶۱ء

غالب کے خطوط میں محاوروں اور کہاوتوں کا استعمال بہت کم ہوا ہے۔ کیوں کہ اس معاملے میں غالب نے ڈپٹی نذیر احمد کی طرح زبردستی ٹھونس ٹھانس نہیں کی ہے۔ انھوں نے اپنی اردو نثر میں محاورے یا کہاوت کا استعمال ہمیشہ بے ساختہ اور برجستہ طور پر کیا ہے، جس سے اُن کے نثری اسلوب میں نہ صرف شگفتگی، سلاست اور بے تکلفی پیدا ہوتی ہے بلکہ اس کی معنویت میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔

کوئی صاحب تھے، جن سے مرزا ہرگوپال تفتہ اور غالب دونوں کو غالباً کسی ادبی معاملے میں اختلاف تھا۔ غالب نے اس سلسلے میں اُن صاحب کو خط لکھا اور پھر تفتہ کے نام اپنے ایک خط میں اس خط کا ذکر کرتے ہوئے اردو کا ایک محاورہ کیا بے تکلف انداز میں استعمال کیا ہے۔ ملاحظہ ہو :

> " بہ ہر حال، وہ جو میں نے خاقانی کا شعر لکھ کر اُس کو بھیجا، اس کی ماں مرے اگر میرے اُس خط کا جواب لکھا ہو"

" اس کی ماں مرے" لکھ کر غالب نے اپنی فتح اور اُن "صاحب" کی شکست دونوں کا اعلان بڑی خوبصورتی کے ساتھ کر دیا ہے۔

کچھ اور محاوروں کا استعمال ملاحظہ ہو :

" دیکھا، اس پنسنِ قدیم کا حال؟ میں تو اس سے ہاتھ دھوتے بیٹھا ہوں؛ لیکن

جب تک جواب نہ پاؤں کہیں اور کیوں کر چلا جاؤں؟ حاکمِ اکبر کے آنے کی خبر گرم ہے۔ دیکھیے کب آئے۔ آئے، تو مجھے بھی دربار میں بلائے یا نہ بلائے۔ خلعت ملے یا نہ ملے۔ اس بیچ میں ایک اور بیچ آ پڑا ہے"

بنام میر مہدی مجروح

"لیکن ان ملاؤں اور عزائم خانوں نے تہہ توڑ دی ہے۔ کچھ نہیں جانتے اور باتیں بکھانتے ہیں"

بنام علاء الدین خاں علائی

"یہ تمھارا دُعا گو اگرچہ اور امور میں پایہ عالی نہیں رکھتا، مگر احتیاج میں اس کا پایہ بہت عالی ہے۔ یعنی بہت محتاج ہوں۔ سو دو سو میں میری پیاس نہیں بجھتی"

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ ۹ جون ۱۸۵۳ء

"مجھے تو دربار و خلعت کے لالے پڑے ہیں، تم کو پنسن کی فکر ہے"

بنام میر مہدی مجروح ۱۲ دسمبر ۱۸۵۹ء

"خزانے سے روپیہ آ گیا ہے۔ میں نے آنکھ سے دیکھا ہو تو آنکھیں پھوٹیں"

بنام میر مہدی مجروح

"حضرت کی تحریر کا ایک لفظ، سوائے "سعادت توام شاہ عالم" کے اگر پڑھا گیا ہو تو دیدے پھوٹیں، ایمان نصیب نہ ہو"

بنام چودھری عبدالغفور سرور

"اب جو کبھی مجھ کو وہ اپنا رنگ یاد آتا ہے، تو چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے"

بنام مرزا حاتم علی بیگ مہر

شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

نثر میں کبھی کبھی اشعار کا استعمال مفہوم کو زیادہ واضح اور اظہار کو زیادہ مؤثر بنا دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی بعض اوقات شعر کے استعمال سے بیان کے حسن میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ غالبؔ نے اپنے خطوط میں اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے اشعار کا استعمال کیا ہے۔ انھوں نے اپنے خطوط کی عبارتوں میں خود اپنے اشعار بھی استعمال کیے ہیں اور دوسرے شاعروں کے بھی۔ بعض اشعار ایسے بھی ہیں، جنھیں غالبؔ نے کئی بار استعمال کیا ہے۔ کہیں کہیں ایسا بھی ہوا ہے کہ انھوں نے موقع اور محل کی مناسبت سے کوئی شعر یا مصرع موزوں کر دیا ہے۔ بعض مصرعے اس روانی کے ساتھ آتے ہیں کہ گمان ہوتا ہے کہ غالبؔ کے قلم سے برجستہ نکل گئے ہیں، جس کا احساس شاید خود غالبؔ کو بھی لکھنے کے بعد ہوا ہو۔ مفہوم کی ادائیگی کے لیے کہے گئے یہ فی البدیہہ شعر عام طور سے جذبے کی آنچ، شعریت اور تاثیر سے محروم ہیں۔

یہاں غالبؔ اور دوسرے شاعروں کے اُن تمام اردو فارسی اشعار یا مصرعوں کا ذکر تو ممکن نہیں جو غالبؔ کے اردو خطوط کی عبارتوں میں جا بہ جا آتے ہیں۔ اس لیے محض چند اشعار مثال کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔ پہلے فارسی اشعار کو لیجیے۔ انوریؔ کا ایک شعر ہے:

اے دریغا نیست ممدوحے سزاوارِ مدیح
اے دریغا نیست معشوقے سزاوارِ غزل

غالبؔ نے یہ شعر تین جگہ نقل کیا ہے اور تینوں جگہ مختلف مفہوم کی وضاحت کے لیے۔ چودھری عبدالغفور سرورؔ کے نام خط میں غالبؔ نے ۱۸۵۷ء کی ناکام بغاوت میں دہلی کی بربادی کا ذکر کرتے ہوئے یہ شعر نقل کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

” رفعِ فتنہ و فساد اور بلاد میں مسلم، یہاں کوئی طرح آسایش کی نہیں ہے۔ اہلِ دہلی عموماً بُرے ٹھہر گئے، یہ داغ اُن کی جبینِ حال سے مٹ نہیں سکتا، میں اموات میں ہوں۔ مردہ شعر کیا کہے گا؟ غزل کا ڈھنگ بھول گیا، معشوق کس کو قرار دوں جو غزل کی روش ضمیر میں آوے؟ رہا قصیدہ، ممدوح کون ہے؟ ہائے انوری، گویا میری زبان سے کہتا ہے:

اے دریغا! نیست ممدوحے سزاوارِ مدیح
اے دریغا! نیست معشوقے سزاوارِ غزل

غلام حسنین قدر بلگرامی کے نام ایک خط میں غالب نے زمانے کی قدر ناشناسی کا شکوہ کیا ہے۔ شعر گوئی ترک کرنے کا سبب بیان کرتے ہوئے انوری کے اس شعر کا استعمال اس طرح کیا ہے:

” فقیر نے شعر کہنے سے توبہ کی ہے، اصلاح دینے سے توبہ کی ہے۔ شعر سننا تو ممکن ہی نہیں۔ بہرا ہوں، شعر دیکھنے سے نفرت ہے۔ پچھتر برس کی عمر، پندرہ برس کی عمر سے شعر کہتا ہوں۔ ساٹھ برس بکا۔ نہ مدح کا صلہ ملا، نہ غزل کی داد۔ بہ قول انوری:

اے دریغا! نیست ممدوحے سزاوارِ مدیح
اے دریغا! نیست معشوقے سزاوارِ غزل

سب شعرا سے اور احباب سے متوقع ہوں کہ مجھے زمرۂ شعرا میں شمار نہ کریں اور اس فن میں مجھ سے کبھی پرسش نہ ہو“

مرزا ہرگوپال تفتہ نے کسی ایسے شخص کی مدح میں قصیدہ لکھ کر غالب کو بھیجا جو شعر کے فن سے بیگانہ تھا اور بہ قول غالب ”یہ لوگ اس قابل بھی نہیں کہ ان کا نام لیجیے، چہ جائے آں کہ مدح کیجیے“۔ غالب نے تفتہ کو لکھا:

"میاں سنو! اس قصیدے کا ممدوح شعر کے فن سے ایسا بیگانہ ہے، جیسے ہم تم اپنے اپنے مسائلِ دینی سے، بلکہ ہم تم، باوجود عدمِ واقفیت امورِ دین سے نفور نہیں اور وہ شخص اس فن سے بیزار ہے۔ علاوہ اس کے وہ اتالیق کہاں؟ وہاں سے نکالے گئے۔ دلّی میں اپنے گھر بیٹھے ہوتے ہیں۔ جب سے آتے ہیں، ایک بار میرے پاس نہیں آتے نہ میں اُن کے پاس گیا۔ یہ لوگ اس لائق بھی نہیں کہ ان کا نام لیجے۔ چہ جائے آں کہ مدح کیجے۔ ہائے انوریؔ :

اے دریغا! نیست ممدوحے سزاوارِ مدیح
اے دریغا! نیست معشوقے سزاوارِ غزل"

شیخ لطیف احمد بلگرامی نے اصلاح کے لیے ایک قصیدہ بھیجا۔ غالبؔ قصیدے پر تبصرہ کرتے ہوئے انھیں سمجھانا چاہتے ہیں کہ شاہِ کونین اور دنیاوی لوگوں کی مدح ایک ہی انداز میں نہیں کرنی چاہیے۔ دونوں میں فرق کرنا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں ایک لفظ بھی نثر میں نہیں لکھا۔ صرف ایک شعر لکھ کر اپنی پوری بات سمجھا دی۔ لکھتے ہیں :

"تمھارا مسودہ آیا۔ کم تر جگہ اصلاح کی پائی۔ روشِ تحریر بھی مجھے پسند آئی، دل خوش ہوا، لیکن :

ہشدار کہ نتواں بیک آہنگ سرودن
نعتِ شہ کونین و مدیحِ کے و جم را"

غالبؔ کا ایک شعر ہے :

در کشاکشِ ضعفم نگسلد رواں از تن
ایں کہ من نمی میرم، ہم زِ ناتوانیہاست

غالبؔ نے یہ شعر اپنے ضعف اور ناتوانی کا ذکر کرتے ہوئے کم سے کم تین بار نقل کیا ہے۔ نواب انور الدولہ سعد الدین خاں شفقؔ کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :

" آپ کی پرسش کے کیوں نہ قربان جاؤں کہ جب تک میرا مرنا نہ سنا، میری خبر نہ لی۔ میرے مرگ کے مخبر کی تقریر اور مثلہ میری یہ تحریر، آدھی سچ اور آدھی جھوٹ۔ درصورتِ مرگ، نیم مردہ اور در حالتِ حیات، نیم زندہ ہوں :

درکشاکش ضعفم نگسلد رواں از تن
ایں کہ من نمی میرم، ہم زِ ناتوانیہاست"

۱۵ فروری ۱۸۶۴ء

چودھری عبدالغفور سرورؔ کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :

"درکشاکش ضعفم نگسلد رواں از تن
ایں کہ من نمی میرم، ہم زِ ناتوانیہاست

حضرت نے میری گرفتاری کا نیا رنگ نکالا۔ "بوستانِ خیال" کے دیکھنے کا دانہ ڈالا۔ مجھ میں اتنی طاقتِ پرواز کہاں کہ بلا سے اگر پھنس جاؤں، دام پر گر کے دانہ زمین پر سے اٹھاؤں۔ حضرت سچ تو یوں ہے کہ غم ہائے روزگار نے مجھ کو گھیر لیا ہے"

ابر گھرا ہوا ہے، ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے اور غالبؔ کا یہ حال ہے کہ بہ قولِ سوداؔ "بہار بے سپرِ جام و یار گزرے ہے" یعنی غالبؔ کے پاس پینے کو شراب نہیں ہے۔ اس کیفیت کا مؤثر اظہار اپنے ایک فارسی شعر کی مدد سے یوں کرتے ہیں :

"پہر دن چڑھا ہوگا کہ ابر گھر رہا ہے، ترشح ہو رہا ہے، ہوا سرد چل رہی ہے، پینے کو کچھ میسر نہیں، ناچار روٹی کھائی ہے :

افق ہا پُر از ابرِ بہمن مہی
سفالینہ جامِ من از مے تہی"

بنام خواجہ غلام غوث خاں بے خبر

میر مہدی مجروح نے غالب کو اطلاع دی کہ میرن صاحب دلی آ رہے ہیں۔ غالب جو دوستوں کی ملاقات کو ترسے ہوئے تھے، خط کے جواب کی ابتدا ان الفاظ سے کرتے ہیں :

> "کیوں یار، کیا کہتے ہو؟ ہم کچھ آدمی کام کے ہیں یا نہیں، تمھارا خط پڑھ کر دو سو بار یہ شعر پڑھا :
>
> وعدۂ وصل چوں شود نزدیک
> آتشِ شوق تیز تر گردد"

غالب کا کوئی شاگرد اُن سے اپنے اشعار پر اصلاح کی درخواست کرتا یا کوئی دوست تازہ کلام کی فرمائش کرتا اور غالب کی صحت ٹھیک نہ ہوتی تو کبھی کبھی اپنی ذہنی اور جسمانی کمزوری کا عذر پیش کر کے معذرت چاہ لیتے۔ اس طرح کے کم سے کم چار موقعوں پر غالب نے اپنا یہ فارسی شعر استعمال کیا ہے :

گمانِ زیست بود بر منت ز بیدردی
بدست مرگ ولے بدتر از گمانِ تو نیست

غالب کو بیماریوں نے گھیر رکھا ہے۔ نقاہت اور کمزوری انتہا پر ہے۔ مالی دشواریوں کا سامنا ہے۔ "قحط سالی" کے عالم میں "عشق" کو فراموش کیے اور شعر و شاعری کو ترک کیے عرصہ ہو چکا ہے۔ ایسی حالت میں جب حکیم محب علی تازہ کلام یا نثر کی فرمائش کرتے ہیں تو غالب اپنی بے بسی اور لاچاری پر تڑپ اٹھتے ہیں۔ لکھتے ہیں :

> "گمانِ زیست بود بر منت ز بیدردی
> بدست مرگ ولے بدتر از گمانِ تو نیست
>
> ہے ہے! تم اب تک یہ جانتے ہو کہ غالب شعر کہتا ہے یا کہہ سکتا ہے؟ ایک پاؤں رکاب میں، ایک ہاتھ باگ پر۔ اس صورت میں کیا کہوں گا اور کیا لکھوں گا؟ اخ مکرم و معظم نواب مصطفیٰ خاں گواہ ہیں کہ اب شعر نہیں کہتا"

غالب ایک اور خط میں لکھتے ہیں :

"گمانِ زیست بود بر منت ز بیدردی
بدست مرگ ولے بدتر از گمانِ تو نیست

مجھے زندہ سمجھتے ہو، جو نثرِ فارسی کی فرمایش کرتے ہو؟ غنیمت نہیں جانتے کہ مردہ کچھ لکھ کر بھیجتا ہے"

بنام منشی شیو نرائن آرام ۱۸ جولائی ۱۸۵۸ء

مرزا ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں :

"سبحان اللہ! تم جانتے ہو کہ میں اب دو مصرعے موزوں کرنے پر قادر ہوں، جو مجھ سے مطلع مانگتے ہو؟

گمانِ زیست بود بر منت ز بیدردی
بدست مرگ ولے بدتر از گمانِ تو نیست"

غالب کی "قاطعِ برہان" کے جواب میں مرزا رحیم بیگ نے "ساطعِ برہان" نام سے ایک کتاب لکھی۔ غالب نے ایک طویل خط کی شکل میں "ساطعِ برہان" کا جواب دیا۔ جو بہت موثر طریقے سے ایک فارسی شعر پر اس طرح اختتام پذیر ہوتا ہے :

"میں اب قطع کلام کرتا ہوں اور آپ کو بہ کمال تعظیم سلام کرتا ہوں۔ پیمبر کی تحقیر کو مسلّم رکھتے ہو۔ تم جانو اور سید ابرار۔ خاقانی پر بہتان کرتے ہو، تم جانو اور وہ میدانِ معنی کا شہ سوار۔ مجھ کو جس قدر تم نے لکھا ہے یا کوئی اور لکھ رہا ہے، اگرچہ وہ سب لغو اور جھوٹ ہے، معقول اور راست نہیں، لیکن واللہ، مجھ کو عرصۂ محشر میں اُس کی باز خواست نہیں :

زمینِ عشق، بہ کونین صلحِ کل کردیم
تو خصم باش، و زما دوستی تماشا کن"

اگست ۱۸۶۵ء

صاحبِ عالم سے کسی ادبی معاملے میں اختلاف ہو گیا۔ غالباً انھوں نے غالب کا کسی ہندوستانی فارسی شاعر سے موازنہ کر دیا یا کسی معاملے میں اُسے غالب پر ترجیح دے دی۔ غالب کو یہ بات ناگوار گزری۔ چوں کہ صاحبِ عالم کا احترام کرتے تھے، اس لیے بہت دلچسپ انداز میں صاحبِ عالم سے اُن کے اِس رویے کی شکایت کرتے ہوتے لکھتے ہیں:

"پہلے اپنا ایک شعر کمالِ گستاخی کو کار فرما کر لکھتا ہوں اور یہ نہیں لکھتا کہ یہ شعر میں نے کیوں لکھا ہے۔ شعر یہ ہے:

مرا بہ غیر زیک جنس در شمار آورد
فغاں! کہ نیست ز پروانہ فرق تا مگسش"

بنام چودھری عبدالغفور سرور

کچھ کتابیں اور کچھ شراب کی بوتلیں غالب کے ہاتھ آگئی ہیں۔ چنانچہ جمشید اور سکندر بنے ہوئے عیش کر رہے ہیں۔ اپنی اس کیفیت کا بیان میر مہدی مجروح کے نام ایک خط میں اس طرح کرتے ہیں:

"مولانا غالب علیہ الرحمۃ ان دنوں میں بہت خوش ہیں۔ پچاس ساٹھ جز کی کتاب "امیر حمزہ کی داستان" کی اور اسی قدر حجم کی ایک جلد "بوستانِ خیال" کی آگئی ہے، سترہ بوتلیں بادۂ ناب کی توشک خانے میں موجود ہیں۔ دن بھر کتاب دیکھا کرتے ہیں، رات بھر شراب پیا کرتے ہیں:

کسے کیں مرادش میسّر بود
اگر جم نہ باشد، سکندر بود" سنہ ۱۸۶۱ء

اردو اور فارسی کے کچھ شعر ایسے ہیں، جنھیں غالب نے بار بار نقل کیا ہے۔ یہ وہ اشعار ہیں، جن کی مدد سے غالب اپنے ضعف، نقاہت، بے بسی اور موت کی تمنا کے اظہار کو زیادہ مؤثر طریقے سے بیان کرتے ہیں۔ فارسی کے ایسے دو شعروں کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ اردو میں

خود غالب ہی کا ایک شعر ہے:

عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ
مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا

یہ شعر غالب نے کم سے کم چار دفعہ خود اپنی موت کے سلسلے میں استعمال کیا ہے۔ چودھری عبدالغفور سرور کو ایک خط میں غالب لکھتے ہیں:

" میں تو اب روز و شب اسی فکر میں ہوں کہ زندگی تو یوں گزری، اب دیکھیے موت کیسی ہو:

عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ
مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا

میرا ہی شعر ہے اور میرے ہی حسب حال ہے "

نواب انورالدولہ سعدالدین خاں شفق کو لکھتے ہیں:

" نہ تم میری خبر لے سکتے ہو، نہ میں تم کو مدد دے سکتا ہوں۔ اللہ، اللہ! دریا سارا تیر چکا ہوں، ساحل نزدیک ہے، دو ہاتھ لگائیے اور بیڑا پار ہے:

عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ
مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا

۲۲ اکتوبر ۱۸۶۱ء

غلام حسنین قدر بلگرامی نے خط لکھ کر غالب کے حلقۂ تلمذ میں داخل ہونے کی درخواست کی۔ غالب نے قدر بلگرامی کی یہ درخواست بہ خوشی قبول کی لیکن خط میں یہ بھی لکھا:

" باسٹھ برس کی عمر ہوئی، پچاس برس اس شیوے کی ورزش میں گزرے۔ اب جسم و جاں میں تاب و تواں نہیں۔ نثر فارسی لکھنی یک قلم موقوف، اردو،

سو اُس میں عبارت آرائی متروک، جو زبان پر آوے، وہ قلم سے نکلے۔ پاؤں رکاب میں ہے اور ہاتھ باگ پر، کیا لکھوں اور کیا کروں؟ یہ شعر اپنا پڑھا کرتا ہوں:

عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ
مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا

موت سے کچھ عرصے پہلے غالبؔ نے صوفیؔ منیری کو جو خط لکھا تھا، اس میں اپنی ضعیفی اور صحت کی خرابی کا ذکر قدرے تفصیل سے کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اِکہتر برس کی عمر، پاؤں سے اپاہج، کانوں سے بہرا، دن رات پڑا رہتا ہوں۔ دو سطریں لکھیں، بدن تھرّایا، حرف سوجھنے سے رہا، قوتیں ساقط، حواس مختل، غذا قلیل بلکہ اقل:

عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ
مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا"

غالبؔ نے اپنی ضعیفی، کمزوری اور بیماریوں کا ذکر اکثر شاعرانہ انداز میں کیا ہے۔ وہ اس موقع پر بہت خوبصورت اور برجستہ استعارے اور تشبیہیں استعمال کرتے ہیں۔ اپنے ایک شاگرد منشی میاں داد خاں سیاحؔ کے نام خط میں اپنی صحت کی خرابی کا ذکر بڑے خوبصورت انداز میں کیا ہے۔ اور آخر میں ذوقؔ کا شعر نقل کر کے اپنی بات اور ذوقؔ کے شعر دونوں کو مؤثر بنا دیا ہے:

"ناتوانی زور پر ہے، بڑھاپے نے نکما کر دیا ہے۔ ضعف، سُستی، کاہلی، گراں جانی، گرانی، رکاب میں پاؤں ہے، باگ پر ہاتھ ہے۔ بڑا سفر دور دراز در پیش ہے۔ زادِ راہ موجود نہیں۔ خالی ہاتھ جاتا ہوں۔ اگر ناپرسیدہ بخش دیا تو خیر، اگر باز پرس ہوئی تو سقر مقر ہے اور ہاویہ زاویہ ہے۔

دوزخِ جاوید ہے اور ہم ہیں۔ ہائے کسی کا کیا اچھا شعر ہے:

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے "

۳۱ دسمبر ۱۸۶۰ء

ایک خط میں طولِ عمر سے پیدا ہونے والی اپنی بیماریوں کا ذکر کر کے، میر تقی میر کا شعر بڑے برجستہ طور پر استعمال کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

" خِرف ہوں، پوچ ہوں، ہیچ ہوں، عاصی ہوں، فاسق ہوں، روسیاہ ہوں، یہ شعر میر تقی میر کا میرے حسبِ حال ہے:

مشہور ہیں عالم میں، مگر ہوں بھی کہیں ہم
القصہ نہ درپے ہو ہمارے کہ نہیں ہم

بنام منشی حبیب اللہ خاں ذکا

جون ۱۸۵۸ء میں حکومت نے طے کیا کہ پنشن داروں کو پنشن ماہ بہ ماہ ملنے کے بجائے سال میں دو بار ملا کرے گی۔ اخراجات کے مقابلے میں غالب کی آمدنی یوں بھی محدود تھی۔ اس حکم نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ غالب حکومت کے اس فیصلے کی اطلاع تفتہ کو بڑے دلچسپ انداز میں دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

" اب میری کہانی سنو۔ آخر جون میں صدر پنجاب سے حکم آگیا کہ پنسن دارانِ قدیم ماہ بہ ماہ نہ پائیں، سال میں دو بار بہ طریقِ شش ماہہ فصل بہ فصل پایا کریں۔ ناچار، ساہوکار سے سود کاٹ کر روپیہ لیا گیا تا رام پور کی آمد میں مل کر صرف ہو۔ یہ سود چھے مہینے تک اسی طرح کٹواں دینا پڑے گا۔ ایک معقول رقم گھاٹے میں جائے گی:

رسم ہے مردے کی چھماہی ایک
خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو کہ ہوں بہ قیدِ حیات
اور چھماہی ہو سال میں دوبار "

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ ۲۰ جولائی ۱۸۶۰ء

غالب نے زندگی کے تمام نشیب و فراز دیکھے۔ ہر ممکن مصائب و آلام کا سامنا کیا لیکن انتہائی ناکامی اور مایوسی میں بھی انھوں نے حالات سے شکست نہیں کھائی۔ مرزا ہرگوپال تفتہ مالی دشواریوں سے تنگ آکر گوشہ نشینی اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے غالب کو اپنے اس ارادے سے آگاہ کیا تو ہر حال میں زندہ رہنے کا سلیقہ رکھنے والے غالب جواب دیتے ہیں :

"کیوں ترکِ لباس کرتے ہو؟ پہننے کو تمھارے پاس ہے کیا جس کو اتار کر پھینکوگے۔ ترکِ لباس سے قیدِ ہستی مٹ نہ جائے گی۔ بغیر کھائے پیے گزارا نہ ہوگا۔ سختی و سُستی، رنج و آلام کو ہموار کردو۔ جس طرح ہو اسی صورت سے، بہ ہر صورت گزرنے دو :

تاب لائے ہی بنے گی غالب
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز "

جنوری ۱۸۶۶ء

چودھری عبدالغفور سرور کے نام ایک خط میں صاحب عالم سے خطاب کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"حضرت! سچ تو یوں ہے کہ غم ہائے روزگار نے مجھ کو گھیر لیا ہے، سانس نہیں لے سکتا، اتنا تنگ کردیا ہے۔ ہر بات سو طرح سے خیال میں

آئی، پر دل نے کسی طرح تسلی نہ پائی۔ اب دو باتیں سونچا ہوں۔ ایک تو یہ کہ جب تک جیتا ہوں، یوں ہی رویا کروں گا، دوسری یہ ، آخر ایک نہ ایک دن مروں گا۔ یہ صغریٰ و کبریٰ دل نشیں ہے، نتیجہ اس کا تسکیں ہے۔ ہیہات :

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید
نا امیدی اس کی دیکھا چاہیے"

ایک جگہ غالب کہنا چاہتے ہیں کہ ہم لوگ لاکھ بُرے سہی، پھر بھی اس زمانے میں غنیمت ہیں۔ مصحفی کے شاگرد منتظر کا ایک شعر نقل کر کے بڑے دلکش انداز میں یہ بات کہی ہے۔ لکھتے ہیں :

" میاں ! یہ ہم تم بوڑھے ہیں یا جوان ہیں۔ توانا ہیں یا ناتواں ہیں، بڑے بیش قیمت ہیں، یعنی بہ ہر حال غنیمت ہیں۔ کوئی جلا بھنا کہتا ہے :

یادگارِ زمانہ ہیں ہم لوگ
یاد رکھنا فسانہ ہیں ہم لوگ"

بنام میر سرفراز حسین

تصور کیجیے ۱۸۵۷ء کا ناکام انقلاب اپنی خوں آشامیوں کے ساتھ غالب کی نگاہوں کے سامنے سے گزر کر چکا ہے۔ بے شمار عزیز، دوست اور آشنا موت کی نذر ہو چکے ہیں۔ حالات ابھی تک معمول پر نہیں آتے ہیں۔ ہر چیز غیر یقینی دکھائی دیتی ہے۔ مستقبل کا کوئی نقشہ آنکھوں کے سامنے نہیں ہے۔ غالب نے خود اپنے ایک شعر سے اس کیفیت کا کیسا مؤثر اظہار کیا ہے۔ لکھتے ہیں :

" تمہاری والدہ کا مرنا سُن کر مجھ کو بڑا غم ہوا۔ خدا تم کو صبر دے اور اُس عفیفہ کو بخشے۔ میرا حقیقی بھائی مرزا یوسف خاں دیوانہ بھی مر گیا۔ کیسا پنسن اور

کہاں اُس کا ملنا۔ یہاں جان کے لالے پڑے ہیں :

ہے موجزن اک قلزمِ خوں، کاش یہی ہو
آتا ہے ابھی دیکھیے، کیا کیا مرے آگے“

مرقع نگاری

اگرچہ خطوطِ غالب میں مرقع نگاری کے نمونے بہت کم ہیں، لیکن جو دو چار نمونے ملتے ہیں، وہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ اردو میں خاکہ نگاری کے ابتدائی نقوش بھی خطوطِ غالب ہی میں ملتے ہیں۔ غالب مختصر الفاظ سے ایسا مرقع پیش کرتے ہیں کہ پوری تصویر اور صاحبِ تصویر کا کردار ہمارے سامنے آجاتا ہے۔

غالب جب رام پور میں تھے تو نواب کلب علی خاں کی شخصیت نے انھیں بہت متاثر کیا۔ علائی کو اپنے تاثرات ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں :

> ”رئیس کی تصویر کھینچتا ہوں : قد، رنگ، شکل، شمائل، بعینہٖ بھائی ضیاء الدین خاں۔ عمر کا فرق، اور کچھ کچھ چہرہ اور لحیہ متفاوت۔ حلیم و خلیق، باذل، کریم، متواضع، متشرع، متورع، شعرفہم، سینکڑوں شعر یاد۔ نظم کی طرف توجہ نہیں، نثر لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں۔ جلالاے طباطبائی کی طرز برتتے ہیں۔ شگفتہ جبیں ایسے کہ اُن کے دیکھنے سے غم کوسوں بھاگ جائے۔ فصیح بیان ایسے کہ اُن کی تقریر سُن کر ایک اور نئی روح قالب میں آئے۔
> اَللّٰھُمَّ دَامُ اِقبالہٗ وَ زادِ اُجلالہٗ“

بنام علاء الدین خاں علائی ۶ دسمبر ۱۸۶۵ء

اس مختصر سی تحریر میں غالب نے نواب کلب علی خاں کی پوری شخصیت : چہرہ مہرہ واخلاق، شعرفہمی، نثر نگاری اور تقریر غرض ہر چیز اس طرح بیان کی ہے کہ نواب صاحب کی

پوری شخصیت اور ان کا کردار ہمارے سامنے آگیا ہے۔

میر مہدی مجروح کے ایک دوست حکیم میر اشرف علی پہلی بار غالب سے ملاقات کو آئے۔ غالب کو حکیم صاحب بہت پسند آئے۔ اُن سے اپنی ملاقات کا حال جس دلکش انداز میں بیان کیا ہے اسے آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

> "کل دوپہر ڈھلے، ایک صاحب اجنبی، سانولے سلونے، ڈاڑھی منڈے، بڑی بڑی آنکھوں والے تشریف لائے۔ تمھارا خط دیا، صرف اُن کی ملاقات کی تقریب میں تھا۔ بارے، اُن سے اسمِ شریف پوچھا گیا، فرمایا، اشرف علی۔ قومیت کا استفسار ہوا، معلوم ہوا سید ہیں۔ پیشہ پوچھا، حکیم نکلے۔ یعنی حکیم میر اشرف علی۔ میں اُن سے مِل کر بہت خوش ہوا۔ خوب آدمی ہیں اور کام کے آدمی ہیں۔"

بنام میر مہدی مجروح

غالب کی ایک ملازمہ تھیں بی وفادار۔ بہت دلچسپ شخصیت کی مالک۔ علائی کے نام ایک خط میں غالب نے اُن کی شخصیت کا بہت دلکش خاکہ کھینچا ہے۔ لکھتے ہیں:

> "بی وفادار، جن کو تم کچھ اور بھائی خوب جانتے ہیں، اب تمھاری پھوپھی نے انھیں "وفادار بیگ" بنا دیا ہے۔ باہر نکلتی ہیں، سودا تو کیا لائیں گی مگر خلیق اور ملنسار ہیں، رستہ چلتوں سے باتیں کرتی پھرتی ہیں۔ جب وہ محل سے نکلیں گی، ممکن نہیں کہ اطرافِ نہر کی سیر نہ کریں گی، ممکن نہیں کہ دروازے کے سپاہیوں سے باتیں نہ کریں گی، ممکن نہیں کہ پھول نہ توڑیں اور بی بی کو لے جا کر نہ دکھائیں اور نہ کہیں کہ "یہ پھول تائی چچا کے بیٹے کی کائی کی ایں"۔ شرح: تمھارے چچا کے بیٹے کی کیاری کے ہیں۔"

بنام نواب علاء الدین خاں علائی ۶ اگست ۱۸۶۲ء

اِک ذرا چھیڑیے، پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

غالب کے مصائب و آلام کی داستان اُس وقت سے شروع ہوتی ہے جب کہ وہ ابھی نوجوان تھے. عمر کے ساتھ ساتھ اُن کی مصیبتوں میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ پنشن کے مقدمے میں اُن کی شکست، دو دفعہ کا حادثۂ اسیری، ۱۸۵۷ء کا ناکام انقلاب اور اُس میں بے شمار دوستوں، عزیزوں اور شاگردوں کا قتل، جو باقی بچے تھے، اُن کی مفارقت، زندگی بھر کی تنگدستی اور بڑھاپے کی مسلسل بیماریاں غالب جیسے حساس انسان کو پاگل کر دینے یا کم سے کم انھیں دنیا سے متنفر کر دینے اور قنوطی بنانے کے لیے کافی تھیں لیکن زندگی کے آخری دنوں تک غالب کے ہوش و حواس اس لیے قائم رہے کہ ان میں غیر معمولی قوتِ ارادی تھی جس کی وجہ سے انھوں نے زندگی کے ساتھ مکمل طور پر مفاہمت کر لی تھی. یہ صرف اُن کا خیال ہی نہیں بلکہ عقیدہ تھا کہ زندگی کا پودا حقیقی معنوں میں غم اور خوشی کی دھوپ چھاؤں میں ہی پروان چڑھتا ہے اور اِن میں بھی دھوپ یعنی غم کو ہی خوشی پر فوقیت اور برتری حاصل ہے۔ غالب کا ایک شعر ہے:

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں

اس شعر میں محض شاعرانہ مضمون نہیں باندھا گیا بلکہ یہ غالب کی زندگی کی تفسیر ہے۔ غالب زندگی اور اُس کے مسائل کو ایک باشعور اور دانشور انسان کی حیثیت سے دیکھتے ہیں، اسی لیے مسلسل مایوسیوں اور ناکامیوں سے تنگ آکر انھوں نے زندگی سے فرار حاصل نہیں کیا۔ زندگی کے مصائب و آلام نے اُن کی فکر میں بالیدگی پیدا کی اور اُن میں زندہ رہنے کا عزم اور حوصلہ جگایا اور وہ صبر و تحمل اور استقلال پیدا کیا جو ہر کڑی سے کڑی مصیبت کو ہنس کر جھیلنا سکھاتا ہے۔ ایسا ہی آدمی یہ شعر کہہ بھی سکتا تھا:

تاب لائے ہی بنے گی غالب
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

غالب نے "جانِ عزیز" کے لیے آرزو اور شکست آرزو، خوشی اور غم، کامیابی اور ناکامی کے درمیان زندہ رہنے کا سلیقہ سیکھ لیا تھا۔ اسی لیے تو وہ اپنے آپ کو "ہدفِ ستم ہائے روزگار" نہیں بلکہ "رہینِ ستم ہائے روزگار" کہتے ہیں۔ اس "ستم ہائے روزگار" سے اُن کی زندہ دلی اور بذلہ سنجی اور ان کی حسِ مزاح ماند نہیں پڑی بلکہ اور تیکھی ہوتی چلی گئی۔ ایک حقیقی مزاح نگار کی طرح غالب زندگی کی اُن تمام ناہمواریوں اور کھردرے پن پر سے ہنستے ہوئے برہنہ پا گزر جاتے ہیں، جن پر چلتے ہوئے پاؤں لہولہان ہو جاتے ہیں۔ زندگی کے تضادات کا احساس اور عرفان ہی ان تضادات کی نشتریت بھی ہے اور اس نشتریت کا اندازہ غالب نے ہمیں اپنی تحریروں میں خوب خوب کرایا ہے۔ غالب کے مزاح میں پھکڑپن نہیں بلکہ زندگی کی بصیرتوں کا اور اس کی تلخ اور شیریں حقیقتوں کا، تلخ زیادہ اور شیریں کم، حوصلہ مندانہ اور برملا اظہار ہے۔ غالب کے طنز اور اُن کی شوخیِ طبع دونوں کا سرچشمہ زندگی کی محرومیاں اور غم و آلام ہیں۔ اسی لیے اُن کا مزاح توانا اور جاندار ہے۔

غالب خط لکھتے ہوئے کوشش کرتے ہیں کہ اپنی مصیبتوں کے بیان سے دوسروں کو بے وجہ پریشان نہ کریں۔ وہ اپنے دکھڑے بڑے چسکے لے لے کر بیان کرتے ہیں۔ میر سرفراز حسین کے نام خط میں اپنی تنہائی کا ماتم کرتے ہیں، ان دوستوں کا ذکر کرتے ہیں، جنھیں انقلابِ زمانہ نے اُن سے جدا کر دیا۔ پھر ایک دم بات کا رُخ بدلتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "اللہ، اللہ، اللہ، ہزاروں کا میں ماتم دار ہوں، میں مروں گا تو مجھ کو کون روئے گا۔
> سنو غالب! رونا پیٹنا کیا، کچھ اختلاط کی باتیں کرو۔"

غالب کی ساری زندگی اپنی اَنا کی نگہداری میں گزری۔ لیکن عملی زندگی میں جب غالب کی اَنا بادِ حوادث کے تھپیڑے کھاتی ہے تو غالب اپنا مذاق اڑانے سے بھی باز نہیں آتے۔

مرزا قربان علی بیگ خاں سالک کو اپنے بارے میں لکھتے ہیں :

"یہاں خدا سے بھی توقع باقی نہیں، مخلوق کا کیا ذکر، کچھ بن نہیں آتی۔ اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں، رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں، یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کیا ہے۔ جو دکھ مجھے پہنچتا ہے، کہتا ہوں کہ لو، غالب کے ایک اور جوتی لگی۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی داں ہوں، آج دور دور تک میرا جواب نہیں۔ لے، اب تو قرض داروں کو جواب دے۔ سچ تو یوں ہے کہ غالب کیا مرا، بڑا ملحد مرا، بڑا کافر مرا۔ ہم نے از راہِ تعظیم، جیسا بادشاہوں کو بعد اُن کے "جنت آرام گاہ" و "عرش نشیمن" خطاب دیتے ہیں، چوں کہ یہ اپنے کو "شاہِ قلمروِ سخن" جانتا تھا، "سقر مقر" اور "ہاویہ زاویہ" خطاب تجویز کر رکھا ہے۔

آئیے، نجم الدولہ بہادر ایک قرض دار کا گریبان میں ہاتھ، ایک قرض دار بھوگ سنا رہا ہے۔ میں اُن سے پوچھ رہا ہوں۔ اجی، حضرت نواب صاحب کیسے، اوغلان صاحب! آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں، یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے، کچھ تو اکسو، کچھ تو بولو۔ بولے کیا بے حیا، بے غیرت، کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے آم، صراف سے دام قرض لیے جاتا ہے۔ یہ بھی تو سونچا ہوتا، کہاں سے دوں گا۔"

ں خط میں غالب کی اَنا کے شیش محل کے چکنا چور ہونے کی جھنکار صاف سنائی دے رہی ہے۔ بہ ظاہر غالب نے اپنی کمزوریوں، معاشی بدحالیوں اور محرومیوں کا مضحکہ اڑایا ہے، لیکن اس بذلہ سنجی اور شوخیِ بیان کی تہہ میں ناقابلِ بیان ذہنی کرب اور محرومی کا شدید احساس ہے۔ یہ صرف غالب کی داستان نہیں بلکہ ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب کے بعد کے اس پورے طبقے کی داستان ہے، جو کبھی مسندِ اعتبار پر جلوہ افروز تھا، جسے سلجوقی اور افراسیابی ہونے

پرناز تھا، جسے اپنی ذہنی صلاحیتوں پر گھمنڈ تھا اور جو اب قرض پر زندگی بسر کر رہا تھا۔

کامیاب ترین طنز وہی ہے جس کا شکار طنز نگار کی اپنی ذات ہو۔ کوئی دوسرا شخص ایسی بے رحمی سے غالب کا مذاق نہیں اڑا سکتا تھا جیسا کہ اس خط میں خود غالب نے اپنا مذاق اڑایا ہے۔

غالب نے نواب علاء الدین خاں علائی کے نام ایک خط میں اپنی غربت اور معاشی بدحالی کا اس طرح مضحکہ اڑایا ہے:

> " بھائی کو سلام کہنا اور کہنا کہ صاحب وہ زمانہ نہیں کہ اِدھر متھرا داس سے قرض لیا، اُدھر درباری مل کو مارا، ادھر خوب چند چین سکھ کی کوٹھی جا لوٹی۔ ہر ایک پاس تمسک مہری موجود۔ شہد لگاؤ، چاٹو۔ نہ مول نہ سود۔ اس سے بڑھ کر یہ بات کہ روٹی کا خرچ بالکل پھوپھی کے سر۔ بااین ہمہ کبھی خان نے کچھ دے دیا، کبھی الور سے کچھ دلوا دیا، کبھی ماں نے کچھ آگرے سے بھیج دیا۔ اب میں اور باسٹھ روپیے آٹھ آنے کلکٹری کے، سو روپیے رام پور کے۔ قرض دینے والا ایک میرا مختار کار۔ وہ سود ماہ بہ ماہ لیا چاہے۔ مول میں قسط اس کو دینی پڑے۔ انکم ٹیکس جدا، چوکی دار جدا، سود جدا، مول جدا، بی بی جدا، بچے جدا، شاگرد پیشہ جدا، آمد وہی ایک سو باسٹھ۔ تنگ آگیا۔ گزارا مشکل ہوگیا۔ روز مرہ کا کام بند رہنے لگا۔ سونچا کہ کیا کروں، کہاں سے گنجایش نکالوں؟ قہر درویش بہ جانِ درویش، صبح کی تبرید؟ متروک چاشت کا گوشت آدھا، رات کی شراب و گلاب موقوف۔ بیس بائیس روپیہ مہینا بچا۔ روز مرہ کا خرچ چلا۔ یاروں نے پوچھا تبرید و شراب کب تک نہ پیو گے؟ کہا گیا کہ جب تک وہ نہ پلائیں گے۔ پوچھا، کہ نہ پیو گے تو کس طرح جیو گے؟ جواب دیا کہ جس طرح وہ جلائیں گے۔ بارے مہینا پورا نہیں گزرا تھا کہ

> رام پور سے علاوہ وجہ مقرری اور روپیہ آگیا، قرض مقسط ادا ہوگیا، متفرق رہا، خیر رہو۔ صبح کی تبرید، رات کی شراب جاری ہوگئی، گوشت پورا آنے لگا۔"
>
> ۲۷ جولائی ۱۸۶۲ء

مزے لے لے کر اپنی پریشانیوں اور مصیبتوں کا ذکر کرنے کے لیے بہت بڑا کلیجا چاہیے لیکن اپنی بات میں تاثیر محض کلیجے کے زخم بیان کر دینے سے نہیں پیدا ہو جاتی اس کے لیے کلیجا چیر کر دکھانا پڑتا ہے اور غالب ہم کو اپنا 'طرف دار' بنانے کے لیے یہی تو کرتے ہیں۔

غالب کی صرف بڑھاپے کی تصویریں ہم تک پہنچی ہیں۔ ان تصویروں سے اندازہ ضرور ہو جاتا ہے کہ جوانی میں وہ بہت وجیہہ اور خوبصورت آدمی رہے ہوں گے۔ غالب کی جوانی کا حلیہ انھیں کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:

> "میرا قد بھی درازی میں انگشت نما ہے۔۔۔ جب میں جیتا تھا تو میرا رنگ چمپئی تھا اور دیدہ ور لوگ اُس کی ستایش کرتے تھے۔ اب جو کبھی وہ اپنا رنگ یاد آتا ہے تو چھاتی پر سانپ سا پھر جاتا ہے۔"
>
> بنام مرزا حاتم علی مہر   مارچ اپریل ۱۸۵۹ء

بڑھاپے کا آغاز ہوا، نوجوانی کے ساتھ ساتھ چہرے اور جسم کا حسن بھی رخصت ہونے لگا، ڈاڑھی اور مونچھ میں بھی سفید بال آنے لگے، دانت ٹوٹنے شروع ہو گئے، غالب نے مرزا حاتم علی مہر کے نام خط میں بدلتے ہوتے حلیے کا نہ صرف مضحکہ اڑایا ہے بلکہ اپنی شخصیت کی انفرادیت کا بھی اظہار کیا ہے۔ غالب لکھتے ہیں:

> "جب ڈاڑھی مونچھ میں سفید بال آگئے، تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ ناچار مسی بھی چھوڑ دی اور ڈاڑھی بھی، مگر یہ یاد رکھیے کہ اس بھونڈے شہر میں ایک وردی ہے عام، ملا، حافظ، بساطی، نیچہ بند، دھوبی، سقا،

بھٹیارہ، جولاہا، کنجڑا، منہہ پر ڈاڑھی سر پر بال۔ فقیر نے جس دن ڈاڑھی رکھی، اُسی دن سر منڈوایا۔"

بنام مرزا حاتم علی مہر   مارچ اپریل ۱۸۵۹ء

غالب کی ذاتی زندگی تو رنج والم کی ایک داستان تھی ہی، اُن کا پورا معاشرہ بھی غم اور افسردگی کا شکار تھا۔ قتل، غارت گری، لوٹ مار اور ان سب کا نتیجہ بربادی، ویرانی اور بے رونقی۔ ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب میں غالب موت کا شکار ہونے سے بچ گئے لیکن انھیں موت سے بڑی سزا ملی، یعنی اُن جیسے حساس انسان کو اُن تمام خونیں واقعات کا پہلے خاموش تماشائی اور پھر اجڑی ہوئی دلّی کا ماتم دار بننا پڑا۔ اپنے ماحول اور معاشرے کی بربادی اور تباہی پر غالب خون کے آنسو روئے ہیں لیکن انھوں نے صبر و ضبط سے بھی کام لیا ہے۔ حادثات کی ان تند و تیز آندھیوں میں بھی انھوں نے اپنی شوخی و ظرافت اور حسِ مزاح کے چراغ کو بجھنے نہیں دیا۔ غالب اگر خون کے آنسو بہاتے ہیں تو اپنے قہقہوں سے دوسروں میں زندہ رہنے کا حوصلہ بھی پیدا کرتے ہیں۔ مرزا حاتم علی مہر نے غالب کے نام کئی خطوں میں حُزن و ملال کا اظہار کیا۔ دیکھیے غالب کیسے دلچسپ انداز میں انھیں صبر و تحمل کی تلقین کرتے ہیں:

> " بندہ پرور! آپ کا خط کل پہنچا۔ آج جواب لکھتا ہوں۔ داد دینا کتنا شتاب لکھتا ہوں۔ مطالبِ مندرجہ کے جواب کا بھی وقت آتا ہے۔ پہلے تم سے یہ پوچھا جاتا ہے کہ برابر کئی خطوں میں تم کو غم و اندوہ کا شکوہ گزار پایا ہے۔ پس، اگر کسی بے درد پر دل آیا ہے، تو شکایت کی کیا گنجایش ہے، بلکہ یہ غم تو نصیبِ دوستاں درخورِ افزایش ہے۔ بہ قول غالب علیہ الرحمتہ:
>
> کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو
> نہ ہو جب دل ہی پہلو میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

بنام مرزا حاتم علی مہر   نومبر ۱۸۵۸ء

اس خط کے پہلے ہی فقرے سے غالب نے شوخی وظرافت کی فضا بنا کر مہر کا غم ہلکا کرنے کی کوشش کی ہے اور پھر غمِ جاناں کے بارے میں ایک فلسفہ بیان کر کے ضبط اور حوصلے کی تلقین کی ہے۔ اُن کی بات میں کہیں سے سنجیدگی کا شائبہ بھی نہ پیدا ہوا اس کے لیے خط کی عبارت کو بھی مقفیٰ کر دیا۔

غالب فطرتاً ظریف الطبع ہیں۔ وہ معمولی معمولی چیزوں میں ہنسنے اور ہنسانے کا موقع نکال لیتے ہیں۔ یوسف مرزا کے نام ایک خط میں غالب نے حافظ ممو کے مقدمے کے واقعات اس طرح لکھے ہیں:

> "ایک لطیفہ پرسوں کا سنو! حافظ ممو بے گناہ ثابت ہو چکے، رہائی پا چکے۔ حاکم کے سامنے حاضر ہوا کرتے ہیں، املاک اپنی مانگتے ہیں قبض وتصرف اُن کا ثابت ہو چکا ہے۔ صرف حکم کی دیر۔ پرسوں وہ حاضر ہیں، مسل پیش ہوئی۔ حاکم نے پوچھا حافظ محمد بخش کون؟ عرض کیا کہ "میں"۔ پھر پوچھا کہ حافظ ممو کون؟ عرض کیا کہ "میں۔ اصل نام میرا محمد بخش ہے۔ ممو، ممو مشہور ہوں" فرمایا، یہ کچھ بات نہیں، حافظ محمد بخش بھی تم، حافظ ممو بھی تم، سارا جہاں بھی تم، جو کچھ دنیا میں ہے، وہ بھی تم۔ ہم مکان کس کو دیں۔ مسل داخلِ دفتر ہوئی، میاں ممو اپنے گھر چلے آئے"

بنام یوسف مرزا   جون، جولائی ۱۸۵۹ء

ظرافت اور مکالمہ آرائی سے غالب نے پورے واقع کی بڑی دلچسپ تصویر کھینچ دی ہے۔ اس واقعہ سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ انگریزوں کے ظلم وستم صرف ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب تک محدود نہیں رہے بلکہ بعد میں بھی وہ بہانے بنا کر ہندوستانیوں پر ظلم کرتے رہے "مسل داخلِ دفتر ہوئی، میاں ممو اپنے گھر چلے آئے" ان دو چھوٹے چھوٹے فقروں میں

ہندوستانیوں کی بے بسی اور لاچاری کا کیا خوبصورت اظہار کیا گیا ہے۔ ناانصافیوں کی اس داستان کو لطیفہ بنا کر پیش کرنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اس خط کے آغاز میں غالب نے مرزا یوسف کے لڑکے کی وفات پر تعزیتی کلمات لکھے تھے۔ پھر غالب نے یوسف مرزا کے ماموں سید یوسف الدین حیدر کے حکم دوامِ حبس کا ذکر کیا تھا۔ غالب پر ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب کے دوران بہادر شاہ ظفر کا سکہ کہنے کا الزام تھا، غالب نے خط میں اس الزام کا بھی ذکر کیا تھا۔ ان تینوں واقعات کے بیان سے یہ خط بہت غم انگیز ہو گیا تھا۔ ان واقعات کا اثر کم کرنے کے لیے غالب نے حافظ ممو کا واقعہ بیان کرنے میں شوخی اور ظرافت سے کام لیا۔ اس لطیفے کے بعد اس خط میں غالب ایک اور واقعہ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ آدمی ہنسے بغیر نہ رہ سکے۔ خواجہ بخش درزی بہت موٹے آدمی تھے۔ ان کے لیے ہاتھی کا استعارہ کیسا برجستہ ہے۔ لکھتے ہیں:

> ”ہاں صاحب، خواجہ بخش درزی کل سہ پہر کو میرے پاس آیا۔ میں نے جانا ایک ہاتھی کوٹھے پر چڑھ آیا“

بنام یوسف مرزا   جون، جولائی ۱۸۵۹ء

غالب کے خطوط میں کہیں کہیں معمولی اور سطحی قسم کی ظرافت بھی ملتی ہے جس کا مقصد محض ہنسنا ہنسانا ہے۔ مثال کے طور پر غالب ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ”روزہ رکھتا ہوں مگر روزے کو بہلائے رہتا ہوں۔ کبھی پانی پی لیا۔ کبھی حقہ پی لیا۔ کبھی کوئی ٹکڑا روٹی کا کھا لیا۔ یہاں کے لوگ عجب فہم اور طرفہ روش رکھتے ہیں۔ میں تو روزہ بہلاتا رہتا ہوں اور یہ صاحب فرماتے ہیں کہ تو روزہ نہیں رکھتا۔ یہ نہیں سمجھتے کہ روزہ نہ رکھنا اور چیز ہے اور روزہ بہلانا اور بات ہے“

بنام منشی نبی بخش حقیر   ۲۲ جون ۱۸۵۳ء

علاء الدین خاں علائی کے نام ایک خط میں مہینوں کے نام سے فائدہ اٹھا کر مزاح پیدا کیا ہے۔ لکھتے ہیں :

> " لو صاحب، وہ مرزا رجب بیگ مرے۔ اُن کی تعزیت آپ نے نہ کی ۔ شعبان بیگ پیدا ہو گئے، کل اُن کی چھٹی ہو گئی۔ آپ شریک نہ ہوتے "

بنام علاء الدین خاں علائی ۶ جنوری ۱۸۶۵ء

مرزا ہرگوپال تفتہ نے بہت دن سے خط نہیں لکھا۔ غالب اُن سے ظریفانہ انداز میں خط نہ لکھنے کی شکایت اس طرح کرتے ہیں :

> " کیوں صاحب! کیا یہ آئین جاری ہوا ہے کہ سکندر آباد کے رہنے والے دلّی کے خاک نشینوں کو خط نہ لکھیں بھلا، اگر یہ حکم ہوا ہوتا، تو یہاں بھی تو اشتہار ہو جاتا کہ زنہار کوئی خط سکندر آباد کو یہاں کی ڈاک میں نہ جاوے "

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ ۱۳ نومبر ۱۸۵۸ء

تفتہ کو خط لکھا تو غالب کو شاید خیال ہوا کہ خط کا وزن زیادہ ہو گیا ہے، کہیں بیرنگ نہ ہو جائے۔ لفافے پر دگنے ٹکٹ لگا دیے اور خط میں اس کا اظہار اس طرح کیا :

> "کیوں صاحب! یہ ڈبل خط پوسٹ پیڈ بھیجنا اور وہ بھی دلّی سے سکندر آباد کو۔ آیا حاتم کے سوا اور میرے سوا کسی نے کیا ہوگا "

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ ۲۱ اگست ۱۸۵۳ء

غالب اور مجروح کے ایک دوست حکیم میر اشرف علی نے سر منڈوا ڈالا۔ غالب کو اُن کی شکل دیکھ کر ہنسی آ گئی۔ مجروح کو لکھتے ہیں :

> " کل حکیم میر اشرف علی آئے تھے۔ سر منڈوا ڈالا ہے۔ "مُحَلِّقِینَ رُؤُسَکُمْ" پر عمل کیا ہے۔ میں نے کہا کہ سر منڈوایا ہے تو ڈاڑھی رکھو۔ کہنے لگے۔ دامن از کجا آرم کہ جامہ ندارم۔ واللہ اُن کی صورت قابل دیکھنے کے ہے "

بنام میر مہدی مجروح (۱۵ اکتوبر ۱۸۵۹ء)

غالبؔ کو شاید بیکانیر کی مصری بہت پسند تھی۔ علائیؔ سے مصری کی فرمایش کرتے ہیں۔ فرمایش کا انداز تو دیکھیے:

> "خصی بکروں کے گوشت کے قلیے، دو پیازے، پلاؤ، کباب جو کچھ تم کھا رہے ہو، مجھ کو خدا کی قسم اگر اُس کا کچھ خیال بھی آتا ہو، خدا کرے بیکانیر کی مصری کا کوئی ٹکڑا تم کو میسر نہ آیا ہو، کبھی یہ تصور کرتا ہوں کہ میر جان صاحب اُس مصری کے ٹکڑے چبا رہے ہوں گے تو یہاں میں رشک سے اپنا کلیجہ چابنے لگتا ہوں"

بنام نواب علاء الدین خاں علائیؔ ۱۵ اکتوبر ۱۸۶۱ء

میر احمد حسین میکشؔ سے خرموں کی فرمایش کیسے دلچسپ اور پر لطف انداز میں کرتے ہیں:

> " بھائی میکش آفریں، ہزار آفریں! تاریخ نے مزا دیا۔ خدا جانے وہ خرمے کس مزے کے ہوں گے، جن کی تاریخ ایسی ہے۔ دیکھو صاحب:
>
> قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید
>
> تاریخ دیکھی، اُس کی تعریف کے خرمے کھائیں گے، اُس کی تعریف کریں گے۔ کہیں یہ تمھارے خیال میں نہ آوے کہ یہ حسنِ طلب ہے کہ ناحق تم دین محمد غریب کو دوبارہ تکلیف دو۔ ابھی رقعہ لے کر آیا ہے، ابھی خرمے لے کر آوے۔ لَاحَولَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ العَلِیِّ العَظِیمُ۔ اگر بہ فرضِ محال تم یوں ہی عمل میں لاؤ گے اور میاں دین محمد صاحب کے ہاتھ خرمے بھجواؤ گے، تو ہم بھی کہیں گے، 'تازہ شے بہتر بارہ سے بہتر۔'"

غالبؔ کی ظرافت زندگی سے مفاہمت کے جذبے کے تحت پیدا ہوئی ہے۔ وہ اپنی تمناؤں اور امیدوں کی ناکامی پر قہقہے لگانے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ وہ نہ صرف اپنی

کمزوریوں اور صعوبتوں کا بے باکانہ اظہار کرتے ہیں بلکہ اُن کا مذاق اڑاتے ہیں، اُن پر ہنستے ہیں اور ہمیں ہنسنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ شاعری میں "عرش سے پرے ایک مکان" کا متمنی خطوں میں ایک عام انسان نظر آتا ہے۔ ایک ایسا انسان جس کے پیر زمین پر مضبوطی سے جمے ہوئے ہیں اور جو مصائب و آلام کی تاریکیوں میں زندہ دلی اور شگفتگی کی پھلجھڑیاں چھوڑتا دکھائی دیتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب میں غالب کا سب کچھ لٹ گیا۔ وہ اس بھری دنیا میں تنہا رہ گئے۔ اس تباہی اور بربادی نے اُن کے پورے وجود کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اپنی زندہ دلی اور شوخیٔ طبع کو ہتھیار بنا کر وہ ان حالات کا مقابلہ کرتے ہیں۔ مجروح کے نام ایک خط میں اپنی بربادی اور زبوں حالی کا ذکر کرتے کرتے اچانک رگِ ظرافت پھڑک اُٹھتی ہے اور وہ ایسی بات لکھتے ہیں کہ جس سے مکتوب الیہ کے ذہن کا بوجھ ہلکا ہوجاتے۔ مجروح کو لکھتے ہیں :

> "خلاصہ میری فکر کا یہ ہے کہ اب بچھڑے ہوئے یار کہیں قیامت ہی کو جمع ہوں، سو وہاں کیا خاک جمع ہوں گے؟ سنّی الگ، شیعہ الگ، نیک جدا، بد جدا"

بنام میر مہدی مجروح

> "یہ میرا حال سنو کہ بے رزق جینے کا ڈھب مجھ کو آگیا ہے۔ اس طرف سے خاطر جمع رکھنا۔ رمضان کا مہینا روزہ کھا کھا کر کاٹا۔ آیندہ خدا رزاق ہے۔ کچھ اور کھانے کو نہ ملا تو غم تو ہے۔ بس صاحب، جب ایک چیز کھانے کو ہوئی، اگرچہ غم ہی ہو، تو پھر کیا غم ہے؟

بنام میر مہدی مجروح

غالب اپنی کمزوریوں کا، اپنی بدحالی کا بے باکانہ اظہار ہی نہیں کرتے بلکہ اُن کا مذاق بھی اڑاتے ہیں۔ اس پر خود بھی ہنستے ہیں اور ہمیں بھی ہنساتے ہیں۔

ایک صاحب ہیں، پیرجی - غالب اُن سے ہنسی مذاق کرتے رہتے ہیں، ایک دن اُن سے جو گفتگو ہوئی، اُسے غالب نے علائی کے نام ایک خط میں اس طرح لکھا ہے:

"پیر جی سے جب پوچھتا ہوں کہ تم خوب شخص ہو اور وہ کہتے ہیں: کیا کہنا ہے! اور میں پوچھتا ہوں: کس کا؟ تو وہ فرماتے ہیں: مرزا شمشاد علی بیگ کا - ایں اور کسی کا نام تم کیوں نہیں لیتے؟ دیکھو یوسف علی خاں بیٹھے ہیں، ہیرا سنگھ موجود ہے۔ واہ صاحب میں کیا خوشامدی ہوں جو منہہ دیکھی کہوں؟ میرا شیوہ حفظ الغیب ہے، غائب کی تعریف کرنی کیا عیب ہے؟ ہاں صاحب، آپ ایسے ہی وضع دار ہیں، اس میں کیا ریب ہے۔"

بنام علاء الدین خاں علائی ۹ ستمبر ۱۸۶۲ء

غالب کبھی کبھی پُر لطف قصوں اور لطیفوں سے بھی اپنے خطوط کو دلچسپ بناتے ہیں۔ وہ عام طور پر فحش لطیفے اور قصے نہیں لکھتے۔ ہاں دو تین بار "قاطع برہان" اور قتیل کے کے سلسلے میں اُن کے قلم سے کچھ غیر مہذب الفاظ نکل گئے ہیں، جن کا ذکر آگے آئے گا۔

غالب نے مجروح اور میرن صاحب کے تعلقات کے بارے میں ایسے مزاحیہ انداز میں گفتگو کی ہے کہ کہیں کہیں اس میں ذم کا پہلو بھی پیدا ہو گیا ہے لیکن غالب کا اس قسم کے مذاق کا رشتہ اپنے شاگردوں میں صرف میر مہدی مجروح سے ہے۔ غالب کے خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ مجروح بھی میرن صاحب کا ذکر مزے لے لے کر کرتے تھے۔ ایک دفعہ میرن صاحب کے چہرے پر مہاسا نکل آیا۔ مجروح نے غالب کے نام خط میں اس مہاسے کے بارے میں انشا پردازی کی ہوگی۔ غالب جواباً لکھتے ہیں:

"ایک غریب سید مظلوم کے چہرۂ نورانی پر مہاسا نکلا ہے، تم کو سرمایۂ آرائشِ گفتار بہم پہنچا ہے۔"

بنام میر مہدی مجروح ۲۷ مارچ ۱۸۵۹ء

مجروح نے میرن صاحب کے بارے میں غالب کو کچھ لکھا۔ غالب کا موڈ ٹھیک نہیں تھا، ناراض ہو کر لکھتے ہیں :

” میرن صاحب کی تمھاری چوما چاٹی کے لکھنے کا مجھ میں دم نہیں۔ تم جانو وہ جانیں “

بنام میر مہدی مجروح ۱۶ مئی ۱۸۶۲ء

دہلی میں میرن صاحب کی سسرال تھی۔ ان کی بیوی دلّی آئی ہوئی تھیں۔ غالب میرن صاحب کی بیوی کے بارے میں لکھتے ہیں :

” اجی وہ یوسفِ ہند نہ سہی، یوسفِ دہر سہی، یوسفِ عصر سہی، یوسفِ کشور سہی۔ اُن کی زلیخا نے ستم برپا کر رکھا ہے “

بنام میر مہدی مجروح ۱۳ دسمبر ۱۸۵۹ء

ایک دفعہ غالب نے لکھا :

” میر مہدی نہیں کہ میرن پر مرتا ہوں “

بنام میر مہدی مجروح ۲۹ جولائی ۱۸۶۲ء

ایک دفعہ میرن صاحب کی آنکھیں دکھنے آگئیں۔ مجروح نے غالب کو اس کی اطلاع دی غالب کے ہاتھ دل لگی کا ایک موقع آگیا۔ لکھتے ہیں :

” میاں کیوں ناسپاسی و ناحق شناسی کرتے ہو۔ چشمِ بیمار ایسی چیز ہے کہ جس کی کوئی شکایت کرے ؟ تمھارا منہ چشمِ بیمار کے لائق کہاں ؟ چشمِ بیمار میرن صاحب قبلہ کی آنکھ کو کہتے ہیں، جس کو اچھے اچھے عارف دیکھتے رہتے ہیں۔ تم گنوار، چشمِ بیمار کو کیا جانو “

بنام میر مہدی مجروح اوائل مئی ۱۸۶۰ء

غالب نے ایک دفعہ میرن صاحب کو خط لکھا، انھوں نے جواب نہیں دیا۔ غالب نے

مجروح کے نام خط میں جواب کا تقاضا کیا۔ غالباً مجروح یہ بات میرن صاحب سے کہنا بھول گئے۔ غالب نے مجروح کے نام خط لکھا اور اس بھول جانے کی شکایت اس چھیڑ چھاڑ کے ساتھ کی :

> " حسن بھی کیا چیز ہے، نادر کا اتنا خوف نہیں جتنا حسین آدمی کا ڈر ہوتا ہے۔ تم اُن سے خواہشِ وصال کرتے ہوئے ڈرو، میرے خط کے جواب کے باب میں کیوں نہیں کہتے "

بنام میر مہدی مجروح

صرف ایک بار غالب نے اپنے خط میں مجروح کو میرن صاحب کے بارے میں ایک غیر شائستہ بات لکھی :

> " بھائی ! تم نے بخار کو کیوں آنے دیا۔ تپ کو کیوں چڑھنے دیا ؟ کیا بخار میرن صاحب کی صورت میں آیا تھا جو تم مانع نہ آئے ؟ کیا تپ ابن بن کر آئی تھی جو اس کو روکتے ہوئے شرمائے "؛

بنام میر مہدی مجروح

غالب انسانی رشتوں کا بہت احترام کرتے تھے۔ انھیں ہمیشہ یہ خیال رہتا تھا کہ ان سے کوئی ایسی بات نہ ہو جس سے کسی کی دل آزاری ہو۔ اس طرح اگر کوئی ایسی بات کرتا جس سے غالب کو ذہنی تکلیف ہوتی تو وہ طنز و ظرافت کے پردے میں اپنی ناراضگی یا ناپسندیدگی کا اظہار کر دیتے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ غالب غصے میں کسی پر برس پڑے ہیں لیکن ایسا بہت کم ہوا ہے۔

مرزا ہرگوپال تفتہ نے " بروے استادنِ رنگ " کی مثال میں کسی استاد کا مصرع لکھ دیا۔ غالب کو یہ بات ناگوار گزری اور انھوں نے اپنے طنز کے تیر کا نشانہ تفتہ کو اس طرح بنایا :

"سچ ہے اگر آپ استاد کا مصرع نہ لکھتے تو میں "بروے استادن رنگ" کو کہاں سے سمجھتا"

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ ۲۳ جولائی ۱۸۶۳ء

نواب انورالدولہ شفق کو کسی نے غالب کے وفات کی غلط خبر دے دی شفق نے بہت دن سے غالب کو خط نہیں لکھا تھا۔ جب یہ خبر غلط ثابت ہوگئی تو غالب کو خط لکھا اور اس میں اس افواہ کا بھی ذکر کر دیا۔ اس واقعے پر غالب کا حُسنِ اظہار ملاحظہ کیجیے:

"آپ کی پرسش کے کیوں نہ قربان جاؤں کہ جب تک میرا مرنا نہ سُنا، میری خبر نہ لی"

بنام نواب انورالدولہ شفق

علیگڈھ کے صدر امین شیخ مومن علی دہلی آئے ہوئے تھے اور غالب سے ملے بغیر واپس چلے گئے۔ غالب کی انا کو اس سے ٹھیس پہنچی۔ منشی نبی بخش حقیر کو لکھتے ہیں:

"اگر آپ سے (شیخ مومن علی کی) ملاقات ہو تو فرمائیے گا کہ اسد اللہ روسیاہ بعد سلام عرض کرتا ہے کہ وہ رتبہ میرا تو کہاں کہ میں آپ سے شکوہ کروں کہ مجھ سے مل کر آپ نہ گئے، مگر ہاں افسوس کرتا ہوں کہ مجھ کو خبر کیوں نہ ہوئی ورنہ تودیع کو پہنچتا"

بنام منشی نبی بخش حقیر

ماتم یک شہر آرزو

ہندوستان کے ہزاروں سال پرانے جاگیرداری نظام میں ایسا بارہا ہوا ہے کہ حکومتیں بدلی ہیں۔ کسی ایک فرد نے اپنی ذہانت، شجاعت اور جوڑ توڑ سے اقتدار حاصل کرنا شروع کیا اور کچھ ہی عرصے میں حکومت کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں آگئی۔ کچھ عرصے

تک حکومت اس کے خاندان میں رہی اور جب حکومت خاندان کے اُن لوگوں کے ہاتھ میں آئی جنھوں نے اقتدار اپنے قوتِ بازو کے بل پر حاصل نہیں کیا تھا بلکہ جنھیں یہ ورثے میں مِلا تھا تو وہ دولت اور طاقت کے نشے کو زیادہ دن برداشت نہ کر سکے اور رفتہ رفتہ حکومت کسی اور خاندان میں منتقل ہوگئی۔ پھر کچھ عرصے بعد اُس خاندان کا بھی یہی حشر ہوا۔ غرض صدیوں تک یہ کہانی اسی طرح دہرائی جاتی رہی۔ اس کہانی کے کرداروں میں ہندوستانی نژاد بھی تھے اور وہ حملہ آور بھی جو بہت بڑی طاقت بن کر ہندوستان آتے تھے۔ حکومتوں کی اس تبدیلی کا اثر عام ہندوستانیوں پر بہت کم ہوتا تھا، صرف حملوں کے وقت ایک سیلاب خون آتا اور گزر جاتا اور پھر سب کچھ اسی طرح معمول پر آجاتا۔ حکومتوں کی تبدیلیوں کا اثر ہندوستان کے تمدن اور معاشرت پر خاطر خواہ اس وقت پڑتا جب فاتح قوم مستقل طور پر ہندوستان ہی میں سکونت اختیار کرلیتی۔ اس طرح کے حکمرانوں کے ساتھ جو علم اور جو فکر اور فلسفہ ہندوستان آیا ہے، وہ ہندوستانی فکر میں کچھ اضافے اور تبدیلیاں تو ضرور کرتا رہا لیکن وہ بنیادی خصوصیت جسے ہم ہندوستانیت کہہ سکتے ہیں، بہر حال برقرار رہی — انگریز ابتدا میں ہندوستان میں صرف تجارت کی غرض سے آئے تھے۔ ہندوستان پر حکومت کرنے کا خیال قدرے بعد میں آیا۔ انگریز اپنے ساتھ صنعتی نظام کی برکتیں لے کر آئے تھے، اس لیے انھوں نے غیر محسوس طریقے پر معاشرت، تہذیب، افکار و نظریات کی سطح پر ہندوستانی زندگی کو متاثر کرنا شروع کر دیا۔ انگریزوں کے ساتھ وہ جدید علوم بھی تھے جو نشاۃ ثانیہ میں مغرب نے حاصل کیے تھے انھیں علوم پر ترقی یافتہ صنعتی نظام کی بنیاد تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار کے ساتھ ساتھ مغربی فکر کے اثرات بھی ہندوستانی ذہن پر بڑھتے گئے۔

غالب نے جب ہوش سنبھالا تو مشرقی اور مغربی فکر یعنی نئی اور پرانی اقدار میں کشمکش اور تصادم شروع ہو چکا تھا۔ کلکتے میں ایسے تعلیمی ادارے قائم ہو چکے تھے،

جہاں مغربی علوم کے ذریعے مشرقی نظامِ فکر کی بنیادیں ہلائی جارہی تھیں اور جدید ایجادات کا مظاہرہ کرکے ہندوستانی ذہن کو حیرت اور احساسِ کمتری میں مبتلا کیا جارہا تھا۔ سرسید کی مرتبہ "آئینِ اکبری" پر غالب کی تقریظ مغرب سے متاثر ہونے والے اس ذہن کی نشان دہی کرتی ہے۔

غالب کے دیکھتے ہی دیکھتے ایسٹ انڈیا کمپنی نے ایک زبردست اور طاقت ور برطانوی حکومت کی شکل اختیار کرلی۔ اس نئی حکومت کے سامنے ہندوستانی فکر نے ہتھیار ڈال دیے۔ ہندوستان کا آخری مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر محض نام کا بادشاہ رہ گیا تھا جو دراصل انگریزوں کا پنشن خوار تھا۔ اہلِ علم طبقہ زندگی کے مثبت فلسفوں اور تصورات کی تازگی اور توانائی سے محروم ہوچکا تھا۔ سماج پر ایک مکمل تعطل اور جمود کا عالم تھا۔ برطانوی سامراج کے بڑھتے ہوئے اقتدار نے ہندوستان کے باشعور طبقے کو یقین دلادیا تھا کہ وہ وقت دور نہیں جب برائے نام مغل حکومت کا چراغ بھی گل ہوجائے گا۔ غالب اپنے ایک شاگرد قاضی عبدالجمیل جنوں کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں :

> "مشاعرہ یہاں شہر میں کہیں نہیں ہوتا۔ قلعے میں شہزادگانِ تیموریہ جمع ہوکر کچھ غزل خوانی کرلیتے ہیں۔ وہاں کے مصرعۂ طرحی کو کیا کیجے گا اور اُس پر غزل لکھ کر کہاں پڑھیے گا۔ میں کبھی اس محفل میں جاتا ہوں اور کبھی نہیں جاتا اور یہ صحبت خود چند روزہ ہے، اس کو دوام کہاں؟ کیا معلوم ہے اب کے ہی نہ ہو۔ اب کے ہو تو آیندہ نہ ہو"

(۱۸۵۴ء)

یہ گویا اس عہد کے ہر باشعور، حساس اور ذہین لیکن مجبور اور بے بس انسان کے دل کی آواز ہے، گویا صرف غالب کی نہیں بلکہ پورے سماج اور پورے عہد کی آواز ہے۔ غالب ایک طرف مغربی علوم، مغربی فکر اور سائنسی ایجادوں کا کھلے دل سے استقبال کرتے

ہیں اور دوسری طرف ہندوستان میں برطانوی سامراج کے بڑھتے ہوئے اقتدار سے خائف اور افسردہ بھی ہیں ۔ جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے اودھ پر قبضہ کیا تو غالبؔ کو دلی صدمہ ہوا ۔ ایک خط میں لکھتے ہیں :

> تباہیِ ریاستِ اودھ نے ، باآنکہ بیگانۂ محض ہوں ، مجھ کو اور بھی افسردہ دل کردیا بلکہ میں کہتا ہوں کہ سخت ناانصاف ہوں گے وہ اہلِ ہند جو افسردہ دل نہ ہوئے ہوں گے ۔ اللہ ہی اللہ ہے “

بنام قدؔر بلگرامی ۲۳ فروری ۱۸۵۷ء

غالبؔ کی فارسی اور اردو ادب پر گہری نظر تھی ۔ انھوں نے اپنے عہد کے مروجہ علوم مثلاً مذہب ، اخلاقیات ، تصوف ، منطق ، ہیئت اور طب کا باقاعدہ نہ سہی لیکن تھوڑا بہت مطالعہ ضرور کیا تھا ۔ اگر وہ تمام مشرقی علوم پر پوری قدرت حاصل کر لیتے ، تب بھی نئے حالات کا صحیح اور مکمل تجزیہ کرنے میں کامیاب نہ ہوتے ، کیوں کہ نئے صنعتی نظام اور اس کے سہارے بڑھتے ہوئے برطانوی سامراج کے اقتدار اور اس کے دور رس اثرات کو سمجھنے کے لیے یہ علوم کافی نہیں تھے ۔ غالبؔ مشرقی تہذیب کے مداح اور اس کے زوال کے ماتم گزار ہیں ۔ چوں کہ تازہ ہوا کے لیے انھوں نے اپنے ذہنی دریچوں کو کھلا رکھا ہے ، اس لیے وہ مشرقی اقدار پر تنقید بھی کرتے ہیں اور نئے نظام کا استقبال بھی ۔ غالبؔ اس راز سے واقف تھے کہ مغل شہنشاہیت کی تلواریں زنگ آلود اور اس کے دست و بازو شل ہو چکے ہیں اور اب کوئی طاقت اس عظمتِ پارینہ کو واپس نہیں لا سکتی ۔ وہ اس حقیقت سے بخوبی آشنا تھے کہ زوال کی آخری حدود کو چھونے والی مغل حکومت یا چھوٹی چھوٹی خود مختار صوبائی حکومتیں انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو روک نہیں سکتیں ۔ غالبؔ انحطاط پذیر طاقتوں سے مایوس ہو چکے تھے ، اس لیے کبھی کبھی وہ اس نئے نظام سے اپنی امیدیں وابستہ کر لیتے اور اسی لیے اُن کی

وفاداری بھی منقسم تھی۔ وہ ایک طرف تو بادشاہ سے قربت حاصل کرنے کے لیے تمام ذرائع استعمال کرتے نظر آتے ہیں اور دوسری طرف قصیدے لکھ لکھ کر انگریز افسروں کو بھی خوش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب سے قبل غالب نے کوشش کی تھی کہ ملکۂ معظمہ سے براہِ راست رابطہ قائم کریں۔ انھوں نے ۹ نومبر ۱۸۵۵ء کو ایک قصیدہ لارڈ الن برا کو بھیجا تھا تاکہ ملکۂ معظمہ کی خدمت میں پیش کیا جا سکے۔ قصیدے کے ساتھ غالب نے درخواست کی تھی کہ انھیں ملکہ کی طرف سے خطاب عطا ہو اور اُن کے موجودہ خلعت اور پنشن میں اضافہ کیا جائے۔ ابھی خط وکتابت جاری تھی کہ ۱۸۵۷ء کا انقلاب رونما ہو گیا۔ جب تک ہندوستان کا پلّہ بھاری رہا، غالب قلعے جاتے رہے اور جب ہندوستانیوں کو شکست ہو گئی تو غالب انگریزوں کے ساتھ ہو گئے۔

غالب نے "دستنبو" میں انقلابیوں کو بہت برا بھلا کہا ہے۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ اس وقت ہر شخص اپنی جان اور آبرو بچانے کی فکر میں تھا۔ غالب نے بھی وہی کیا، لیکن انقلاب کے بعد غالب تقریباً بارہ برس اور زندہ رہے اور ان بارہ برسوں میں انھوں نے اپنے دوستوں، عزیزوں اور شاگردوں کو بہت بڑی تعداد میں خطوط لکھے، لیکن کسی بھی خط میں مغل حکومت کے زوال پر اظہارِ افسوس نہیں کیا۔ مغل حکومت کے آخری تاجدار اور غالب کے مربّی اور محسن بہادر شاہ ظفر کا انتقال ہوا تو غالب نے مجروح کو لکھا:

> "۷ نومبر ۱۴ جمادی الاوّل سال حال جمعے کے دن ابو ظفر سراج الدین بہادر شاہ قیدِ فرنگ و قیدِ جسم سے رہا ہوئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیہِ رَاجِعُونَ۔"

بنام میر مہدی مجروح ۱۶ دسمبر ۱۸۶۲ء

غالب کا یہ بیان کسی بھی جذبے اور احساس سے عاری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ غالب کو

مغل حکومت کے خاتمے اور بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری کا کچھ زیادہ غم نہیں تھا۔ انھیں بہ قول اُن کے غم یہ تھا کہ ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب میں "جان و مال و ناموس و مکان و آسمان و زمین و آثارِ ہستی سراسر لٹ گئے"۔ غالب کو دراصل دلّی، اہلِ دلّی اور خود اپنی تباہی کا غم تھا۔ ۱۸۵۷ء کا ناکام انقلاب قلزمِ خوں سے کم نہیں تھا اور غالب اس کے شناور رہے تھے۔ اب غالب کی زبانی اس قلزمِ خوں کی داستان سُنیے:

> "میرا حال سوائے میرے خدا اور خداوند کے کوئی نہیں جانتا۔ آدمی کثرتِ غم سے سودائی ہو جاتے ہیں، عقل جاتی رہتی ہے، اگر اس ہجومِ غم میں میری قوتِ متفکرہ میں فرق آگیا ہو تو کیا عجب ہے بلکہ اس کا باور نہ کرنا غضب ہے۔ پوچھو کہ غم کیا ہے۔ غمِ مرگ، غمِ فراق، غمِ رزق، غمِ عزت، غمِ مرگ۔ میں قلعۂ نامبارک سے قطع نظر کر کے اہلِ شہر کو گنتا ہوں: مظفر الدولہ، میر ناصر الدین، مرزا عاشور بیگ میرا بھانجا، اُس کا بیٹا احمد مرزا، اُنیس برس کا بچہ، مصطفیٰ خاں ابن اعظم الدولہ، اُس کے دو بیٹے ارتضیٰ خاں اور مرتضیٰ خاں، قاضی فیض اللہ، کیا میں اُن کو اپنے عزیزوں کے برابر نہیں جانتا تھا۔ اے لو بھول گیا، حکیم رضی الدین خاں، میر احمد حسین میکشؔ، اللہ، اللہ، اُن کو کہاں سے لاؤں، غمِ فراق، حسین مرزا، یوسف مرزا، میر مہدیؔ، میر سرفراز حسین، میرن صاحب، خدا اُن کو جیتا رکھے۔ کاش یہ ہوتا کہ جہاں ہوتے وہاں خوش ہوتے۔ گھر اُن کے بے چراغ، وہ خود آوارہ۔ سجاد اور اکبر کے حال کا جب تصور کرتا ہوں، کلیجا ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے۔ کہنے کو ہر کوئی ایسا کہہ سکتا ہے مگر میں علی کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ اُن اموات کے غم میں اور زندوں کے فراق میں عالم میری نظر میں تیرہ و تار ہے۔"

بنام یوسف مرزا ۲۸ نومبر ۱۸۵۹ء

عزیزوں، دوستوں اور شاگردوں کے قتل نے غالب کے دل و دماغ کو اتنا متاثر کیا تھا کہ اگر وہ غیر معمولی قوتِ ارادی کے انسان نہ ہوتے تو پاگل ہو گئے ہوتے، انھیں اپنی بربادی کا غم تو تھا ہی لیکن دوستوں اور عزیزوں کے قتل اور تباہی نے بھی اُن کے دل و دماغ کو متاثر کیا تھا۔ مرزا ہرگوپال تفتہ کے نام ایک خط میں غالب لکھتے ہیں :

> " یہ کوئی نہ سمجھے کہ میں اپنی بے رونقی اور تباہی کے غم میں مرتا ہوں۔ جو دکھ مجھ کو ہے، اُس کا بیان تو معلوم مگر اُس بیان کی طرف اشارہ کرتا ہوں ۔ انگریز کی قوم میں سے جو اِن روسیاہ کالوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔ اُس میں کوئی میرا امید گاہ تھا اور کوئی میرا شفیق اور کوئی میرا دوست اور کوئی میرا یار اور کوئی میرا شاگرد۔ ہندوستانیوں میں کچھ عزیز، کچھ دوست، کچھ شاگرد، کچھ معشوق، سو وہ سب کے سب خاک میں مِل گئے۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے، جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو، اُس کو زلیست کیوں کر نہ دشوار ہو، ہائے ! اتنے یار مرے کہ جو اَب میں مروں گا، تو میرا کوئی رونے والا بھی نہ ہوگا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ "
>
> بنام ہرگوپال تفتہ جون۔ جولائی ۱۸۵۸ء

انگریز فاتح دلّی کی عظیم الشان عمارتیں ڈھا رہے تھے۔ یہ کُدال پھاوڑے عمارتوں پر نہیں غالب کے دل و دماغ پر چل رہے تھے۔ ان عمارتوں کے ڈھائے جانے پر غالب تڑپ رہے تھے، لیکن محض تماشائی بنے رہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ جامع مسجد سے راج گھاٹ تک کی حالت غالب کی زبانی سنیئے :

> " پرسوں میں سوار ہو کر کنوؤں کا حال دریافت کرنے گیا تھا۔ مسجد جامع ہوتا ہوا راج گھاٹ دروازے کو چلا۔ مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازے

تک بے مبالغہ ایک صحرا لق و دق ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں، وہ اگر اٹھ جائیں تو ہُو کا مکاں ہو جائے۔ یاد کرو، مرزا گوہر کے باغیچے کے اس جانب کو کئی بانس نشیب تھا، اب وہ باغیچے کے صحن کے برابر ہو گیا، یہاں تک کہ راج گھاٹ کا دروازہ بند ہو گیا۔ فصیل کے کنگورے کھلے رہے ہیں، باقی سب اٹ گیا۔ کشمیری دروازے کا حال تم دیکھ گئے ہو، اب آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ دروازے سے کابلی دروازے تک میدان ہو گیا۔ پنجابی کٹرہ، دھوبی واڑہ، رام جی گنج ، سعادت خاں کا کٹرہ، جرنیل کی بی بی کی حویلی، رام جی داس گودام والے کے مکانات، صاحب رام کا باغ، حویلی، ان میں سے کسی کا پتا نہیں ملتا۔ قصہ مختصر، شہر صحرا ہو گیا تھا۔ اب جو کنوئیں جاتے رہے اور پانی گوہرِ نایاب ہو گیا تو یہ صحرا صحرائے کربلا ہو جائے گا۔ اللہ، اللہ! دلّی نہ رہی اور دلّی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہے جاتے ہیں۔“

بنام میر مہدی مجروح ۱۸۶۱ء

ذرا جامع مسجد کا حال ملاحظہ ہو:

”جامع مسجد کے گرد پچیس پچیس فٹ گول میدان نکلے گا۔ دکانیں، حویلیاں ڈھائی جائیں گی۔ ”دارالبقا“ فنا ہو جائے گی۔ رہے نام اللہ کا۔ خان چند کا کوچہ، شاہ بولا کے بڑ تک ڈھے گا۔ دونوں طرف سے پھاوڑا چل رہا ہے۔ باقی خیر و عافیت ہے۔“

بنام میر مہدی مجروح ۸ نومبر ۱۸۵۹ء

اگرچہ اس خط میں غالب نے محض واقعات بیان کیے ہیں، لیکن ”رہے نام اللہ کا“ اور ”باقی خیر و عافیت ہے“ لکھ کر غالب نے اپنے ذہنی کرب کا بھی اظہار کر دیا ہے۔

ایک اور خط میں غاؔلب نے دلّی کی ادبی اور تہذیبی زندگی کی بربادی کا ذکر ایسے الفاظ میں کیا ہے کہ وہ خط نثری مرثیہ بن گیا ہے۔ مختصر سے خط میں غاؔلب نے اپنا کلیجا نکال کر رکھ دیا ہے۔ لکھتے ہیں :

> ” او میاں سید زادۂ آزادہ ، دلّی کے عاشقِ دل دادہ۔ ڈھئے ہوئے اردو بازار کے رہنے والے، حسد سے لکھنؤ کو برا کہنے والے۔ نہ دل میں مہر و آزرم ، نہ آنکھ میں حیا و شرم۔ نظام الدین ممنوؔن کہاں، ذوؔق کہاں، موؔمن خاں کہاں۔ ایک آزرؔدہ سو خاموش، دوسرا غاؔلب، وہ بے خود و مدہوش، نہ سخن وری رہی نہ سخن دانی، کس برتے پر تتا پانی ؟ ہائے دلّی ! وائے دلّی ! بھاڑ میں جائے دلّی۔ “

بنام میر مہدی مجروؔح ٢٣ مئی ١٨٦١ء

عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا

غاؔلب کو نظم اور نثر دونوں میں اپنے اظہار پر یوں تو پوری قدرت حاصل تھی لیکن اگر کبھی کسی کی وفات پر تعزیتی خط لکھنا ہو، تو انھیں خاصی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ غاؔلب موت کے ذکر سے بہت گھبراتے تھے اور شاید اسی لیے تعزیت کے لیے انھیں مناسب الفاظ نہیں مل پاتے۔ اکثر غاؔلب بہت سرسری انداز میں تعزیت کرتے ہیں۔ اگر کسی دوست یا شاگرد کو کسی کی موت کی خبر دیتے ہیں تو کم سے کم الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ پس ماندگان کو تعزیتی خط لکھتے ہیں تو صبر و تحمل کی تلقین کر کے پیچھا چھڑا لیتے ہیں، اس طرح کے خطوں میں ایک آدھ بات ایسی ضرور لکھ دیتے ہیں، جس سے متعلقین کے دل کا بوجھ ہلکا ہو سکے۔ غاؔلب کبھی کبھی ایسے خط میں بھی مزاح سے کام لیتے ہوئے نظر آتے ہیں جو انھوں نے یا تو تعزیت کے طور پر لکھا ہے یا جس میں کسی کی موت کی

کسی کو اطلاع دی ہے۔ ایسے تعزیتی خط چند ہی ہیں جو غالب نے دل جمعی کے ساتھ لکھے ہیں۔

غالب نے خاصی طویل عمر پائی تھی اس لیے اُن کے بیشتر دوست اور عزیز اُن کی زندگی ہی میں وفات پا گئے۔ پھر ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب میں اُن کے بہت سے دوست آشنا اور رشتہ دار قتل ہوتے یا پھانسی کے تختے پر لٹکا دیے گئے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ غالب موت کے ذکر سے گھبرانے لگے تھے۔ ہاں، اپنی موت کی خواہش کا اظہار بار بار کیا ہے، بلکہ مزے لے لے کر کیا ہے۔ ایک خط میں اس خواہش کا اظہار خاصے دلچسپ انداز میں اس طرح کرتے ہیں:

> ”زندگی میری کب تک؟ سات مہینے یہ اور بارہ مہینے سالِ آیندہ کے۔ اسی مہینے میں اپنے آقا کے پاس جا پہنچتا ہوں۔ وہاں نہ روٹی کی فکر نہ پانی کی پیاس، نہ جاڑے کی شدت، نہ گرمی کی حدت۔ نہ حاکم کا خوف نہ مخبر کا خطر۔ نہ مکان کا کرایہ دینا پڑے اور نہ کپڑا خریدنا پڑے۔ نہ گوشت، گھی منگاؤں نہ روٹی پکواؤں۔ عالمِ نور اور سراسر سرور:
>
> یارب! ایں آرزوے من چہ خوش است
> تو بدیں آرزو مرا برساں“
>
> بنام نواب حسین مرزا ۳۱ دسمبر ۱۸۵۹ء

انسانی نفسیات کچھ اس طرح کی ہے کہ فن کار خود اپنی موت کا ذکر تو بڑی انشا پردازی کے ساتھ کرتا ہے لیکن جب دوسروں کو فی الحقیقت مرتا ہوا دیکھتا ہے تو خاصا خائف نظر آتا ہے۔ غالب ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ”کثیر الاحباب شخص ہوں، سینکڑوں بلکہ ہزاروں دوست اس باسٹھ برس میں مر گئے۔ خصوصاً اس فتنہ و آشوب میں تو شاید کوئی میرا جاننے والا نہ بچا

> ہوگا۔ اس راہ سے مجھ کو، جو دوست اب باقی ہیں، بہت عزیز ہیں۔ واللہ دعا مانگتا ہوں کہ اب ان احبا میں سے کوئی میرے سامنے نہ مرے۔ کیا معنی کہ جو میں مروں تو کوئی میرا یاد کرنے والا اور مجھ پر رونے والا بھی تو دنیا میں ہو"

بنام حکیم غلام نجف خاں   اپریل ۱۸۵۸ء

اسی لیے غالب تعزیت نامہ لکھنے سے کتراتے ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے اپنے جذبات کی صحیح عکاسی نواب کلب علی خاں کے نام ایک خط میں کی ہے۔ لکھتے ہیں:

> "چاہتا ہوں کہ کچھ لکھوں، مگر نہیں جانتا کہ کیا لکھوں۔ لازم تھا کہ تعزیت نامہ بہ زبانِ فارسی و عبارتِ بلیغ لکھوں۔ آپ کے قدموں کی قسم! دل نے قبول نہ کیا۔ آرایشِ گفتار، نظماً و نثراً واسطے تہنیت کے ہے کہ دل کثرتِ نشاط سے گل کی طرح کھل رہا ہے، طبیعت راہ دیتی ہے۔ الفاظ ڈھونڈے جاتے ہیں معنی پیدا کیے جاتے ہیں۔ اب میں نیم مردہ، دل پژمردہ، خاطر افسردہ، جس باب میں لفظ و معنی فراہم کیا چاہوں، وہ سراسر طبع کے خلاف۔ جس بات کا تصور ناگوار ہو، اُس کے تذکّر سے جی کیوں نہ بے قرار ہو"

بنام نواب کلب علی خاں   ۱۸ ستمبر ۱۸۶۵ء

یہ حقیقت ہے کہ غالب کو دوسروں کی موت کا ذکر بہت ناگوار گزرتا تھا، اسی لیے وہ عام طور سے تعزیتی کلمات مختصر لکھتے ہیں۔ یہ مختصر کلمات کبھی کبھی محض رسمی الفاظ پر مشتمل ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر مرزا قربان علی بیگ خاں سالک کے چچا کا انتقال ہوتا ہے تو غالب ان الفاظ میں تعزیت کرتے ہیں:

> "میری جان! کن اوہام میں گرفتار ہے۔ جہاں باپ کو پیٹ چکا، اب چچا کو بھی رو۔ تجھ کو خدا جیتا رکھے اور تیرے خیالات و احتمالات کو صورتِ

وقوعی دے۔“

مرزا ہر گوپال تفتہ، غالب کے عزیز ترین شاگرد تھے۔ لیکن جب تفتہ کی بیوی کا انتقال ہوا تو غالب نے سرسری انداز میں صرف اس طرح تعزیت کی :

”تمہارا خط پہنچا۔ مجھ کو بہت رنج ہوا۔ واقعی اُن چھوٹے لڑکوں کا پالنا بہت دشوار ہوگا۔ دیکھو میں بھی تو اسی آفت میں گرفتار ہوں۔ صبر کرو اور صبر نہ کرو گے تو کیا کرو گے۔ کچھ بن نہیں آتی۔ میں مسہل میں ہوں، یہ نہ سمجھنا کہ بیمار ہوں“

اسی طرح نجف خاں کی نواسی کے انتقال پر غالب لکھتے ہیں :

”حق تعالیٰ اس کی ماں کو صبر دے اور زندہ رکھے۔ میں یوں سمجھتا ہوں کہ یہ چھوکری قسمت والی اور حرمت والی تھی“

بنام حکیم غلام نجف خاں ۱۹ جنوری ۱۸۵۸ء

میاں داد خاں سیاح کے ہاں لڑکا پیدا ہوتے ہی مرگیا۔ اس خبر سے بظاہر خود غالب کے زخم ہرے ہو گئے۔ غالب کے ہاں سات بچے پیدا ہوئے، لیکن پندرہ مہینے سے زیادہ کوئی نہ جیا۔ غالب لکھتے ہیں :

”تمہارے ہاں لڑکے کا پیدا ہونا اور اس کا مر جانا معلوم ہو کر مجھ کو بڑا غم ہوا۔ اس داغ کی حقیقت مجھ سے پوچھو کہ اِکہتر برس کی عمر تک سات بچے پیدا ہوتے۔ لڑکے بھی اور لڑکیاں بھی اور کسی کی عمر پندرہ مہینے سے زیادہ نہیں ہوئی۔ تم ابھی جوان ہو، حق تعالیٰ تمھیں صبر اور نعم البدل دے۔

بنام میاں داد خاں سیّاح ۲۵ اگست ۱۸۶۷ء

تاہم غالب کے ہاں اس قسم کے خطوں کی بعض ایسی مثالیں بھی ہیں جن میں غالب نے بہت مختصر لفظوں میں تعزیت کی ہے یا کسی کی موت کی اطلاع دی ہے لیکن اپنے مخصوص اسلوب سے اظہار کو غیر معمولی حد تک مؤثر بنا دیا ہے۔ منشی نبی بخش حقیر کی بہو بیمار پڑیں تو

غالب کو خاصی تشویش ہوئی۔ کئی خطوں میں اُن کی صحت کے بارے میں دریافت کیا۔ ایک دن خبر ملی کہ وہ اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ یہ خاتون غالب کے عزیز ترین دوست منشی نبی بخش حقیر کے صاحبزادے منشی عبداللطیف کی بیوی تھیں۔ حقیر کے رشتے سے غالب کو منشی عبداللطیف اور اُن کی بیوی دونوں کا بہت خیال رہتا تھا۔ ان خاتون کی بیماری کے دوران غالب، حقیر سے اُن کی خیریت معلوم کرتے رہتے تھے۔ ایک دن جب ان کی وفات کی خبر سُنی تو غالب کو دلی صدمہ ہوا۔ چنانچہ انتہائی مختصر مگر رقت آمیز انداز میں اس طرح تعزیت کرتے ہیں :

> ” ہائے ہائے، وہ نیک بخت نہ بچی۔ واقعی یہ کہ تم پر اور اس کی ساس پر کیا گزری ہوگی۔ لڑکی تو جانتی ہی نہ ہوگی کہ مجھ پر کیا گزری۔ لڑکا شاید یاد کرے گا اور پوچھے گا کہ اماں کہاں ہیں۔ یہ اس کا پوچھنا اور تم کو رلائے گا۔ بہ ہر حال چارہ جز صبر نہیں ہے۔ غم کرو، ماتم رکھو۔ روؤ پیٹو، آخر خونِ جگر کھا کے چپ رہنا پڑے گا۔ حق تعالیٰ عبداللطیف کو اور تم کو اور یتیموں کی دادی اور پھپھیوں کو سلامت رکھے اور تمھارے دامنِ عطوفت و آغوشِ رافت میں اُن کو پالے “

بنام منشی نبی بخش حقیر ۶ اکتوبر ۱۸۵۴ء

غالب کے ایک دوست میر تفضل حسین خاں کا انتقال ہوگیا۔ غالب کو بہت صدمہ ہوا۔ ایک خط میں ان کی وفات کا ذکر صرف ایک جملے اور ایک شعر کے ساتھ کیا ہے لیکن بے حد مؤثر انداز میں :

”ہائے ہائے میر تفضل حسین خاں ہائے ہائے :

رفتی و مرا خبر نہ کردی
بر بیکسی ام نظر نہ کردی“

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ ۲۳ فروری سنہ۱۸۵۴ء

مرزا ہرگوپال تفتہ کے جواں عمر اور لاڈلے بیٹے پتمبر سنگھ کی موت کی خبر غالب منشی نبی بخش حقیر کو اس طرح دیتے ہیں :

”یہ تو سب کچھ ہے، مگر تم کو تفتہ کی بھی کچھ خبر ہے۔ پتمبر سنگھ، اس کا لاڈلا بیٹا، مرگیا۔ ہاے، اس غریب کے دل پر کیا گزری ہوگی :

چہ کند بندہ کہ گردن نہ نہد فرماں را
چہ کند گوی کہ تن در ندہد چوگاں را “

بنام منشی نبی بخش حقیر ۲۶ جولائی سنہ۱۸۵۵ء

تعزیت ناموں میں عام طور پر جن رسمی الفاظ کا استعمال کیا جاتا ہے، غالب نے ان الفاظ سے حتی الامکان گریز کر کے نیا انداز اختیار کرنے کی کوشش کی ہے۔ نواب امین الدین احمد خاں کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔ نواب صاحب، غالب کے رشتے دار بھی تھے اور دوست بھی سرسری تعزیت نامے سے بات نہیں بن سکتی تھی۔ اس لیے غالب ایک انوکھا انداز اختیار کرتے ہیں اور انتہائی جدت سے کام لیتے ہوئے لکھتے ہیں :

”بھائی صاحب ! آج تک سوچتا رہا کہ بیگم صاحبہ قبلہ کے انتقال کے باب میں تم کو کیا لکھوں، تعزیت کے واسطے تین باتیں ہیں : اظہارِ غم، تلقینِ صبر، دعاے مغفرت۔ سو بھائی، اظہارِ غم تکلفِ محض ہے۔ جو غم تم کو ہوا ہے، ممکن نہیں کہ دوسرے کو ہوا ہو۔ تلقینِ صبر، بے دردی ہے۔ یہ سانحۂ عظیم ایسا ہے جس نے غمِ رحلتِ نواب مغفور کو تازہ کیا۔ پس، ایسے موقع پر صبر کی تلقین کیا کی جائے۔ رہی دعاے مغفرت، میں کیا اور میری دعا کیا؟ مگر چوں کہ وہ میری مربّیہ اور محسنہ تھیں، دل سے دعا نکلتی ہے۔“

بنام نواب امین الدین احمد خاں ۱۵ نومبر سنہ۱۸۶۶ء

یوسف مرزا کے نام غالب کے کل بارہ خطوط ملتے ہیں۔ ان چند خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کو یوسف مرزا سے بہت محبت تھی۔ پہلے ان کے بیٹے کی وفات ہوئی اور کچھ عرصے بعد والد کا انتقال ہوگیا۔ غالب کو دوسرے حادثے کا دلی صدمہ ہوا۔ انھوں نے اس موقع پر یوسف مرزا کو جو تعزیت نامہ لکھا ہے، اُس سے بہتر تعزیت نامہ ابھی تک اردو میں نہیں چھپا۔ اس تعزیت نامے میں اظہارِ ہمدردی بھی ہے اور صبر و تحمل کی تلقین بھی اور فکر و اسلوب کی جدّت بھی۔ لکھتے ہیں:

> "یوسف مرزا! کیوں کر تجھ کو لکھوں کہ تیرا باپ مر گیا اور اگر لکھوں تو پھر آگے کیا لکھوں کہ اب کیا کرو مگر صبر؟ یہ ایک شیوۂ فرسودہ ابنائے روزگار کا ہے۔ تعزیت یوں ہی کیا کرتے ہیں اور یہی کہا کرتے ہیں کہ صبر کرو۔ ہائے! ایک کا کلیجا کٹ گیا ہے اور لوگ اُسے کہتے ہیں کہ تو نہ تڑپ۔ بھلا کیوں کر نہ تڑپے گا؟ صلاح اس امر میں نہیں بتائی جاتی، دعا کو دخل نہیں، دوا کا لگاؤ نہیں۔ پہلے بیٹا مرا، پھر باپ مرا۔ مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ بے سر و پا کس کو کہتے ہیں تو میں کہوں گا یوسف مرزا کو۔"

بنام یوسف مرزا ۱۹ مئی ۱۸۶۰ء

نواب یوسف علی خاں ناظم کی والدہ فتح النسا بیگم کا انتقال ہوا تو غالب کے لیے ضروری تھا کہ رسمی تعزیت نامہ لکھیں مگر یہ اُن کے بس کی بات کہاں تھی۔ دیکھیے کیسے مختصر لفظوں میں اپنا کام نکالتے ہیں:

> "کل اُس (مرزا داغ) نے از روئے خطِ آمدِ رام پور، حضرت جنابِ عالیہ کے انتقال کی خبر سُنائی۔ کیا کہوں، کیا غم و اندوہ کا ہجوم ہوا۔ حضرت کے غمگین ہونے کا تصور کر کر اور زیادہ مغموم ہوا۔ بیدرد نہیں ہوں کہ ایسے مقام میں بہ طریقِ انشا پردازی عبارت آرائی کروں۔ نادان نہیں ہوں کہ آپ

جیسے دانا دلِ دیدہ ور کو تلقینِ صبر و شکیبائی کروں :

از دستِ گدائے بے نوا ناید ہیچ
جز آں کہ بہ صدقِ دل دعائے بکند

بنام یوسف علی خاں ناظم ۲۷ مارچ ۱۸۵۸ء

اس خط میں غالب نے تعزیت نامے کے تمام رسمی الفاظ سے گریز کیا ہے۔ پس ماندگان کے لیے صبرِ جمیل کی توفیق عطا فرمانے کی دعا مانگی، نہ مرحومہ کے اوصافِ جمیلہ بیان کیے اور نہ اُن کے غریقِ رحمت ہونے کا تذکرہ کیا۔ یہ غالب کا خاص انداز تھا کہ جب رسمی تعزیت نامہ قدرے طویل ہوتا۔ تو اس میں باتیں ایسی ہوتیں، جو تعزیت نامے کا حصہ بن جانے کے باوجود براہِ راست تعزیت سے تعلق نہ رکھتیں۔ نواب یوسف علی خاں ناظم کے نام خط میں اُن کی والدہ کی وفات کے بارے میں چند الفاظ ہیں، باقی باتیں اِدھر اُدھر کی ہیں۔

شاید ہی دنیا میں ایسے خطوط لکھے گئے ہوں جو تعزیت نامے ہوں یا جن میں کسی کی موت کی اطلاع دی گئی ہو اور ان میں طنز و مزاح سے کام لیا گیا ہو۔ غالب جب اس طرح کے خطوط لکھتے ہیں تو کبھی کبھی ان کی شوخیِ طبع اور بذلہ سنجی برقرار رہتی ہے۔ اُن کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ "غم آگیں مضامین" سے اُن کے خطوط زیادہ بوجھل نہ ہو جائیں۔ علی بخش خاں، غالب کے سسرالی رشتے دار اور عزیز دوست تھے۔ ممکن نہیں کہ غالب کو اُن کی وفات کا صدمہ نہ ہوا ہو۔ علائی کے نام خط میں اُن کی وفات کا ذکر ایک فقرے میں کرتے ہیں اور پھر اس صدمے کے بوجھ کو ہلکا کرنے کے لیے مرحوم کا ایک ایسا دلچسپ واقعہ بیان کرتے ہیں، جسے پڑھ کر مکتوب الیہ ہنسے بغیر نہ رہ سکے۔ لکھتے ہیں :

> "علی بخش خاں مرحوم مجھ سے چار برس چھوٹا تھا۔ میں ۱۲۱۲ھ میں پیدا ہوا ہوں۔ اب کے رجب کے مہینے سے انہترواں برس شروع ہوا ہے۔

اس نے چھیاسٹھ برس کی عمر پائی۔ نبیؔ تقریر و تحریر کا آدمی تھا۔ اکبر آباد میں میور صاحب سے ملے۔ اثنائے مکالمت میں کہنے لگے کہ میں چچا جان کے ساتھ جنرل لارڈ لیک صاحب کے لشکر میں موجود تھا اور ہولکر سے جو محاربات ہوئے ہیں، اُس میں شامل رہا ہوں۔ بے ادبی ہوتی ہے ورنہ اگر قبا و پیرہن اتار کر دکھلاؤں تو سارا بدن ٹکڑے ٹکڑے ہے، جا بہ جا تلوار اور برچھی کے زخم ہیں۔ وہ ایک بیدار مغز اور دیدہ ور آدمی، اُن کو دیکھ دیکھ کر کہنے لگا کہ نواب صاحب، ہم ایسا جانتے ہیں کہ تم جرنیل صاحب کے وقت میں چار یا پانچ برس کے ہوگے۔ یہ سُن کر آپ نے کہا کہ درست، بجا ارشاد ہوتا ہے۔ خدایش بیامرزاد و بدین دروغ ہائے بے نمک مگیراد"

بنام نواب علاء الدین خاں علائی ۹ جولائی ۱۸۶۴ء

مرزا حاتم علی مہرؔ کی محبوبہ کا انتقال ہوگیا۔ غالبؔ نے تعزیت نامہ ایسے دلچسپ انداز میں لکھا کہ اس میں غم و اندوہ کا اظہار بھی ہوگیا اور کچھ چھیڑ چھاڑ بھی۔ مقصد غالبؔ کا یہ کہ مہرؔ کا غم کچھ ہلکا ہو اور ان میں صبر و ضبط کا حوصلہ پیدا ہو۔ غالبؔ لکھتے ہیں :

"ہم کو یہ باتیں پسند نہیں۔ پینسٹھ برس کی عمر ہے، پچاس برس عالمِ رنگ و بو کی سیر کی، ابتدائے شباب میں ایک مرشدِ کامل نے یہ نصیحت کی ہے کہ ہم کو زہد و ورع منظور نہیں، ہم مانعِ فسق و فجور نہیں، پیو، کھاؤ، مزے اڑاؤ، مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھی بنو، شہد کی مکھی نہ بنو؛ سو میرا اس نصیحت پر عمل رہا ہے۔ کسی کے مرنے کا وہ غم کرے جو آپ نہ مرے؛ کیسی اشک فشانی، کہاں کی مرثیہ خوانی؟ آزادی کا شکر بجالاؤ، غم نہ کھاؤ اور اگر ایسی ہی اپنی گرفتاری سے خوش ہو تو، چنّا جان، نہ سہی، منّا جان سہی۔ میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اگر مغفرت ہوگئی اور ایک قصر ملا

اور ایک حور ملی ؛ اقامت جاودانی ہے اور اُسی ایک نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے، اس تصور سے جی گھبراتا ہے اور کلیجا منہ کو آتا ہے۔ ہے ہے! وہ حور اجیرن ہو جائے گی، طبیعت کیوں نہ گھبرائے گی۔ وہی زمردیں کاخ اور وہی طوبیٰ کی ایک شاخ، چشم بددور، وہی ایک حور۔ بھائی، ہوش میں آؤ، کہیں اور دل لگاؤ۔"

بنام مرزا حاتم علی بیگ مہر جون سنہ ۱۸۶۰ء

غالب کے خطوط

مرزا ہرگوپال تفتہ

(۱)

صاحب!

دوسرا پارسل، جس کو تم نے بہ تکلف خط بنا کر بھیجا ہے، پہنچا۔ نہ اصلاح کو جگہ، نہ تحریرِ سطور کا پیچ و تاب سمجھ میں آتا ہے۔ تم نے الگ الگ دو ورقے پر کیوں نہ لکھا اور چھدرا چھدرا کیوں نہ لکھا؟۔ ایک آدھ دو ورقہ زیادہ ہو جاتا تو ہو جاتا۔ بہ ہر حال اب مجھے چننے پڑے ہیں سوالات۔ اگر کوئی سوال میری نظر نہ چڑھے اور رہ جائے تو سطور کی موڑ توڑ کا گناہ سمجھنا، میرا قصور نہ جاننا۔

"بلا رُبا" اس میں تامل کیا ہے؟ لفظ صحیح اور پورا تو یہی ہے، "رُبا" اُس کا مخفّف ہے:

خارہا در راہش افشانم کہ چوں خواہد شدن

بہت خوب اور معقول۔ میں اُس وقت خدا جانے کس خیال میں تھا۔ "چوں خواہد شدن" و "کنوں خواہد شدن" ردیف و قافیہ سمجھا تھا۔

لفظ "بے پیر" تورانی بچہ ہائے ہندی نژاد کا تراشا ہوا ہے۔ جب میں اشعارِ اُردو میں اپنے شاگردوں کو نہیں باندھنے دیتا تو تم کو شعرِ فارسی میں کیوں کر اجازت دوں گا؟ مرزا جلال اسیر علیہ الرحمۃ مختار ہیں اور اُن کا کلام سند ہے۔ میری کیا مجال ہے کہ اُن کے باندھے ہوئے لفظ کو غلط کہوں، لیکن تعجب ہے اور بہت تعجب ہے کہ امیر زادۂ ایران ایسا لفظ لکھے۔

"شست لبتن" جب ظہوری کے ہاں ہے تو باندھیے۔ یہ روزمرہ ہے اور ہم روزمرے میں اُن کے پیرو ہیں۔ "بے پیر" ایک لفظ ٹکسال باہر ہے ورنہ صاحبِ زباں ہونے میں اسیر بھی ظہوری سے کم نہیں:

زاہدا، این سخنت ہرزہ کہ گفتی، چہ شدی
حق غفورست، گناہے شدہ ام تا چہ شود

پہلے زاہد سے یہ سوال غلط کہ "چہ شدی"، ترا چہ شد، سوال ہو سکتا ہے۔ پھر "گناہے شدہ ام" یہ جواب مہمل۔ "گناہے کردہ ام" جواب ہو سکتا ہے۔ یہاں تم کہو گے کہ "ہمہ تن گناہ" یا "سراپا گناہ" یا "سراسر گناہ شدہ ام"۔ یہ جواب اُس جواب سے سراسر بے ربط ہے۔ جب تک "ہمہ تن گناہ" نہ ہو، معنی نہیں بنتے ہرگز ہرگز۔ اصلاح دیے ہوئے شعر میں مضمون تمھارا ہی رہا اور ٹکسال کے موافق ہو گیا۔ عجب ہے تم سے کہ صرف "شدہ ام" اور "تا چہ شود" کے پیوند میں اُلجھ کر حقیقتِ معنی سے غافل رہے:

باز آر دلِ خود از چنین کار
آزار چہ می کنی دِلم را

اہلی نے زبردستی کی ہے مگر ہاں، اُس نے ایک وجہ ٹھہرالی ہے، یعنی "آزردن" مصدر اور "آزارد" مضارع اور آزار امر۔ امر بہ معنی اسم جامد آتا ہے اور اسم جامد "کردن" کے ساتھ پیوند پاتا ہے۔ خیر، رہنے دو:

کند آں آہوے وحشی ز برم فردارم

یہ شعر موید میرے کلام کا ہے۔ برادرم و ”زردارم“ و ”سردارم“ و ”فردارم“ یہ سب الفاظ ایک طرح کے ہیں، الفِ ممدودہ کہیں نہیں۔ ہاں ”بودارد“ و ”زودارد“ و ”فرودارد“ تمھارے عقیدے کی تائید کرتا ہے۔ مگر یہ شعر اُستاد کا نہیں۔ مشائخ میں سے ایک بزرگ تھے مولانا علاء الدین: ما مقیمانِ کوے دلداریم

یہ ترجیع بند انھیں کا ہے۔ اُن کو فقر و فنا و سیر و سلوک میں سمجھنا چاہیے، نہ اندازِ کلام میں: پرمور است شمشیرے کہ برموے میان دارد

بھائی، خدا کی قسم یہ مصرع تلوار کی نازکی کی سند نہیں ہو سکتا۔ یہ تو ایک مضمون ہے ”کمر“ ”مور“، و ”تلوار“ پرِ مور۔ وجہ تشبیہ: علاقۂ پرِ مور با مور، مانندِ علاقۂ شمشیر با میان۔ نزاکت وجہ تشبیہ کبھی نہیں۔ انصاف شرط ہے، تلوار کی خوبی ”تیزی“ ہے یا ”نازکی“؟ یہ دھوکا نہ کھاؤ اور تلوار کو نازک نہ باندھو۔ ”خو“ میں اور ”تلوار“ میں مناسبت نہیں پائی جاتی۔ جانے دو، شعر سے ہاتھ اُٹھاؤ۔

میاں، ”خمیدن“ بھی صحیح اور ”چمیدن“ بھی صحیح۔ اس میں کس کو تردد ہے؟ مگر لغت اور محاورے اور اصطلاح میں قیاس پیش نہیں جاتا۔ ہندوستان کے بالتوُنی لوگوں کو ”خم و چم“ بولتے سُنا ہے۔ آج تک کسی نظم و نثرِ فارسی میں یہ لفظ نہیں دیکھا۔ لفظ پیارا، مجھ کو بھی پسند، مگر کیا کروں جو اپنے پیشواؤں سے نہ سُنا ہو اُس کو کیوں کر صحیح جانوں؟۔ ”چمید“ صیغہ ماضی کا ہے ”چمیدن“ سے اور ”چمیدن“ ایک مصدر ہے صحیح اور مسلّم۔ ”چمد“ مضارع۔ ”چم“ امر۔ اس میں کیا گفتگو ہے؟ کلام ”خم و چم“ میں ہے۔

سوالات ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر اُن کا جواب لکھ دیا، اب اشعار کو دیکھتا ہوں۔ خدا کرے مجھ سے کوئی سوال باقی نہ رہ گیا ہو اور تم بھی جب ان اوراقِ طلسمی کو دیکھو

تو کوئی اصلاح کا اشارہ تم سے باقی نہ رہ جائے۔ غرض یہ ہے کہ اب پھر اس طرح کبھی نہ لکھنا، میں بہت گھبراتا ہوں۔

”خمیدست“ و ”رسیدست“ میں ”نزنی دست“ یہ قافیہ درست ہے۔ مگر ”است“ کا الف سب جگہ اڑادو اور یاد رہے کہ صرف ”سین تے“ کافی ہے، ”الف“ ضرور نہیں۔

۱۸۴۷ء یا اس سے قبل غالب

(۲)

مہاراج!

آپ کا مہربانی نامہ پہنچا۔ دل میرا اگرچہ خوش نہ ہوا لیکن ناخوش بھی نہ رہا۔ بہ ہر حال مجھ کو، کہ نالائق و ذلیل ترین خلائق ہوں، اپنا دعاگو سمجھتے رہو۔ کیا کروں، اپنا شیوہ ترک نہیں کیا جاتا۔ وہ روش ہندوستانی فارسی لکھنے والوں کی مجھ کو نہیں آتی کہ بالکل بھاٹوں کی طرح بکنا شروع کریں۔ میرے قصیدے دیکھو، تشبیب کے شعر بہت پاؤ گے اور مدح کے شعر کم تر۔ نثر میں بھی یہی حال ہے۔ نواب مصطفیٰ خاں کے تذکرے کی تقریظ کو ملاحظہ کرو کہ اُن کی مدح کتنی ہے۔ مرزا رحیم الدین بہادر حیاؔ تخلص کے دیوان کے دیباچے کو دیکھو۔ وہ جو تقریظ دیوان حافظ کی، بہ موجب فرمائش جان جاکوب بہادر کے لکھی ہے، اُس کو دیکھو کہ فقط ایک بیت میں اُن کا نام اور اُن کی مدح آئی ہے اور باقی ساری نثر میں کچھ اور ہی اور مطالب ہیں۔ واللہ باللہ، اگر کسی شہزادے یا امیرزادے کے دیوان کا دیباچہ لکھتا تو اُس کی اتنی مدح نہ کرتا کہ جتنی تمھاری مدح کی ہے۔ ہم کو اور ہماری روش کو اگر پہچانتے تو اتنی مدح کو بہت جانتے۔ قصہ مختصر، تمھاری خاطر کی اور ایک فقرہ تمھارے نام کا بدل کر، اُس کے عوض ایک فقرہ اور لکھ دیا ہے۔ اس سے زیادہ بھٹئی میری روش نہیں۔ ظاہرا تم خود فکر نہیں کرتے، اور حضرات کے بہکانے میں آجاتے ہو۔ وہ صاحب تو بیش تر اس نظم و نثر کو

مہمل کہیں گے، کس واسطے کہ اُن کے کان اس آواز سے آشنا نہیں۔ جو لوگ کہ قتیلؔ کو اچھے لکھنے والوں میں جانیں گے، وہ نظم و نثر کی خوبی کو کیا پہچانیں گے؟

ہمارے شفیق منشی نبی بخش صاحب کو کیا عارضہ ہے کہ جس کو تم لکھتے ہو ماء الجبن سے بھی نہ گیا؟ ایک نسخہ طبِ محمد حسین خانی میں لکھا ہے اور وہ بہت بے ضرر اور بہت سودمند ہے مگر اثر اُس کا دیر میں ظاہر ہوتا ہے، وہ نسخہ یہ ہے کہ پان سات سیر پانی لیویں اور اُس میں سیر پیچھے تولہ بھر چوب چینی کوٹ کر ملا دیں اور اُس کو جوش کریں؛ اس قدر کہ چہارم پانی جل جاوے۔ پھر اُس باقی پانی کو چھان کر، کوری ٹھلیا میں بھر رکھیں اور جب باسی ہو جاوے، اُس کو پییں۔ جو غذا کھایا کرتے ہیں، کھایا کریں۔ پانی دن رات، جب پیاس لگے، یہی پییں۔ تبرید کی حاجت پڑے، اسی پانی میں پییں۔ روز جوش کروا کر، چھنوا کر رکھ چھوڑیں۔ برس دن میں اُس کا فائدہ معلوم ہوگا۔ میرا سلام کہہ کر یہ نسخہ عرض کر دینا۔ آگے اُن کو اختیار ہے۔

مئی ۱۸۴۸ء[۲]

(۳)

بھائی!

یہ مصرع جو تم کو بہم پہنچا ہے، فنِ تاریخ گوئی میں اس کو کرامت اور اعجاز کہتے ہیں۔ یہ مصرعِ سلمانؔ ساوجی و ظہیرؔ کا سا ہے۔ چار لفظ اور چاروں واقعے کے مناسب۔ یہ مصرع کہہ کر اور مصرع کی فکر کرنی کس واسطے؟ واہ واہ! سبحان اللہ!

اور یہ جو تم کو "فر" کے لفظ میں تردّد ہوا اور ایک سوکھا سہما شعر ظہوریؔ کا لکھا، بڑا تعجب ہے۔ یہ لفظ میرے ہاں "پنج آہنگ" میں دس ہزار جگہ آیا ہوگا۔ "فر" اور "فرّہ" لفظ فارسی ہے۔ مرادف "جاہ" کے۔ پس "جاہ" کو اور اس کو کس نے کہا ہے کہ بغیر ترکیب دیے نہ لکھیے؟ "عالی جاہ" اور "سکندر جاہ" اور "مظفر فر" اور

"فریدوں فر" یوں بھی درست اور صرف "جاہ" اور "فر" یوں بھی درست۔ اور ایک بات تم کو معلوم رہے کہ اس پورے خطاب کو "خطابِ بہادری" کہنا بہت بے جا ہے۔ سُنو، خطاب کے مراتب ہیں پہلے تو "خانی" کا خطاب ہے اور یہ بہت ضعیف ہے اور بہت کم ہے۔ مثلاً ایک شخص کا نام ہے: "میر محمد علی" یا "شیخ محمد علی" یا "محمد علی بیگ" اور اُس کو خاندانی بھی "خانی" نہیں حاصل۔ پس جب اُس کو بادشاہِ وقت "محمد علی خاں" کہہ دے تو گویا اُس کو "خانی" کا خطاب ملا اور جو شخص کہ اُس کا نام اصلی "محمد علی خاں" ہے یا تو وہ قوم افغان سے ہے یا "خانی" اُس کی خاندانی ہے۔ بادشاہ نے اس کو "محمد علی خاں بہادر" کہا۔ پس یہ خطاب "بہادری" کا ہے، اِس کو "بہادری" کا خطاب کہتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر خطاب "دولگی" کا ہے۔ یعنی مثلاً "محمد علی خاں بہادر"، اُس کو "منیر الدولہ محمد علی خاں بہادر" کہا۔ اب یہ خطاب "دولگی" کا ہوا، اس کو "بہادری کا خطاب" نہیں کہتے۔ اب اِس خطاب پر افزایش "جنگ" کی ہوتی ہے۔ "منیر الدولہ محمد علی خاں بہادر شوکت جنگ"۔ ابھی خطاب پورا نہیں۔ پورا جب ہوگا کہ جب "ملک" بھی ہو۔ پس پورے خطاب کو "خطابِ بہادری" لکھنا غلط ہے۔ یہ واسطے تمھارے معلوم رہنے کے لکھا گیا ہے۔

اب آپ اس سات بیت کے قطعے کو اپنے دیوان میں داخل اور شامل کر دیجیے، یعنی قطعوں میں لکھ دیجیے۔ جب تمھارا دیوان چھاپا جاوے گا، یہ قطعہ بھی چھپ جاوے گا۔ مگر ہاں، منشی صاحب[2] کے سامنے اِس کو پڑھیے اور اُن سے استدعا کیجیے کہ اس کو آگرے بھیجیے تا کہ چھاپا ہو جاوے "اسعد الاخبار" میں اور "زبدۃ الاخبار" میں۔ یقین ہے کہ وہ تمھارے کہنے سے عمل میں لاویں گے۔ مجھ کو کیا ضرور ہے کہ میں لکھوں۔ میں نے یہاں "صادق الاخبار" میں چھپوا دیا ہے۔

اگست سنہ ۱۸۵۰ء[3]

(۴)

کیوں مہاراج؟

کول میں آنا اور جناب منشی نبی بخش صاحب کے ساتھ غزل خوانی کرنی اور ہم کو یاد نہ لانا! مجھ سے پوچھو کہ میں نے کیوں کر جانا کہ تم مجھ کو بھول گئے۔ کول میں آئے اور مجھ کو اپنے آنے کی اطلاع نہ دی، نہ لکھا کہ میں کیوں کر آیا ہوں اور کب آیا ہوں اور کب تک رہوں گا اور کب جاؤں گا اور بابو صاحب سے کہاں جا ملوں گا۔ خیر، اب جو میں نے بے حیائی کر کے تم کو خط لکھا ہے، لازم ہے کہ میرا قصور معاف کرو اور مجھ کو ساری اپنی حقیقت لکھو۔

تمھارے ہاتھ کی لکھی ہوئی غزلیں، بابو صاحب کی، میرے پاس موجود ہیں اور اصلاح پا چکی ہیں۔ اب میں حیران ہوں کہ کہاں بھیجوں؟ ہر چند انھوں نے لکھا ہے کہ اکبر آباد، ہاشم علی خاں کو بھیج دو لیکن میں نہ بھیجوں گا۔ جب وہ اجمیر یا بھرت پور پہنچ کر مجھ کو خط لکھیں گے تو میں اُن کو وہ اوراق ارسال کروں گا یا تم جو لکھو گے، اُس پر عمل کروں گا۔

بھائی! ایک دن شراب نہ پیو یا کم پیو اور ہم کو دو چار سطریں لکھ بھیجو کہ ہمارا دھیان تم میں لگا ہوا ہے۔

رقم زدہ یک شنبہ چہارم جنوری ۱۸۵۲ء

اسد اللہ

(۵)

شفیق بالتحقیق منشی ہر گوپال تفتہ ہمیشہ سلامت رہیں۔ آپ کا وہ خط، جو آپ نے کانپور سے بھیجا تھا، پہنچا۔ بابو صاحب کے سیر و سفر کا حال اور آپ کا لکھنؤ جانا اور وہاں کے شعرا سے ملنا، سب معلوم ہوا۔ اشعار جناب رند کے، پہنچنے کے ایک ہفتے کے بعد درست ہو گئے اور اصلاح اور اشارے اور فوائد، جیسا کہ میرا شیوہ ہے، عمل میں

آیا۔ جب تک کہ اُن کا یا تمھارا خط نہ آوے اور اقامت گاہ معلوم نہ ہو، میں وہ کواغذ ضروری کہاں بھیجوں اور کیوں کر بھیجوں اور کیوں بھیجوں ؟ اب جو تمھارے لکھنے سے جانا کہ اُنیس فروری تک اکبرآباد آؤ گے تو میں نے یہ خط تمھارے نام لکھ کر لفافہ کمر رکھا ہے۔ آج اُنیسویں ہے، پرسوں، اکیسویں کو لفافہ آگرے کو روانہ ہوگا۔ بابو صاحب کو میں نے خط اس واسطے نہیں لکھا کہ جو کچھ لکھنا چاہیے تھا، وہ خاتمۂ اوراقِ اشعار پر لکھ دیا ہے۔ تم کو چاہیے کہ اُن کی خدمت میں میرا سلام پہنچاؤ اور سفر کے انجام اور حصولِ مرام کی مبارکباد دو اور اوراقِ اشعار گزرانو اور یہ عرض کرو کہ جو عبارت خاتمے پر مرقوم ہے اُس کو غور سے پڑھیے اور اپنا دستور العمل گردانیے؛ نہ یہ کہ سرسری دیکھیے اور بھول جائیے۔ بس، تمام ہوا وہ پیام کہ جو بابو صاحب کی خدمت میں تھا۔

اب پھر تم سے کہتا ہوں کہ وہ جو تم نے اُس شخص "کوئی" کا حال لکھا تھا، معلوم ہوا۔ ہر چند اعتراض اُن کا لغو اور پرسش اُن کی بے مزہ ہو، مگر ہمارا یہ منصب نہیں کہ معترض کو جواب نہ دیں یا سائل سے بات نہ کریں۔ تمھارے شعر پر اعتراض، اس راہ سے کہ وہ ہمارا دیکھا ہوا ہے، گویا ہم پر ہے۔ اس سے ہمیں کام نہیں کہ وہ مانیں یا نہ مانیں۔ کلام ہمارا اپنے نفس میں معقول و استوار ہے۔ جو زبان داں ہوگا، وہ سمجھ لے گا۔ غلط فہم و کج اندیش لوگ نہ سمجھیں، نہ سمجھیں۔ ہم کو تمام خلق کی تہذیب و تلقین سے کیا علاقہ؟ تعلیم و تلقین واسطے دوستوں کے اور یاروں کے ہے، نہ واسطے اغیار کے۔ تمھیں یاد ہوگا کہ میں نے تمھیں بارہا سمجھایا ہے کہ خود غلطی پر نہ رہو اور غیر کی غلطی سے کام نہ رکھو۔ آج تمھارا کلام وہ نہیں کہ کوئی اُس پر گرفت کر سکے مگر ہاں: حسود را چہ کنم کو ز خود برنج درست

والسلام والاکرام۔

رقم زدہ ۱۹ فروری و مرسلہ بست و یکم فروری ۱۸۵۲ء   اسد اللہ

(۶)

بندہ پرور بیشی از بیش و کم از کم یہ ترکیب بہت فصیح ہے اسکو کون منع کرتا ہے اور جلال اسیر کی
یہ بیت بہت پاکیزہ اور خوب ہے اسکے معنے یہ ہیں کہ در زمان غم ہجر بیشی از بیش شد و در زمان تو
وفا کم از کم شد اتنا کیا کہیگا اسمیں تو تین تکرار کا لف و نشر ہے غم اور تو مہر اور وفا بیشی از بیش
اور کم از کم کا یارا ہے کہ بیشتر از بیش اور کمتر از کم اگرچہ بحسب معنے جائز ہے لیکن فصاحت اسمیں
کم ہے بیشی از بیش و کم از کم افصح ہے وہ شعر تمہارا خوب ہے اور ہمارا دیکھا ہوا ہے سے قرار تو بیش
غم ایم کم و لے صبر بیش است ترا کم است مارا لیکن ان پہلے مصرعوں میں اگر کمتر ہوتا تو اور اچھا تھا
بہرحال اتنا خیال رہے کہ ایسے جگہ تر کا لفظ افصح ہے چنانچہ میرا شعر ہے سے جلوہ کن منت منہ
از ذرہ کمتر نیستم حسن با این تابناکے آفتاب بیش نیست سے ورنہ چشم توجہ از روزن دیوار کم
بیناست بہت ہے اوپر معلوم ہوتا ہے اور نرا ہندی کا ترجمہ رہ جاتا ہے فارسیت نہیں رہتی کے
سہل شمار زندگانی را مجھکو یاد پڑتا ہے کہ میں نے اس مطلع کو یوں درست کر دیا ہے سے
رایگان است زندگانی را میتوان کرد جان فدا نے را اور اس صورت میں یہ مطلع اب
ہو گیا تھا کہ میرے دل میں آئے تب ہم تمکو نہ ڈھونڈیں اور خود اسی زمین میں غزل لکھوں مگر
پھر میں نے ختم کی اور تمکو دیدیا حضرت نے ملاحظہ نہیں فرمایا یہ خط جو آپ نے
مجھکو لکھا ہے شمار کے نسخے میں لکھا ہے اور وہ اصلاحی اوراق بھی اسی عالم میں ملاحظہ
فرماتے ہیں اب یہ کلمہ تاکہ زر زندگانی را اسکو موقوف کیں اور وہ مطلع رہنے دیں کہ وہ
بہت خوب ہے بعینہ مولانا ظہوری کا معلوم ہوتا ہے۔ ہاں ہمارے اوراق اصلاحی کو غور سے
دیکھا کرو ہماری محنت تو ضائع نجاوے کی آیا ہرچند میں جمع کیے ایسے کیلیے ہو

نہیں ہے بلکہ فقیر کے نزدیک جمع کا جمع بھی نہیں ہے مثلاً معانی حسنہ اور احکام حسنہ اور
اسرار حسنہ یہ آدمی لکھ سکتا ہے مگر ان آمال کی یہ کچھ شہرت ہے سے خطای بزرگان
گرفتن خطاست ہمکو اپنی تہذیب سے کام ہے اغلاط میں سند کیوں ڈھونڈتے پھریں
مثلاً حضرت حافظ نے کہا ہے سے صلاح کار کجا و من خراب کجا ۔ ببین تفاوت رہ از کجاست تا بکجا
میری رائے ایسے موقع میں یہ چاہیئے کہ بزرگوں کے کلام کو ہم مورد اعتراض نکریں اور خود اسکے

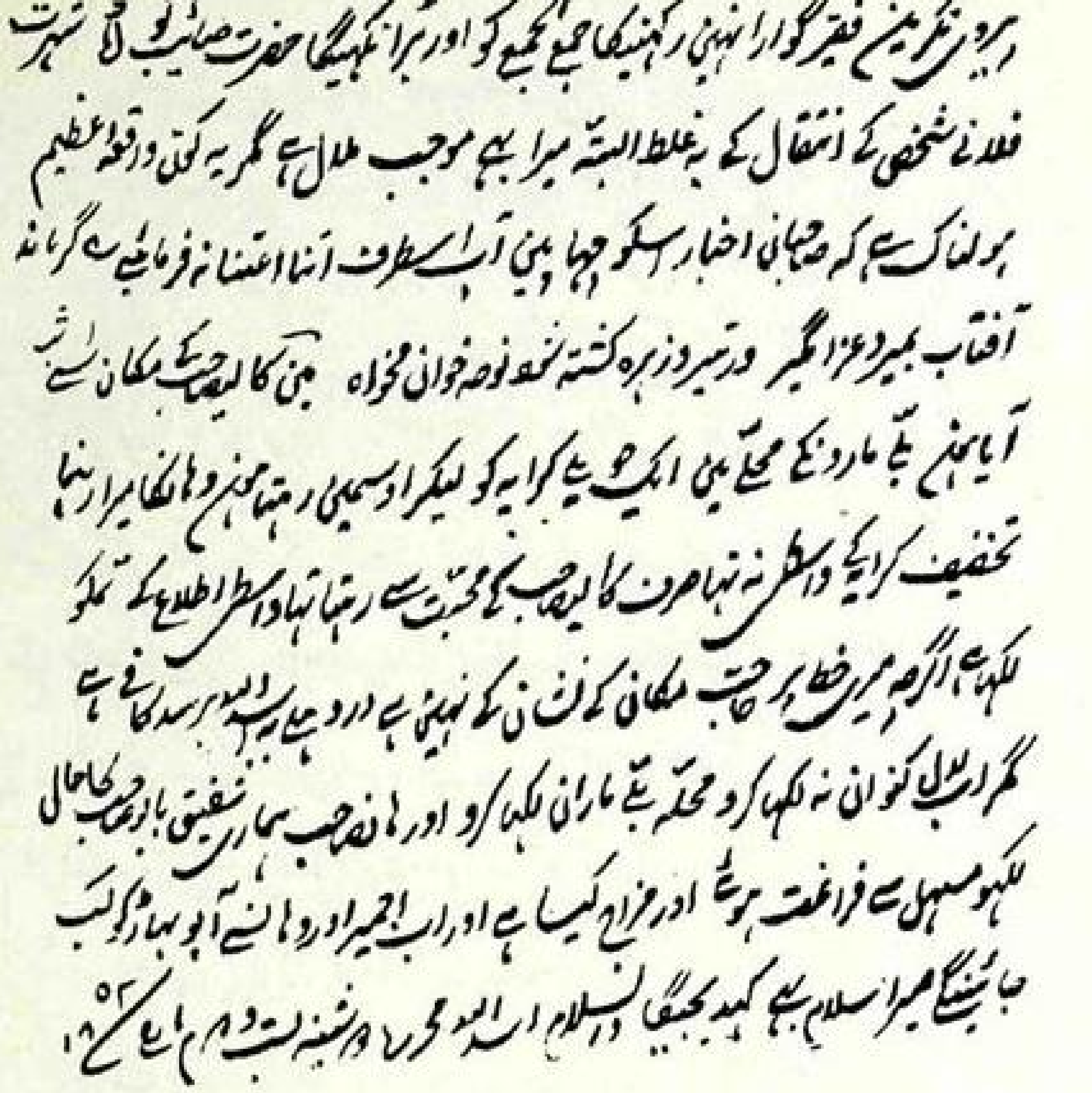

ریویو نمبر میں فقیر گوارا نہیں رکھتا جمع تجمیع کو اور برا کہیگا حضرت صاحب کو کہ شہرت
فلانے شخص کے انتقال کی بہ غلط البتہ میرا بھی موجب ملال ہے مگر یہ کونسی واقعہ عظیم
ہولناک ہے کہ صاحبان اخبار اسکو چھاپیں آپ اس طرف اتنا اعتنا نہ فرمائیے گر مانند
آفتاب بمیرد عزا مگیر ور بمیرد ذرہ کشتہ نشد نوحہ خوان مخواہ میں کالے صاحب کے مکان سے اٹھ
آیا ہوں بلی ماروں کے محلے میں ایک حویلی کرایہ کو لیکر اوسمیں رہتا ہوں وہاں کا میرا رہنا
تخفیف کرایہ کے واسطے نہ تھا صرف کالے صاحب کی محبت سے رہتا تھا اس واسطے اطلاع کے تمکو
لکھا ہے اگرچہ میرے خط پر حاجت مکان کے نشان کی نہیں ہے درود بہ دلی بہ رسد کافی ہے
مگر احتیاط کیوں نہ لکھا کرو محلہ بلی ماران لکھا کرو اور ہاں صاحب ہمارے شفیق بابو صاحب کا حال
لکھو مسہل سے فراغت ہو گئی اور مزاج کیسا ہے اور اب اجمیر اور وہاں سے آبو پہاڑ کو کب
جائینگے میرا سلام بعد کہیو بحجتی والسلام اسد اللہ محررہ دوشنبہ بست و دوم اپریل ۱۸۵۲ء

بندہ پرور!

"بیش از بیش و کم از کم" یہ ترکیب بہت فصیح ہے، اس کو کون منع کرتا ہے؟ اور جلال اسیر کی یہ بیت بہت پاکیزہ اور خوب ہے۔ اس کے معنی یہی ہیں کہ "در زمانِ من مہر بیش از بیش شد و در زمانِ تو وفا کم از کم شد"۔ استاد کیا کہے گا؟ اس میں تو تین ٹکڑے کا لف و نشر ہے: "من اور تو" "مہر اور وفا"، "بیش از بیش" اور "کم از کم"۔ یاد رہے کہ بیشتر از بیش اور کمتر از کم" اگرچہ بہ حسبِ معنی جائز ہے لیکن فصاحت اس میں کم ہے۔ "بیش از بیش و کم از کم" افصح ہے۔ وہ شعر تمھارا خوب ہے اور ہمارا دیکھا ہوا ہے:

قیس! از تو نہ ایم کم، ولے صبر۔ بیش است ترا، کم است مارا

لیکن ہاں پہلے مصرع میں اگر "کمتر" ہوتا تو اور اچھا تھا۔ بہ ہر حال، اتنا خیال رہے کہ ایسی جگہ "تر" کا لفظ افصح ہے، چنانچہ میرا شعر ہے:

جلوہ کن، منت منہ، از ذرّہ کمتر نیستم
حسن با ایں تابناکی، آفتابے بیش نیست

" ورنہ چشم توجہ از روزنِ دیوار کم است"۔ یہاں بہت ہی اوپری معلوم ہوتا ہے اور نرا ہندی کا ترجمہ رہ جاتا ہے، فارسیت نہیں رہتی۔ " سہل مشمار زندگانی ہا"۔ مجھ کو یاد پڑتا ہے کہ میں نے اس مطلع کو یوں درست کر دیا ہے:

رایگاں است زندگانی ہا
می تواں کرد جانفشانی ہا

اور اس صورت میں یہ مطلع ایسا ہو گیا تھا کہ میرے دل میں آئی تھی کہ تم کو نہ دوں اور خود اس زمین میں غزل لکھوں مگر پھر میں نے خست نہ کی اور تم کو دے دیا۔ حضرت نے ملاحظہ نہیں فرمایا! یہ خط جو آپ نے مجھے لکھا ہے، شراب کے نشے میں لکھا ہے، اور وہ اصلاحی اوراق بھی اُسی عالم میں ملاحظہ فرمائے ہیں۔ اب " گلہ تا کے ز زندگانی ہا" اس کو موقوف کیجیے اور وہ مطلع رہنے دیجیے، کہ وہ بہت خوب ہے؛ بلعینہٖ مولانا ظہوری کا معلوم ہوتا ہے۔ بھائی! ہمارے اوراقِ اصلاحی کو غور سے دیکھا کرو، ہماری محنت تو ضائع نہ جاوے۔

" ایامے چند" میں جمع الجمع ایسی کھلی ہوئی نہیں ہے، بلکہ فقیر کے نزدیک جمع الجمع ہی نہیں ہے۔ مثلاً معانیِ چند" اور " احکامِ چند" اور " اسرارِ چند" یہ آدمی لکھ سکتا ہے مگر ہاں " آماں ہا" یہ کھلی سورٹھ ہے۔ "خطائے بزرگان گرفتن خطاست"۔ ہم کو اپنی تہذیب سے کام ہے۔ اغلاط میں سند کیوں ڈھونڈتے پھریں۔ مثلاً حضرت حافظ نے لکھا ہے:

صلاح کار کجا و منِ خراب کجا
ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا

میری جان ایسے موقع میں یہ چاہیے کہ بزرگوں کے کلام کو ہم موردِ اعتراض نہ کریں اور خود اس کی پیروی نہ کریں۔ فقیر گوارا نہیں رکھنے کا جمع الجمع کو اور بُرا نہ کہے گا حضرت صائب کو۔

شہرت فلانے شخص کے انتقال کی یہ غلط، البتہ میرا بھی موجبِ ملال ہے مگر یہ کون واقعۂ عظیم ہولناک ہے کہ صاحبانِ اخبار اِس کو چھاپیں۔ آپ اِس طرف اتنا اعتنا نہ فرمائیے:

گر ماہ و آفتاب بمیرد، عزا مگیر
ور تیر و زہرہ کشتہ شود، نوحہ خواں مخواہ

میں کالے صاحب کے مکان سے اُٹھ آیا ہوں[۲]۔ بلی ماروں کے محلے میں ایک حویلی کرایے کو لے کر اُس میں رہتا ہوں۔ وہاں کا میرا رہنا، تخفیفِ کرایہ کے واسطے نہ تھا، صرف کالے صاحب کی محبت سے رہتا تھا۔ واسطے اطلاع کے تم کو لکھا ہے۔ اگرچہ میرے خط پر حاجت مکان کے نشان کی نہیں ہے "در دہلی بہ اسد اللہ برسد" کافی ہے، مگر اب "لال کنواں" نہ لکھا کرو، محلہ "بلی ماراں" لکھا کرو۔

اور ہاں صاحب، ہمارے شفیق بابو صاحب کا حال لکھو۔ مسہل سے فراغت ہوئی؟ اور مزاج کیسا ہے؟ اور اب اجمیر اور وہاں سے آبو پہاڑ کو کب جائیں گے؟ میرا سلام بھی کہہ دیجے گا۔ والسلام۔

محررۂ دوشنبہ بست و دوم مارچ ۱۸۵۲ء
اسد اللہ

(۷)

کاشانۂ دل کے ماہِ دو ہفتہ، منشی ہرگوپال تفتہ! تحریر میں کیا کیا سحر طرازیاں[۳] کرتے ہیں۔ اب ضرور آ پڑا ہے کہ ہم بھی جواب اُسی انداز سے لکھیں۔ سنو صاحب!

یہ تم جانتے ہو کہ زین العابدین خاں مرحوم میرا فرزند تھا اور اب اُس کے دونوں بچے کہ وہ میرے پوتے ہیں، میرے پاس آ رہے ہیں اور دم بہ دم مجھ کو ستاتے ہیں اور میں تحمل کرتا ہوں۔ خدا گواہ ہے کہ میں تم کو اپنے فرزند کی جگہ سمجھتا ہوں۔ پس، تمھارے نتائجِ طبع، میرے معنوی پوتے ہوئے۔ جب اُن عالمِ صورت کے پوتوں سے، کہ مجھے کھانا نہیں کھانے دیتے، مجھ کو دوپہر کو سونے نہیں دیتے، ننگے ننگے پاؤں میرے پلنگ پر رکھتے ہیں، کہیں پانی لڑھاتے ہیں، کہیں خاک اُڑاتے ہیں؛ میں نہیں تنگ آتا تو اُن معنوی پوتوں سے کہ اُن میں یہ باتیں نہیں ہیں، کیوں گھبراؤں گا؟ آپ اُن کو جلد میرے پاس بہ سبیلِ ڈاک بھیج دیجیے کہ میں اُن کو دیکھوں۔ وعدہ کرتا ہوں کہ پھر جلد اُن کو تمھارے پاس بہ سبیلِ ڈاک بھیج دوں گا۔ حق تعالیٰ تمھارے عالمِ صورت کے بچوں کو جیتا رکھے اور اُن کو دولت و اقبال دے اور تم کو اُن کے سر پر سلامت رکھے اور تمھارے معنوی بچوں، یعنی نتائجِ طبع کو فروغِ شہرت اور حسنِ قبول عطا فرمادے۔

بابو صاحب کے نام کا خط، اُن کے خط کے جواب میں پہنچتا ہے، اُن کو دے دیجیے گا۔ اور ہاں صاحب، بابو صاحب اور تم آبو کو جانے لگو تو مجھ کو اطلاع کرنا اور تاریخِ روانگی لکھ بھیجنا تاکہ میں بے خبر نہ رہوں۔ والدعا۔

نگاشتہ جمعہ ۱۸ جون ۱۸۵۲ء   اسد اللہ

(۸)

کل تمھارا خط آیا، رازِ نہانی مجھ پر آشکارا ہوا۔ میں سمجھا ہوا تھا کہ تم دیوانگی اور شورش کر رہے ہو، اب معلوم ہوا کہ حق بجانب تمھارے ہے۔ میں جو اپنے عزیز کو نصیحت کرتا ہوں تو اپنے نفس کو مخاطب کر کے کہتا ہوں کہ اے دل!

تو اپنے کو اس عزیز کی جگہ سمجھ کر تصور کر کہ اگر تجھ پر یہ حادثہ پڑا ہوتا یا تو اس بلا میں گرفتار ہوا ہوتا، تو کیا کرتا؟ عِیَاذًا بِاللّٰہ! اب میں تم کو کیوں کر کہوں کہ یہ بے حرمتی گوارا کرو اور رفاقت نہ چھوڑو بلکہ یہ بھی زائد ہے جو دوست سے کہیے کہ تو ہمارے واسطے اس کو ترک کر۔ بہ ہر حال، دوست کی دوستی سے کام ہے، اُس کے افعال سے کیا غرض۔ جو محبت و اخلاص اُن میں تم میں ہے، بہ دستور بلکہ روز افزوں رہے۔ ساتھ رہنا اور پاس رہنا نہیں ہے، نہ سہی:

وصلے کہ درآں ملال باشد
ہجراں بہ ازاں وصال باشد

آمدم برسرِ مدعا؛ تمھاری رائے ہم کو اس باب میں پسند۔ عجب طرح کا پیچ پڑا کہ نکل نہیں سکتا۔ نہ تم کو سمجھا سکتا ہوں اور نہ اُن کو کچھ کہہ سکتا ہوں۔ مجھے تو اس موقع میں سوائے اس کے کہ تماشائیِ نیرنگِ قضا و قدر بنا رہوں، کچھ بن نہیں آتی:

بہ بینیم کہ تا کردگارِ جہاں
دریں آشکارا چہ دارد نہاں

جے پور کا [۲]اَمر محض اتفاقی ہے، بے قصد و بے فکر درپیش آیا ہے۔ ہوسناکانہ ادھر متوجہ ہوا ہوں۔ بوڑھا ہو گیا ہوں، بہرا ہو گیا ہوں۔ سرکارِ انگریزی میں بڑا پایہ رکھتا تھا، رئیس زادوں میں گنا جاتا تھا، پورا خلعت پاتا تھا؛ اب بدنام ہو گیا ہوں اور ایک بہت بڑا دھبا لگ گیا ہے[۳]۔ کسی ریاست میں دخل کر نہیں سکتا تھا مگر ہاں، استاد یا پیر یا مداح بن کر راہ و رسم پیدا کروں؛ کچھ آپ فائدہ اٹھاؤں کچھ اپنے کسی عزیز کو وہاں داخل کردوں۔ دیکھو کیا صورت پیدا ہوتی ہے:

تا نہالِ دوستی کے بر دہد
حالیا رفتیم و تخمے کاشتیم

صحاف بک کے ہاں سے دیوان ابھی نہیں آیا، آج کل آجائے گا؛ پھر اُس کے جزودان کی تیاری کر کے روانہ کر دں گا۔ ابھی کول میں آرام کرو، اپنے بچوں میں اپنا دل بہلاؤ۔ اگر جی چاہے تو اکبرآباد چلے جائیو، وہاں اپنا دل بہلائیو۔ دیکھو اس خودداری میں اُدھر سے کیا ہوتا ہے اور وہ کیا کرتے ہیں۔ والسّلام۔

جمعہ دہم دسمبر ۱۸۵۲ء اسداللہ

(۹)

صاحب!

دیکھو پھر تم دنگا کرتے ہو۔ وہی "بیش و بیشتر" کا قصہ نکلا۔ غلطی میں جمہور کی پیروی کیا فرض ہے؟ یاد رکھو، یاے تحتانی تین طرح پر ہے: جزوِ کلمہ:

مصرع: ہماے بر سرِ مرغان ازاں شرف دارد
مصرع: اے سرنامہ نام تو عقل گرہ کشاے را

یہ ساری غزل اور مثل اِس کے جہاں یاے تحتانی ہے، جزوِ کلمہ ہے۔ اس پر ہمزہ لکھنا، گویا عقل کو گالی دینا ہے۔

دوسرے تحتانیِ مضاف ہے۔ صرف اضافت کا کسرہ ہے، ہمزہ وہاں بھی مخل ہے، جیسے: آسیاے چرخ یا آشناے قدیم۔ توصیفی، اضافی، بیانی کسی طرح کا کسرہ ہو، ہمزہ نہیں چاہتا۔ "فداے تو شوم"۔ "رہنماے تو شوم" یہ بھی اسی قبیل سے ہے۔

تیسرے دو طرح پر ہے: یاۓ مصدری اور وہ معروف ہوگی۔ دوسرے طرح: توحید و تنکیر۔ وہ مجہول ہوگی۔ مثلاً مصدری: "آشنائی"۔ یہاں ہمزہ ضرور بلکہ ہمزہ نہ لکھنا عقل کا قصور۔ توحیدی: "آشنائے" یعنی ایک آشنا یا کوئی آشنا۔ یہاں جب تک ہمزہ نہ لکھوگے، دانا نہ کہاؤ گے۔

”نیم گناہ“ و ”نیم نگاہ“ و ”نیم ناز“ یہ روزمرۂ اہلِ زبان ہے۔ ”نیم“ بہ معنی اندک۔ ورنہ گناہ کا آدھا اور نگاہ کی ادھواڑ اور ناز آدھا؛ یہ مہملات میں ہے، ان چیزوں کا مناصفہ کیا؟ اگر تم کو ”نیم گناہ“ پسند نہیں، ”تازہ گناہ“ رہنے دو۔

”خستہ“، ”بستہ“، ”تازہ“، ”غازہ“، ”خانہ“، ”دانہ“، ”آوارہ“، ”بیچارہ“، ”روزہ“، ”بوزہ“، ہزار لفظ ہیں کہ ان کے آگے جب یائے توحید آتی ہے تو اُس کی علامت کے واسطے ہمزہ لکھ دیتے ہیں۔ ”زرہ“، ”گرہ“، ”کلاہ“، ”شاہ“، ”آگاہ“، ”آگہ“، ”صبحگاہ“، ”صبحگہ“: ایسے الفاظ کے آگے اگر تحتانی آتی ہے تو ”زرہے“ ”گرہے“ ”کلاہے“ ”شاہے“ ”آگاہے“ ”آگہے“ ”گاہے“ ”گہے“ لکھ دیتے ہیں۔

۱۸۵۲ء
غالب

(۱۰)

واہ، کیا خوبیِ قسمت ہے میری! بہت دن سے دھیان لگا ہوا تھا کہ اب منشی جی کا خط آتا ہے اور اُن کی خیر و عافیت معلوم ہوتی ہے۔ خط آیا اور خیر و عافیت معلوم نہ ہوئی۔ یعنی معلوم ہوا کہ خیر نہیں ہے اور پاؤں میں چوٹ لگی ہے۔ سنو صاحب! یہ بھی غنیمت ہے کہ ہڈی کو صدمہ نہیں پہنچا۔ اتنا پھیلاوا بھی اس سبب سے ہوا کہ کوئی مالش کرنے والا نہ ملا اور چوٹ کہنہ ہو گئی، البتہ کچھ دیر میں افاقت ہو گی۔ بعد افاقت ہونے کے، تم مجھ کو اطلاع کرنے میں دیر نہ کرنا۔ میرا دھیان لگا ہوا ہے۔

بابو صاحب کا خط آیا تھا، پھر انھوں نے تکلیف کی اور وہ کچھ بھیجا جو آگے بھیجا تھا۔ تمھاری مفارقت سے بہت ملول ہیں۔ طرزِ تحریر سے فراوانیِ محبت معلوم ہوتی تھی۔ میں نے اُن کو لکھ بھیجا ہے کہ منشی جی گئے نہیں، ضرورت کو کیا کریں؟ جلد پھر آئیں گے۔ آپ اُن کو اپنے پاس ہی تصور فرمائیے۔

بابو ہرگوبند سنگھ تعطیل میں کول گئے ہوں گے جو آپ کے خط میں اُن کی بندگی لکھی آئی۔ کیوں انھوں نے تکلیف کی؟ بہ ہمہ جہت دو سو قدم پر میرے گھر سے اُن کا مکان اور وہ جاتے وقت مجھ سے رخصت نہ ہو گئے، اب بندگی سلام کیا ضرور؟

ہاں صاحب، یہ تم نے اور بابو صاحب نے کیا سمجھا ہے کہ میرے خط کے سرنامے پر "املی کے محلے" کا پتا لکھتے ہو۔ میں بلّی ماروں میں رہتا ہوں۔ املی کا محلہ یہاں سے بے مبالغہ آدھ کوس ہے۔ وہ تو ڈاک کے ہرکارے مجھ کو جانتے ہیں، ورنہ خط ہرزہ پھرا کرے۔ آگے کالے صاحب کے مکان میں رہتا تھا، اب بلّی ماروں میں کرایے کی حویلی میں رہتا ہوں۔ املی کا محلہ کہاں اور میں کہاں۔

منشی جی کو لکھتے ہو کہ حاکم کے ساتھ گئے ہیں اور پھر لکھتے ہو کہ نہ دورے ہیں، بلکہ اپنے کام کو۔ بہ ہر صورت، اب آ گئے ہوں گے، میرا سلام کہیے گا اور اپنی خیر و عافیت کے ساتھ اُن کی معاودت کی خبر لکھیے گا ورنہ مجھ کو خط لکھنے میں تامل رہے گا۔

"نظر شگفتن" و "گوش شگفتن"، ہم نہیں جانتے، اگرچہ منشی ہرگوپال تفتہ اور مولانا نورالدین ظہوری نے لکھا ہو:

نظارہ را ز خونِ دلم گل در آستیں
خونش مگو، بگو کہ ز چشم چمن چکید

یہ نہ سمجھنا کہ "چمن از چشم چکیدن" "شگفتنِ گوش و نظر" کی مانند غرابت رکھتا ہے۔ یہ "خونفشانیِ چشم" کا استعارہ ہے اور "خونفشانی" صفتِ چشم ہو سکتی ہے۔ اگر "نظر کا خوش ہونا" اور "کان کا شاد ہونا" جائز ہوتا تو ہم اُس کا استعارہ بہ شگفتگی کر لیتے۔ "خوش ہونا" جب صفتِ چشم و گوش نہ ہو تو ہم کیا کریں؟

یاد رہے یہ نکات سوائے تمھارے اور کو میں نہیں بتاتا ہوں۔ میری بات

کو غور کر کے سمجھ لیا کرو۔ میں پوچھنے سے اور تکرار سے ناخوش نہیں ہوتا بلکہ خوش ہوتا ہوں مگر ہاں، ایسی تکرار جیسی "بیش اور بیشتر" کے باب میں کی تھی، ناگوار گزرتی ہے کہ وہ صریح تہمت تھی مجھ پر۔ جو میں آپ لکھوں گا، تم کو اُس کے لکھنے کو کیوں منع کروں گا؟:

اے صد ہزار رازِ نہاں اندریں سخن
گر کم سخن توئی، نکہت کم سخن مباد
ہر چہ با نفس خود کنم ز بدی
نیکیش نام می توانم کرد

یہ دونوں شعر بے سقم ہیں، رہنے دو:

سر نا کامیم سلامت باد
کام را کام می توانم کرد

میں نہیں سمجھا کہ اس کے معنی کیا ہیں؟ کام کو کام سب کر سکتے ہیں، اس میں لُطف کیا ہے؟:

ز نزکتازیِ آں نازنیں سوار ہنوز
ز سبزہ میدمد انگشتِ زینہار ہنوز

حزیں کے اس مطلع میں واقعی ایک "ہنوز" زائد اور بے ہودہ ہے؛ متتبع کے واسطے سند نہیں ہو سکتا۔ یہ غلطِ محض ہے، یہ سقم ہے، یہ عیب ہے، اس کی کون پیروی کرے گا؛ حزیں تو آدمی تھا؛ یہ مطلع اگر جبرئیل کا ہو تو اس کو سند نہ جانو اور اس کی پیروی نہ کرو۔

بھائی، تمھارا مصرع اس قبیل سے نہیں ہے۔ اُس میں تو "مکنید" متممِ معنی ہے، "مکنید" زائد نہیں ہے۔ مگر خرابی یہ کہ اگر فارسی رہنے دو تو اور اگر

ہندی کرو تو، مصرع مہمل اور بے معنی ہے:

چہ گل چہ لالہ چہ نسرین چہ نسترن مکنید

کیا گلاب کا پھول، کیا لالہ، کیا موتیا، کیا چنبیا نہ کرو، زنہار نہ کرو۔ یعنی کیا نہ کرو؟ اب جب تمھیں کہو کہ صاحب ذکر نہ کرو، تب کوئی جانے ورنہ کبھی جانا نہیں جاتا کہ ذکر نہ کرو۔ اے، تم نے کہا بھی کہ ہمارا مقصود یہ ہے کہ ذکر نہ کرو۔ حضرت! "ذکر" مضاف کیوں کر ہو سکتا ہے گل و لالہ و نسرین و نسترن کی طرف؟ کہو گے کہ "ذکر" کا لفظ نہیں، "بیان" کا لفظ اوپر کے مصرع میں ہے۔ وہ "بیان" کا لفظ رستوں سے اور زنجیروں سے ان چار لفظوں سے ربط نہیں پاتا۔ مطلع لکھو، قطعہ لکھو، ترجیع بند لکھو یہ مصرع معنی دینے ہی کا نہیں، مہملِ محض ہے۔ والسلام۔

دسمبر ۱۸۵۲ء اسداللہ

(۱۱)

بھائی!

پرسوں شام کو ڈاک کا ہرکارہ آیا اور ایک خط تمھارا اور ایک خط جانی جی کا لایا۔ تمھارے خط میں اوراقِ اشعار اور بابو صاحب کے خط میں جے پور کے اخبار؛ دو دن سے مجھ کو وجع الصدر ہے اور میں بہت بے چین ہوں، ابھی اشعار کو دیکھ نہیں سکتا۔ بابو صاحب کے بھیجے ہوئے کاغذ تم کو بھیجتا ہوں، اشعار بعد دو چار روز کے بھیجے جائیں گے۔

مرسلہ جمعہ ۲۵ فروری ۱۸۵۳ء اسداللہ

(۱۲)

بھائی!

آج مجھ کو بڑی تشویش ہے اور یہ خط میں تم کو کمال سراسیمگی میں لکھتا ہوں۔ جس دن میرا خط پہنچے، اگر وقت ڈاک کا ہو تو اسی وقت جواب لکھ کر روانہ کرو اور اگر وقت نہ رہا ہو تو ناچار دوسرے دن جواب بھیجو۔ منشا تشویش واضطراب

کا یہ ہے کہ کئی دن سے راجا بھرت پور کی بیماری کی خبر سنی جاتی تھی۔ کل سے اور بُری خبر شہر میں مشہور ہے۔ تم بھرت پور سے قریب ہو، یقین ہے کہ تم کو تحقیق حال معلوم ہوگا۔ جلد لکھو کہ کیا صورت ہے؟ راجا کا مجھ کو غم نہیں، مجھ کو فکر جانی جی کی ہے کہ اُسی علاقے میں تم بھی شامل ہو۔ صاحبانِ انگریز نے ریاستوں کے باب میں ایک قانون وضع کیا ہے یعنی جو رئیس مرجاتا ہے، سرکار اُس ریاست پر قابض و متصرف ہوکر رئیس زادے کے بالغ ہونے تک بندوبست ریاست کا اپنے طور پر رکھتی ہے۔ سرکاری بندوبست میں کوئی قدیم الخدمت موقوف نہیں ہونا۔ اس صورت میں یقین ہے کہ جانی صاحب کا علاقہ بہ دستور قائم رہے، مگر یہ وکیل ہیں، معلوم نہیں مختار کون ہے اور ہمارے بابو صاحب میں اور اُس مختار میں صحبت کیسی ہے؟ رانی سے ان کی کیا صورت ہے؟ تم اگرچہ بابو صاحب کی محبت کا علاقہ رکھتے ہو لیکن انھوں نے ازراہِ دور اندیشی تم کو متوسل اُس سرکار کا کر رکھا ہے اور تم مستغنیانہ اور لاابالیانہ زندگی کرتے تھے، زنہار اب وہ روش نہ رکھنا۔ اب تم کو بھی لازم آپڑا ہے جانی جی کے ساتھ روشناسِ حکام والا مقام ہونا۔ پس، چاہیے کول کی آرامش کا ترک کرنا اور خواہی نخواہی بابو صاحب کے ہمراہ رہنا۔ میری رائے میں یوں آیا ہے اور میں نہیں لکھ سکتا کہ موقع کیا ہے اور مصلحت کیا ہے؟

جانی جی بھرت پور آئے ہیں یا اجمیر میں ہیں، کس فکر میں ہیں اور کیا کر رہے ہیں؟ واسطے خدا کے، نہ مختصر، نہ سرسری، بلکہ مفصل اور منقح جو کچھ واقع ہوا ہو اور جو صورت ہو، مجھ کو لکھو اور جلد لکھو کہ مجھ پر خواب و خور حرام ہے۔ کل شام کو میں نے سُنا، آج صبح قلعے نہیں گیا اور یہ خط لکھ کر ازراہِ احتیاط بیرنگ روانہ کیا ہے۔ تم بھی اس کا جواب بیرنگ روانہ کرنا۔ آدھ آنہ ایسی بڑی چیز نہیں، ڈاک

کے لوگ بیرنگ خط کو ضروری سمجھ کر جلد پہنچاتے ہیں اور پوسٹ پیڈ پڑا رہتا ہے؛ جب اُس محلے میں جانا ہوتا ہے تو اُس کو بھی لے جاتے ہیں۔ زیادہ کیا لکھوں کہ پریشان ہوں۔

نوشتۂ چاشتگاہِ دوشنبہ ۲۸ مارچ ۱۸۵۳ء

ضروری، جواب طلب۔

(۱۳)

پرسوں تمھارا خط آیا۔ حال جو معلوم تھا، وہ پھر معلوم ہوا۔ غزلیں دیکھ رہا تھا، آج شام کو دیکھنا تمام ہوا تھا۔ غزلوں کو رکھ دیا تھا؛ چاہتا تھا کہ ان کو بند کر کے رہنے دوں، کل نو بجے دس بجے ڈاک میں بھیج دوں، خط کچھ ضرور نہیں؛ میں اسی خیال میں تھا کہ ڈاک کا ہرکارہ آیا، جانی جی کا خط لایا۔ اُس کو پڑھا۔ اب مجھ کو ضرور ہوا کہ خلاصہ اُس کا تم کو لکھوں؛ یہ رقعہ لکھا۔ خلاصہ بہ طریقِ ایجاز یہ ہے کہ عرضی گزری، دیوان گزرا، راول جی کے نام کا خط گزرا۔ راجا صاحب دیوان کے دیکھنے سے خوش ہوئے۔ جانی جی نے جو ایک معتمد اپنا سعد اللہ خاں وکیل کے ساتھ کر دیا ہے، وہ منتظر جواب کا ہے۔ راول جی نئے اجنٹ کے استقبال کو گئے ہیں اور اب اجنٹ، علاقۂ جے پور کی راہ سے نہیں آتا؛ آگرے اور گوالیار، کرولی ہوتا ہوا اجمیر آئے گا اور اس راہ میں جے پور کا عمل نہیں۔ پس، چاہیے کہ راول جی اُلٹے پھر آویں۔ اُن کے آئے پر عرضی کا جواب ملے گا اور اُس میں دیوان کی رسید بھی ہوگی۔ بھائی، جانی جی تم کو بہت ڈھونڈھتے ہیں اور تمھارے بغیر بہت بے چین ہیں۔ میں نہ تم کو کچھ کہہ سکتا ہوں، نہ اُن کو کچھ سمجھا سکتا ہوں۔ تم وہ کرو کہ جس میں سانپ مرے اور لاٹھی نہ ٹوٹے۔

ہاں، یہ بھی جانی جی نے لکھا تھا کہ کل بہت دن کے بعد منشی جی کا خط آیا ہے۔

مارچ ۱۸۵۳ء

اسد

(۱۴)

آج منگل کے دن پانچویں اپریل کو تین گھڑی دن رہے ڈاک کا ہرکارہ آیا۔ ایک خط منشی صاحب کا اور ایک خط تمھارا اور ایک خط بابو صاحب کا لایا۔ بابو صاحب کے خط سے اور مطالب تو معلوم ہو گئے، مگر ایک امر میں حیران ہوں کہ کیا کروں؛ یعنی انھوں نے ایک خط کسی شخص کا آیا ہوا، میرے پاس بھیجا ہے اور مجھ کو یہ لکھا ہے کہ اُس کو اُلٹا میرے پاس بھیج دینا۔ حال آں کہ خود لکھتے ہیں کہ میں اپریل کی چوتھی کو سیاٹو یا آبو جاؤں گا اور آج پانچویں ہے۔ بس، تو وہ کل روانہ ہو گئے، اب میں وہ خط کس کے پاس بھیجوں؟ ناچار تم کو لکھتا ہوں کہ میں خط کو اپنے پاس رہنے دوں گا، جب وہ آ کر مجھ کو اپنے آنے کی اطلاع دیں گے، تب وہ خط ان کو بھیجوں گا۔ تم کو تردد نہ ہو کہ کیا خط ہے؛ خط نہیں، مینڈھولال کایستھ غمّاز کی عرضی تھی بہ نام مہاراجا بیکنٹھ باشی، سعایتِ بابو صاحب پر مشتمل کہ اُس نے لکھا تھا کہ ہردیو سنگھ، جانی جی کا دیوان اور ایک شاعرِ دہلی کا دیوان مہاراجا جے پور کے پاس لایا ہے اور جانی جی کی درستیِ روزگار جے پور کی سرکار میں کر رہا ہے، اور اس کے بھیجنے کی یہ وجہ کہ پہلے اُن کے لکھنے سے مجھ کو معلوم ہوا تھا کہ کسی نے ایسا کہا ہے، میں نے اُن کو لکھا تھا کہ تم کو میرے سر کی قسم، اب ہردیو سنگھ کو بلوا لو۔ میں امرِ جزوی کے واسطے امرِ کلی کا بگاڑ نہیں چاہتا۔ اُس کے جواب میں انھوں نے وہ عرضی بھیجی اور لکھ بھیجا کہ راجا مرنے والا ایسا نہ تھا کہ اِن باتوں پر نگاہ کرتا، اُس نے یہ عرضی گزرتے ہی میرے پاس بھیج دی تھی۔

بارے، اس خط کے آنے سے جانی جی کی طرف سے میری خاطر جمع ہو گئی مگر اپنی فکر پڑی یعنی بابو صاحب آبو ہوں گے، اگر ہردیو سنگھ پھر کر آئے گا تو وہ بغیر اُن کے ملے اور اُن کے کہے، مجھ تک کاہے کو آئے گا۔ خیر، وہ بھی لکھتا ہے

کہ راول کہیں گیا ہوا ہے، اُس کے آئے پر رخصت ہو گی۔ دیکھیے، وہ کب آوے اور کیا فرض ہے کہ اُس کے آتے ہی رخصت ہو بھی جائے۔

تمھاری غزل پہنچی، یہ البتہ کچھ دیر سے پہنچے گی تمھارے پاس، گھبرانا نہیں۔

والدعا۔

نگاشتۂ سہ شنبہ روزِ ورودِ نامہ
و مرسلۂ چارشنبہ ششم اپریل ۱۸۵۳ء
جواب طلب۔ از اسد اللہ

(۱۵)

بھائی!

ہاں، میں نے "زبدۃ الاخبار" میں دیکھا کہ رانی صاحب مر گئیں۔ کل ایک دوست کا خط اکبرآباد سے آیا۔ وہ لکھتا ہے کہ راجا مرا، رانی نہیں مری۔ ابھی ریاست کا کوئی رنگ قرار نہیں پایا۔ صورتِ انتظام جانی بیج ناتھ کے آنے پر موقوف ہے۔ یہاں تک اُس دوست کی تحریر ہے۔ ظاہرا اُس کو بابو صاحب کا نام نہیں معلوم، اُن کے بھائی کا نام یاد رہ گیا۔ صرف اُس دوست نے بہ طریقِ اخبار لکھا ہے۔ اُس کو میری اور جانی کی دوستی کا بھی حال معلوم نہیں۔ حاصل اس تحریر سے یہ ہے کہ اگر یہ خبر سچ ہے تو ہمارے تمھارے دوست کا کام بنا رہے گا۔ آمین یا رب العالمین۔

صاحب، جے پور کا مقدمہ اب لائق اس کے نہیں ہے کہ ہم اُس کا خیال کریں۔ ایک بنا ڈالی تھی، وہ نہ اُٹھی۔ راجا لڑکا ہے اور چھچھورا ہے۔ راول جی اور سعد اللہ خاں بنے رہتے تو کوئی صورت نکل آتی، اور یہ جو آپ لکھتے ہیں کہ راجا تیرے دیوان کو پڑھا کرتا ہے اور پیشِ نظر رکھتا ہے، یہ بھی تو آپ از روے تحریرِ منشی ہردیو سنگھ کہتے ہیں۔ اُن کا بیان کیوں کر دل نشیں ہو؟ وہ بھی جو

بابو صاحب لکھ چکے ہیں، کہ پانسو روپیے نقد اور خلعت مرزا صاحب کے واسطے تجویز ہو چکا ہے؛ ہولی ہو چکی اور میں لے کر چلا۔ پھاگن، چیت، بیساکھ؛ نہیں معلوم ہولی کس مہینے میں ہوتی ہے؟ آگے تو پھاگن میں ہوتی تھی۔

بندہ پرور! بابو صاحب نے پہلی بار تو مجھ کو دو ہنڈویاں بھیجی ہیں سو سو روپیے کی۔ ایک تو میر احمد حسین میکش کے واسطے، راجا صاحب کی طرف سے، تاریخِ تولد کنور صاحب کے انعام میں اور ایک اپنی طرف سے مجھ کو، بہ طریقِ نذرِ شاگردی۔ بعد اُس کے دو ہنڈویاں سو سو روپیے کی، بعد چار چار پانچ پانچ مہینے کے آئیں بمع میر احمد حسین کے صلے کے روپیوں کے چار سو اور اُس سے علاوہ تین سو؛ اور یہ کہ چار سو یا تین سو کتنے دن میں آئے؛ اس کا حساب کنور صاحب کی عمر پر حوالے ہے، اگر وہ دو برس کے ہیں، تو دو برس میں اور اگر وہ تین برس کے ہیں تو تین برس میں۔

ہاں صاحب! یہ وہی میر قاسم علی صاحب ہیں جو میرے پُرانے دوست ہیں۔ پرسوں یا اترسوں جو ڈاک کا ہرکارہ تمھارا خط لایا تھا، وہ ایک خط میر صاحب کے نام کا، کوئی میاں حکمت اللہ ہیں اُن کا، میرے مکان کے پتّے سے لایا تھا، وہ میں نے لے کر رکھ لیا ہے۔ جب میرِ صاحب آجاویں تو تم ان کو میرا سلام کہنا اور کہنا کہ حضرت اگر میرے واسطے نہیں تو اس خط کے واسطے آپ دلی آیئے۔

مئی ۱۸۵۳ء

(۱۶)

بھائی!

تم نے مجھے کون سا دو چار سو روپیے کا نوکر یا پنشن دار قرار دیا ہے جو دس بیس روپیہ مہینا قسط آرزو رکھتے ہو؟ تمھاری باتوں پر کبھی کبھی ہنسی آتی ہے۔

اگر احیاناً تم دہلی کے ڈپٹی کلکٹر یا وکیل کمپنی ہوتے تو مجھ کو بڑی مشکل پڑتی۔ بہرحال خوش رہو اور متفکر نہ ہو۔ پانچ روپیہ مہینا پنسن انگریزی میں سے قسط مقرر ہو گیا، تا ادائے زر۔ ابتدائے جون ۱۸۵۳ء یعنی ماہِ آیندہ سے یہ قسط جاری ہو گی۔

بابو صاحب کا خط تمھارے نام کا پہنچا۔ عجب تماشا ہے، وہ درنگ کے ہونے سے خجل ہوتے ہیں اور میں اُن کے عذر چاہنے سے مرا جاتا ہوں۔ ہائے اتفاق! آج میں نے اُن کو لکھا اور کل راجا کے مرنے کی خبر سُنی۔ واللہ باللہ! اگر دو دن پہلے خبر سُن لیتا تو اگر میری جان پر آ بنتی، تو بھی اُن کو نہ لکھتا۔

جے پور کے آئے ہوئے روپیے کی ہنڈوی اس وقت تک نہیں آئی، شاید آج شام تک یا کل تک آجاوے۔ خدا کرے، وہ آبو پہاڑ پر سے ہنڈوی روانہ کر دیں، ورنہ پھر خدا جانے کہاں کہاں جائیں گے اور روپیہ بھیجنے میں کتنی دیر ہو جائے گی۔ خدا کرے زرِ مصارف ہردیو سنگھ اسی میں سے مجرا لیں، میری کمال خوشی ہے؛ اور یہ نہ ہو تو پچیس ہردیو سنگھ کو میری طرف سے ضرور دیں۔

منشی صاحب کا ایک خط ہاترس سے آیا تھا؛ کل اُس کا جواب ہاترس کو روانہ کر چکا ہوں۔ والدّعا۔

محررۂ دو شنبہ ۳۰ مئی ۱۸۵۳ء[2]   از   اسداللہ

(۱۷)

عجب تماشا ہے! بابو صاحب لکھ چکے ہیں کہ ہردیو سنگھ آگیا اور پانسو روپیے کی ہنڈوی لایا، مگر اُس کے مصارف کی بابت اُنتیس[3] روپیے کئی آنے اُس ہنڈوی میں محسوب ہو گئے ہیں، سو میں اپنے پاس سے ملا کر پورے پانسو کی ہنڈوی تجھ کو بھیجتا ہوں۔ میں نے اُن کو لکھا کہ مصارف ہردیو سنگھ کے میں مجرا دوں گا، تکلیف نہ کرو۔ پچیس یہ میری طرف سے ہردیو سنگھ کو اور

دے دو۔ اور باقی کچھ کم ساڑھے چار سو کی ہنڈوی جلد روانہ کرو۔ سو بھائی! آج تک ہنڈوی نہیں آئی۔ میں حیران ہوں۔ وجہ حیرانی کی یہ کہ اِس ہنڈوی کے بھروسے پر قرض داروں سے وعدہ جون کے اوائل کا کیا تھا۔ آج جون کی پانچویں ہے؛ وہ تقاضا کرتے ہیں اور میں آج کل کر رہا ہوں۔ شرم کے مارے بابو صاحب کو کچھ نہیں لکھ سکتا۔ جانتا ہوں کہ وہ سیکڑا پورا کرنے کی فکر میں ہوں گے۔ پھر وہ کیوں اتنا تکلف کریں۔ تیس روپیے کی کون سی ایسی بات ہے۔ اگر مصارف ہردیو سنگھ میرے ہاں سے مجرا ہوئے تو کیا غضب ہوا؟ اُنتیس اور پچیس، چوّن روپیے نکال ڈالیں اور باقی ارسال کریں۔

لفافے خطوط کے جو میں نے بھیجے تھے، وہ بھی ابھی نہیں آئے۔ با ایں ہمہ یہ کیسی بات ہے کہ میں یہ بھی نہیں جانتا کہ بابو صاحب کہاں ہیں؟ پہاڑ پر ہیں یا بھرت پور آئے ہیں؟ اجمیر آنے کی تو ظاہرا کوئی وجہ نہیں ہے ناچار کثرتِ انتظار سے عاجز آکر آج تم کو لکھا ہے۔ تم اِس کا جواب مجھ کو لکھو اور اپنی رائے لکھو کہ وجہ درنگ کی کیا ہے؟ زیادہ، زیادہ۔

مرقومہ پنجم جون سنہ ۱۸۵۳ء روز یک شنبہ

جواب طلب۔ اسداللہ

(۱۸)

تمھاری خیر و عافیت معلوم ہوئی۔ غزل نے محنت کم لی۔ بھائی کا ہاترس سے آنا معلوم ہوا۔ آویں تو میرا سلام کہہ دینا۔

یہ تمھارا دعا گو اگرچہ اور امور میں پایۂ عالی نہیں رکھتا مگر احتیاج میں اس کا پایہ بہت عالی ہے، یعنی بہت محتاج ہوں۔ سو دو سو میں میری پیاس نہیں بجھتی، تمھاری ہمت پر سو ہزار آفریں۔ جے پور سے مجھ کو اگر دو ہزار ہاتھ آجاتے تو میرا

قرض رفع ہو جاتا اور پھر اگر دو چار برس کی زندگی ہوتی تو اتنا ہی قرض اور مل جاتا۔ یہ پانسو تو بھائی، تمھاری جان کی قسم، متفرقات میں جا کر سو ڈیڑھ سو بچ رہیں گے، سو وہ میرے صرف میں آویں گے۔ مہاجنوں کا سودی جو قرض ہے، وہ بہ قدر پندرہ سے سولہ سے کے باقی رہے گا اور وہ جو سو بابو صاحب سے منگوائے گئے تھے، وہ صرف انگریز سوداگر کے دینے تھے، قیمت اُس چیز کی جو ہمارے مذہب میں حرام اور تمھارے مشرب میں حلال ہے، سو وہ دے دیے گئے۔ یقین ہے کہ آج کل میں بابو صاحب کا خط مع ہنڈوی آجاوے۔

بابو صاحب کے جو خطوط ضروری اور کواغذ ضروری میرے پاس آئے ہوئے تھے، وہ میں نے پنجشنبہ چھبیس مئی کو پارسل میں اُن کے پاس روانہ کر دیے اور اُس میں لکھ بھیجا کہ ہنڈوی اور میرے بھیجے ہوئے لفافے جلد بھیج دو۔

پنجشنبہ پنجشنبہ پندرہ دن آج پورے ہوئے۔

نگاشتہ پنجشنبہ نہم جون ۱۸۵۳ء از اسداللہ

(۱۹)

بھائی!

جس دن تم کو خط بھیجا، تیسرے دن ہردیو سنگھ کی عرضی اور پچیس کی رسید اور پانسو کی ہنڈوی پہنچی۔ تم سمجھے؟ بابو صاحب نے پچیس ہردیو سنگھ کو دیے اور مجھ سے مجرا نہ لیے۔ بہ ہر حال، ہنڈوی بارہ دن کی معیادی تھی؛ چھے دن گزر گئے تھے، چھے دن باقی تھے؛ مجھ کو صبر کہاں؛ منی کاٹ کر روپیے لے لیے۔ قرض متفرق سب ادا ہوا، بہت سبکدوش ہو گیا۔ آج میرے پاس سینتالیس نقد بکس میں ہیں اور چار بوتل شراب کی اور تین شیشے گلاب کے توشہ خانے میں موجود ہیں۔ اَلحمدُ لِلّٰہِ عَلٰی اِحسانِہٖ۔

بھائی صاحب آ گئے ہوں تو میر قاسم علی خاں کا خط اُن کو دے دو اور میرا سلام کہو اور پھر مجھ کو لکھو تا کہ میں اُن کو خط لکھوں۔ بابو صاحب بھرت پور آ جائیں تو آپ کاہلی نہ کیجیے گا اور اُن کے پاس جائیے گا کہ وہ تمھارے جویائے دیدار ہیں۔

سہ شنبہ ۱۴ جون ۱۸۵۳ء اسد اللہ

(۲۰)

بھائی!

میں نے مانا تمھاری شاعری کو۔ میں جانتا ہوں کہ کوئی دم تم کو فکرِ سخن سے فرصت نہ ہوگی۔ یہ جو تم نے التزام کیا ہے ترصیع کی صنعت کا اور دو لخت شعر لکھنے کا، اس میں ضرور نشستِ معنی بھی ملحوظ رکھا کرو اور جو کچھ لکھو اُس کو دوبارہ سہ بارہ دیکھا کرو۔

کیوں صاحب، یہ ڈبل خط پوسٹ پیڈ بھیجنا اور وہ بھی دلّی سے سکندر آباد کو، آیا حاتم کے سوا اور میرے سوا کسی نے کیا ہوگا؟ کیا ہنسی آتی ہے تمھاری باتوں پر، خدا تم کو جیتا رکھے اور جو کچھ تم چاہو تم کو دے۔

جانی جی کی بڑی فکر ہے۔ میں تم کو لکھا چاہتا تھا کہ اُن کا حال لکھو۔ تمھارے خط سے معلوم ہوا کہ تم کو بھی نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہیں۔ یقین ہے کہ اجمیر میں ہوں گے؛ مگر خط نہیں بھیجا جاتا کہ وہ وہاں مقیم نہیں ہیں۔ خدا جانے کب چل نکلیں۔ بہ ہر حال، تم بھرت پور سے قریب ہو اور اُن کے متوسلوں کو جانتے ہو؛ اگر ہو سکے تو کسی کو لکھ کر خبر منگواؤ اور جو کچھ تم کو معلوم ہو، وہ مجھ کو بھی لکھو۔ منشی صاحب مع منشی عبد اللطیف کول میں آ گئے۔ کل اُن کا خط مجھ کو آیا تھا، آج اُس کا جواب بھی روانہ کر دیا۔

یکشنبہ ۲۱ ماہ اگست ۱۸۵۳ء اسد اللہ

(٢١)

میں تم کو خط بھیج چکا ہوں، پہنچا ہوگا۔ کل ایک رقعہ میرے پاس آیا۔ کوئی صاحب ہیں عطاء اللہ خاں اور ناقیؔ تخلص کرتے ہیں۔ خدا جانے کہاں ہیں اور کون ہیں۔ ایک دوست نے وہ رقعہ میرے پاس بھیجا۔ میں نے اُس کا جواب لکھ کر اسی دوست کے پاس بھیج دیا۔ رقعہ تم کو بھیجتا ہوں، پڑھ کر حال معلوم کروگے۔

تمھارے شعر میں جو تردّد تھا، اُس کا جواب میں نے یہ لکھا ہے، تم کو بھی معلوم رہے:

رفت آنچہ بہ منصور، شنیدی تو و من ہم
اے دل، سخنے ہست، نگہدار زباں را

تردّد یہ کہ "آنچہ بہ منصور رفت" نہیں دیکھا۔ "آنچہ بر منصور رفت" درست ہے۔
جواب: باے موحدہ "علیٰ" کے معنی بھی دیتی ہے۔ پس، جو کچھ "بر" سے مراد تھی، وہ باے موحدہ سے حاصل ہوگئی اور اگر باے موحدہ کے معنی معیت کے لیں تو بھی درست ہے۔ نظیریؔ کہتا ہے:

شادی کہ غبن میکشی و دم نمی زنی
در شہر ایں معاملہ با ہر گدا رود

اگر کوئی یہ کہے کہ یہاں "معاملہ" ہے اور اُس شعر میں "معاملہ" کا لفظ نہیں۔ جواب اس کا یہ ہے کہ سراسر دونوں شعروں کی صورت ایک ہے۔ نظیریؔ کے ہاں "معاملہ" مذکور ہے اور تفتہؔ کے ہاں مقدر ہے۔ "رفت" کا صلہ اور تعدیہ باے موحدہ کے ساتھ دونوں جگہ ہے۔ والسلام۔

اکتوبر ۱۸۵۲ء
اسد اللہ

(۲۲)

"دیدمست" یہ لفظ نیا بنایا ہے۔ مقصود تمھارا میں نے تو سمجھ لیا، مگر زنہار اور کوئی نہ سمجھے گا۔ "المعنی فی بطن القائل" کے یہی معنی ہیں۔

"چشمانِ پُرخُمار" و "چشمانِ بے حیا" ان دونوں ترکیبوں میں سے ایک لکھ لو۔ اِن سب اشعار میں نہ عیب نہ لُطف۔

دیکھو صاحب، خط میں تم پھر وہی "بیش و بیشتر" کا قصہ لائے ہو — "چہ جُرم" و "چہ سبب" و "چہ گناہ" پر جو سند لاتے ہو:

عشق است و صد ہزار تمنا، مرا چہ جُرم

اِس کی حاجت کیا ہے؟ "جاناں مددے" "یاراں مددے" یہ تمام غزل اِسی طرح کی ہے۔ اگر یہ ترکیب درست نہ ہوتی، تو میں ساری غزل کیوں نہ کاٹ ڈالتا۔ دیکھو رفیع السودا کہتا ہے:

نہ ضرر کفر کو، نہ دین کو نقصاں مجھ سے
باعثِ دُشمنی اے گبر و مسلماں مجھ سے؟

غالب کہتا ہے:

مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

یعنی "اب جو دور مجھ تک آیا ہے تو میں ڈرتا ہوں" یہ جملہ سارا مقدر ہے۔ میرا فارسی کا دیوان جو دیکھے گا، وہ جانے گا کہ جملے کے جملے مقدر چھوڑ جاتا ہوں، مگر:

ہر سخن وقتے و ہر نکتہ مکانے دارد

یہ فرق البتہ وجدانی ہے، بیانی نہیں:

اگر دریافتی بردانشت بوس
دگر غافل شدی، افسوس، افسوس!

روز جمعہ ۱۳ جنوری ۱۸۵۴ء   از   اسد اللہ

(۲۳)

بندہ پرور!

ایک مہربانی نامہ سکندر آباد سے اور ایک علی گڑھ سے پہنچا۔ یقین ہے کہ بابو صاحب تمھارے خط کے جواب میں کچھ حال لکھیں گے اور تم موافق اپنے وعدے کے مجھ کو لکھو گے۔ اب جب اِس خط کا جواب تمھارے پاس سے آئے گا، تب تمھارے اشعار تم کو پہنچیں گے۔ ہائے ہائے میر تفضل حسین خاں! ہائے ہائے:

رفتی و مرا خبر نہ کردی
بر بے کسی ام نظر نہ کردی

یہاں یہ سُنا گیا ہے کہ میر احمد حسین، بڑا بیٹا اُن کا، اُن کے کام پر مقرر ہوا اور میر ارشاد حسین بہ دستور نائب رہے۔

۲۳ فروری ۱۸۵۴ء   اسد اللہ

(۲۴)

منشی صاحب!

تمھارا خط اُس دن یعنی کل بُدھ کے دن پہنچا کہ میں چار دن سے لرزے میں مبتلا ہوں اور مزہ یہ ہے کہ جس دن سے لرزہ چڑھا ہے، کھانا مطلق میں نے نہیں کھایا۔ آج پنجشنبہ پانچواں دن ہے کہ نہ کھانا دن کو میسر ہے اور نہ رات کو شراب۔ حرارت مزاج میں بہت ہے، ناچار احتراز کرتا ہوں۔ بھائی! اس لطف کو دیکھو کہ پانچواں دن ہے کھانا کھائے، ہرگز بھوک نہیں لگی اور طبیعت غذا کی طرف متوجہ نہیں ہوئی۔

بابو صاحبِ والا مناقب کا خط تمھارے نام کا دیکھا۔ اب اُس ارسال میں وہ آسانی نہ رہی اور بندہ دشواری سے بھاگتا ہے، کیوں تکلیف کریں، اور اگر بہ ہر حال اُن کی مرضی ہے تو خیر، میں فرماں پذیر ہوں۔ اشعارِ سابق و حال میرے پاس امانت ہیں۔ بعد اچھے ہونے کے، اُن کو دیکھوں گا اور تم کو بھیج دوں گا۔ اتنی سطریں مجھ سے بہ ہزار جرِّ ثقیل لکھی گئی ہیں۔

روز پنجشنبہ ۲ مارچ ۱۸۵۴ء اسد اللہ

(۲۵)

شفیق میرے لالہ ہرگوپال تفتہ میرا قصور معاف کریں اور مجھ کو اپنا نیاز مند تصور فرماویں۔ آپ کا پارسل اور آپ کا خطِ سابق و عنایت نامۂ حال پہنچا۔ جواب نہ لکھنے کی دو وجہ: ایک تو یہ کہ میں بیمار، چار مہینے سے تپِ لرزہ میں گرفتار۔ دم لینے کی طاقت نہیں، خط لکھنا کیسا۔ بارے، اب فرصت ہے۔

دوسری وجہ یہ کہ کول تو معلوم، مگر مکان آپ کا نہیں معلوم، خط لکھوں تو کس پتے سے لکھوں؟ ہاں، آپ نے سرنامے پر "چاہِ گرمابہ" لکھا، میں یہ نہیں لکھ سکتا، کس واسطے کہ یہ "حمام کے کنویں" کی مٹی خراب کر کر، اُس کو "چاہِ گرمابہ" لکھا ہے۔ اسماو اعلام کا ترجمہ فارسی میں کرنا، یہ خلافِ دستورِ تحریر ہے۔ بھلا اس شہر میں ایک محلہ بلّی ماروں کا ہے؛ اب ہم اُس کو "گربہ کُشاں" کیوں کر لکھیں؟ یا املی کے محلے کو "محلہ تمرہندی" کس طرح لکھیں؟ بہ ہر حال، ناچار تمھاری خاطر سے احمق بننا قبول کیا اور وہی لفظ مہمل لکھ کر خط بھیج دیا ہے۔

جواب یہ ہے کہ بھائی! میرا دل اب شعر و سخن و امارت و ریاست و دین و دنیا و مرگ و زیست و کفر و اسلام سے سرد ہو گیا ہے، مگر تمھاری خاطر۔ سو یہ خوب یاد رہے کہ جتنی دیر میں تم ایک نئی غزل لکھ سکتے ہو، مجھ سے اُتنے عرصے میں آپ کی ایک غزل کو اصلاح نہیں دی جاتی۔ جلدی نہ کرو اور میرے طور پر رہنے دو۔ اِنشاء اللہ تعالیٰ اس قدر تمھاری جو کہ از قسم

غزلیات ہیں، وہ سب دیکھ کر بھیج دوں گا۔ نصف دیوانِ سابق دیکھ چکا ہوں، نصف باقی ہے؛ مگر اب خدا کے واسطے، جب تک یہ آپ کا کلام نہ پہنچے اور کلام نہ بھیجیے، کہ میں گھبرایا جاتا ہوں۔

جون ۱۸۵۴ء اسد اللہ خاں

(۲۶)

میرا سلام پہنچے۔ خط اور کاغذِ اشعار پہنچا۔ سابق و حال ابھی سب یوں ہی دھرے رہیں گے۔ اگرچہ گرمی رفع ہو گئی ، مینھ برسنے لگے، ہوائے سرد چلنے لگی؛ مگر دل مکدر ہے اور حواس ٹھکانے نہیں۔

بادشاہ کا قصیدہ سارا اور ولی عہد کا قصیدہ بے خاتمہ آگے سے کہہ رکھا تھا؛ اُس کا خاتمہ بہ ہزار مشقت رمضان میں کہہ لیا اور عید کو دونوں پڑھ دیے۔

بھائی منشی نبی بخش صاحب کو پرسوں یا اترسوں بھیجوں گا، اُن سے لے کر تم بھی دیکھنا۔ میں نے اُن کو لکھ بھیجا ہے کہ منشی ہرگوپال صاحب کو بھی دینا کہ وہ پڑھ لیں اور چاہیں تو نقل لے لیں۔ اِس کے سوا اور جو کچھ تمھارے خط میں لکھا تھا وہ جواب طلب نہیں، اور یوں ہی ہے جو تم سمجھے ہو۔

جولائی ۱۸۵۴ء اسد اللہ

(۲۷)

صاحب!

دیباچہ و تقریظ کا لکھنا ایسا آسان نہیں ہے کہ جیسا تم کو دیوان کا لکھ لینا۔ کیوں روپیہ خراب کرتے ہو اور کیوں چھپواتے ہو؟ اور اگر یوں ہی جی چاہتا ہے تو ابھی کیے جاؤ، آگے چل کر دیکھ لینا۔ اب یہ دیوان چھپوا کر، اور تیسرے دیوان کی فکر میں پڑو گے۔ تم تو دو چار برس میں ایک دیوان کہہ لو گے، میں کہاں تک

دیباچہ لکھا کروں گا؟ مدعا یہ ہے کہ اس دیوان کو اُس دیوان کے برابر ہو لینے دو۔ اب کچھ قصیدہ و رباعی کی فکر کیا کرو۔ دو چار برس میں اس قسم سے جو کچھ فراہم ہو جاوے دوسرے دیوان میں اُس کو بھی درج کرو۔

صاحب! جہاں تقطیع میں "الف" نہ سمائے وہاں کیوں لکھو؟

اپریل، مئی ۱۸۵۵ء[۲] اسد

(۲۸)

تمھارا خط پہنچا۔ مجھ کو بہت رنج ہوا، واقعی اُن چھوٹے لڑکوں کا پالنا بہت دُشوار ہوگا۔ دیکھو، میں بھی تو اسی آفت میں گرفتار ہوں، صبر کرو، اور صبر نہ کرو گے تو کیا کرو گے۔ کچھ بن نہیں آتی۔ میں مسہل میں ہوں، یہ نہ سمجھنا کہ بیمار ہوں۔ حفظِ صحت کے واسطے مسہل لیا ہے۔ تمھارے اشعار غور سے دیکھ کر بھائی منشی نبی بخش صاحب کے پاس لفافہ تمھارے نام کا بھیج دیا ہے؛ جب تم آؤ گے، تب وہ تم کو دیں گے۔ جہاں جہاں تردّد و تامل کی جگہ تھی، وہ ظاہر کر دی ہے اور باقی سب اشعار بہ دستور رہنے دیے ہیں۔ اب تم کو یہ چاہیے کہ کول پہنچ کر مجھ کو خط لکھو۔ اِس لفافے کی رسید اور اپنا سارا حال مفصل لکھو۔ اس میں تساہل نہ کرو۔ بابو صاحب کے خط کا جواب اجمیر کو روانہ کر دیا جائے گا، آپ کی خاطر جمع رہے۔ زیادہ اس سے کیا لکھوں۔

قبل ۱۸۵۵ء[۳] اسد اللہ

(۲۹)

صاحب!

تم جانتے ہو کہ یہ معاملہ کیا ہے اور کیا واقع ہوا؟ وہ ایک جنم تھا کہ جس میں ہم تم باہم دوست تھے اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملاتِ مہر و محبت در پیش آئے۔ شعر کہے، دیوان جمع کیے۔ اُسی زمانے میں ایک اور بزرگ تھے کہ وہ ہمارے

تمھارے دوستِ دلی تھے اور منشی نبی بخش اُن کا نام اور حقیر تخلص تھا۔ ناگاہ نہ وہ زمانہ رہا، نہ وہ اشخاص، نہ وہ معاملات، نہ وہ اختلاط، نہ وہ انبساط۔ بعد چند مدت کے پھر دوسرا جنم ہم کو ملا۔ اگرچہ صورت اس جنم کی بعینہٖ مثل پہلے جنم کے ہے، یعنی ایک خط میں نے منشی نبی بخش صاحب کو بھیجا، اُس کا جواب مجھ کو آیا۔ اور ایک خط تمھارا کہ تم بھی موسوم بہ منشی ہرگوپال و متخلص بہ تفتہؔ ہو، آج آیا اور میں جس شہر میں ہوں، اُس کا نام بھی دلّی اور اُس محلے کا نام بلّی ماروں کا محلہ ہے؛ لیکن ایک دوست اُس جنم کے دوستوں میں سے نہیں پایا جاتا۔ واللہ ڈھونڈھنے کو مسلمان، اس شہر میں نہیں ملتا؛ کیا امیر، کیا غریب، کیا اہلِ حرفہ۔ اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں۔ ہنود البتہ کچھ کچھ آباد ہو گئے ہیں۔

اب پوچھو کہ تو کیوں کر مسکنِ قدیم میں بیٹھا رہا۔ صاحب بندہ! میں حکیم محمد حسن خاں مرحوم کے مکان میں نو دس برس سے کرایے کو رہتا ہوں اور یہاں قریب کیا بلکہ دیوار بہ دیوار ہیں گھر حکیموں کے اور وہ نوکر ہیں راجا نرندر سنگھ بہادر والیِ پٹیالہ کے۔ راجا نے صاحبانِ عالی شان سے عہد لے لیا تھا کہ بروقتِ غارتِ دہلی، یہ لوگ بچ رہیں۔ چنانچہ بعد فتح، راجا کے سپاہی یہاں آ بیٹھے اور یہ کوچہ محفوظ رہا ورنہ میں کہاں اور یہ شہر کہاں؟ مبالغہ نہ جاننا، امیر غریب سب نکل گئے۔ جو رہ گئے تھے، وہ نکالے گئے۔ جاگیردار، پنشن دار، دولت مند، اہلِ حرفہ؛ کوئی بھی نہیں ہے۔ مفصل حال لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ ملازمانِ قلعہ پر شدت ہے اور باز پرس اور دار و گیر میں مبتلا ہیں، مگر وہ نوکر جو اس ہنگام میں نوکر ہوئے ہیں اور ہنگامے میں شریک رہے ہیں میں غریب شاعر دس دس برس سے تاریخ لکھنے اور شعر کی اصلاح دینے پر متعلق ہوا ہوں؛ خواہی اُس کو نوکری سمجھو، خواہی مزدوری جانو۔ اس فتنہ و آشوب میں کسی مصلحت میں میں نے دخل نہیں دیا۔ صرف اشعار کی خدمت بجا لاتا رہا اور نظر اپنی بے گناہی

پر، شہر سے نکل نہیں گیا۔ میرا شہر میں ہونا حکام کو معلوم ہے؛ مگر چونکہ میری طرف بادشاہی دفتر میں سے یا مخبروں کے بیان سے کوئی بات پائی نہیں گئی، لہٰذا طلبی نہیں ہوئی۔ ورنہ جہاں بڑے بڑے جاگیردار بُلائے ہوئے یا پکڑے ہوئے آئے ہیں، میری کیا حقیقت تھی۔ غرض کہ اپنے مکان میں بیٹھا ہوں، دروازے سے باہر نکل نہیں سکتا۔ سوار ہونا اور کہیں جانا تو بہت بڑی بات ہے۔ رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے؛ شہر میں ہے کون جو آوے؟ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں۔ مجرم سیاست پاتے جاتے ہیں۔ جرنیلی بندوبست یازدہم مئی سے آج تک، یعنی شنبہ پنجم دسمبر ۱۸۵۷ء تک بہ دستور ہے۔ کچھ نیک و بد کا حال مجھ کو نہیں معلوم بلکہ ہنوز ایسے امور کی طرف حکام کو توجہ بھی نہیں۔ دیکھیے انجامِ کار کیا ہوتا ہے۔ یہاں باہر سے اندر کوئی بغیر ٹکٹ کے آنے جانے نہیں پاتا۔ تم زنہار یہاں کا ارادہ نہ کرنا۔ ابھی دیکھا چاہیے، مسلمانوں کی آبادی کا حکم ہوتا ہے یا نہیں۔ بہ ہر حال، منشی صاحب کو میرا سلام کہنا اور یہ خط دکھا دینا۔ اس وقت تمھارا خط پہنچا اور اسی وقت میں نے یہ خط لکھ کر ڈاک کے ہرکارے کو دیا۔

شنبہ ۵ دسمبر ۱۸۵۷ء

اسد اللہ

غالب کے خطوط = ۱ : ۲۶۸ ـ ۲۶۹

(۲۰)

آج سنیچر بار کو دوپہر کے وقت ڈاک کا ہرکارہ آیا اور تمھارا خط لایا۔ میں نے پڑھا اور جواب لکھا اور کلیان کو دیا، وہ ڈاک کو لے گیا۔ خدا چاہے تو کل پہنچ جائے۔

میں تم کو پہلے ہی لکھ چکا ہوں کہ دلّی کا قصد کیوں کرو اور یہاں آکر کیا کروگے؟ بنک گھر میں سے خدا کرے، تمھارا روپیہ مل جائے۔

بھائی! میرا حال یہ ہے کہ دفترِ شاہی میں میرا نام مندرج نہیں نکلا۔ کسی

مخبر نے بہ نسبت میرے کوئی خبر بدخواہی کی نہیں دی۔ حکامِ وقت میرا ہونا شہر میں جانتے ہیں۔ فراری نہیں ہوں، روپوش نہیں ہوں، بلایا نہیں گیا، داروگیر سے محفوظ ہوں۔ کسی طرح کی بازپرس ہو تو بلایا جاؤں۔ مگر ہاں، جیسا کہ بلایا نہیں گیا، خود بھی بروے کار نہیں آیا۔ کسی حاکم سے نہیں ملا، خط کسی کو نہیں لکھا، کسی سے درخواست ملاقات نہیں کی۔ مئی سے پنسن نہیں پایا۔ کہو، یہ نو دس مہینے کیوں کر گزرے ہوں گے۔ انجام کچھ نظر آتا نہیں کہ کیا ہوگا؟ زندہ ہوں مگر زندگی وبال ہے۔ ہرگوبند سنگھ یہاں آئے ہوئے ہیں۔ ایک بار میرے پاس بھی آئے تھے۔ والدعا۔

روز شنبہ سی ام جنوری ۱۸۵۸ء غالب
وقت نیم روز

(۳۱)

از عمر و دولت برخوردار باشند۔

بدھ کا دن، تیسری تاریخ فروری کی، ڈیڑھ پہر دن باقی رہے، ڈاک کا ہرکارہ آیا اور خط مع رجسٹری لایا۔ خط کھولا۔ سو روپے کی ہنڈوی، بِل؛ جو کچھ کہیے، وہ ملا۔ ایک آدمی رسید مہری لے کر نیل کے کٹرے چلا گیا۔ سو روپیہ چہرہ شاہی لے آیا۔ آنے جانے کی دیر ہوئی اور بس۔ چوبیس روپیے داروغہ کی معرفت اُٹھے تھے، وہ دیے گئے۔ پچاس روپیے محل میں بھیج دیے۔ چھبیس روپے باقی رہے، وہ بکس میں رکھ لیے۔ روپیے کے رکھنے کے واسطے بکس کھولا تھا؛ سو، یہ رقعہ بھی لکھ لیا۔ کلیان سودا لینے بازار گیا ہوا ہے، اگر جلد آگیا تو آج ورنہ کل یہ خط ڈاک میں بھیج دوں گا۔ خدا تم کو جیتا رکھے اور اجر دے۔ بھائی! بُری آبنی ہے انجام اچھا نظر نہیں آتا، قصہ مختصر یہ کہ قصہ تمام ہوا۔

چارشنبہ ۳ فروری ۱۸۵۸ء وقت دوپہر۔ غالب

(۳۲)

صاحب!

تم نے لکھا تھا کہ میں جلد آگرے جاؤں گا، تمھارے اس خط کا جواب نہ لکھ سکا۔ جواب تو لکھ سکتا تھا، مگر کلیان کا پاؤں سوج گیا تھا، وہ چل نہیں سکتا تھا۔ مسلمان آدمی شہر میں سڑک پر بن ٹکٹ پھر نہیں سکتا، ناچار تم کو خط نہ بھیج سکا۔ بعد چند روز کے جو کہار اچھا ہوا تو میں تم کو آگرے میں سمجھ کر سکندر آباد خط نہ بھیج سکا۔ مولوی قمرالدین خاں کے خط میں تم کو سلام لکھا۔ کل اُن کا خط آیا؛ وہ لکھتے ہیں کہ مرزا تفتہ ابھی یہاں نہیں آئے اس واسطے آج یہ رقعہ تم کو بھیجتا ہوں۔

میرا حال بہ دستور ہے۔ دیکھیے، خدا کو کیا منظور ہے، حاکمِ اکبر نے آکر کوئی نیا بندوبست جاری نہیں کیا۔ یہ صاحب میرے آشنائے قدیم ہیں مگر میں مل نہیں سکتا، خط بھیج دیا ہے۔ ہنوز کچھ جواب نہیں آیا۔ تم لکھو کہ اکبر آباد کب جاؤ گے۔ والدعا۔

جمعہ ۵ مارچ ۱۸۵۸ء غالب

(۳۳)

جانِ من و جانانِ من!

کل میں نے تم کو سکندر آباد میں سمجھ کر خط بھیجا؛ شام کو تمھارا خط آیا، معلوم ہوا کہ تم اکبر آباد پہنچے۔ خیر، وہ خط پوسٹ پیڈ گیا ہے۔ شاید الٹا نہ پھرے۔ اگر پھر آئے گا تو خیر۔ آج یہ خط تم کو اکبر آباد بھیجتا ہوں؛ پہنچنے پر جواب لکھنا۔

تقطیع رباعی کی بہت خوب؛ مگر خیر، ہر ایک بات کا ایک[۲] وقت ہے۔ ہم کو ہر طرح لطف صحبت اور لطفِ شعر اٹھا لینا۔

بھائی منشی نبی بخش صاحب کے نام کا خط پڑھ کر اُن کو دے دینا اور اُس کا

مضمون معلوم کر لینا۔ جس حاکم کو میں نے خط اور قطعہ بھیجا ہے، اُس کے سررشتہ دار کوئی صاحب ہیں، من پھول اُن کا نام ہے، مجھ سے ناآشنائے محض ہیں۔ اگر تعارف ہوتا تو استدعا کرتا کہ اس تحریر کو پیش کیجیے۔ کاش تم سے آشنائی ہوتی تو تم ہی اوپر اوپر خط لکھ کر اُن کو بھیج دیتے کہ غالبؔ ایک فقیر گوشہ نشیں اور بے گناہِ محض اور واجب الرحم ہے؛ اُس کے حصولِ مطالب میں سعی سے دریغ نہ کرنا:

می تواں آوردِ استغنا سفارش نامۂ
چرخِ کج رو را اگر دانیم کز یارانِ کیست

باقی جو حال ہے وہ بھائی کے نام کے ورق میں لکھ چکا ہوں۔ تم پڑھ لوگے، دوبارہ لکھنا کیا ضرور۔

شنبہ ۶ مارچ ۱۸۵۸ء

جواب طلب۔

(۳۴)

صاحب!

تمھاری سعادت مندی کو ہزار ہزار آفریں۔ تم کو یوں ہی چاہیے تھا لیکن میں نے تو ایک بات بہ طریقِ تمنا لکھی تھی، جیسا کہ عربی میں "لیت" اور فارسی میں "کاشکے"۔

اب تم روداد سنو: عرضی میری سرجان لارنس، چیف کمشنر بہادر کو گزری، اُس پر دستخط ہوئے کہ یہ عرضی مع کاغذ ضمیمہ سائل کے پاس بھیج دی جائے اور یہ لکھا جائے کہ معرفت صاحب کمشنر دہلی کے پیش کرو۔ اب سررشتہ دار کو لازم تھا کہ میرے نام موافق دستور کے خط لکھتا۔ یہ نہ ہوا، وہ عرضی حکم چڑھی ہوئی میرے پاس آ گئی۔ میں

نے خط صاحب کمشنر دہلی، چارلس سانڈرس کو لکھا اور وہ عرضی حکم چڑھی ہوئی اُس میں ملفوف کر کے بھیج دی۔ صاحب کمشنر نے صاحب کلکٹر کے پاس یہ حکم چڑھا کر بھیجی کہ سائل کے پنسن کی کیفیت لکھو۔ اب وہ مقدمہ صاحب کلکٹر کے ہاں آیا ہے۔ ابھی صاحب کلکٹر نے تعمیل اُس حکم کی نہیں کی۔ پرسوں تو اُن کے ہاں یہ روبکاری آئی ہے۔ دیکھیے، کچھ مجھ سے پوچھتے ہیں یا اپنے دفتر سے لکھ بھیجتے ہیں۔ دفتر کہاں رہا ہے جو اُس کو دیکھیں گے۔

بہ ہر حال، یہ خدا کا شکر ہے کہ بادشاہی دفتر میں سے میرا کچھ شمول فساد میں پایا نہیں گیا اور میں حکام کے نزدیک یہاں تک پاک ہوں کہ پنسن کی کیفیت طلب ہوئی ہے اور میری کیفیت کا ذکر نہیں ہے، یعنی سب جانتے ہیں کہ اس کو لگاؤ نہ تھا۔

مولوی قمرالدین خاں کا کول نہ جانا اور راہ سے پھر آنا، معلوم ہوا۔ حق تعالیٰ اُن کو زندہ اور تندرست رکھے۔ میرا سلام کہنا اور یہ خط پڑھا دینا۔ بھائی منشی نبی بخش صاحب کو سلام اور اُن کے بچوں کو دعا کہنا اور یہ خط ضرور ضرور پڑھا دینا اور کہنا، بھائی، بدایت تو اچھی ہے، نہایت بھی خدا اچھی کرے۔ وہ عزت اور وہ ربط و ضبط جو ہم رئیس زادوں کا تھا، اب کہاں! روٹی کا ٹکڑا ہی مل جائے تو غنیمت ہے۔

گورنری کلکتہ اور گورنری آگرہ اور اجنٹی و کمشنری و دیوانی و فوجداری و کلکٹری دہلی سے جو حکم میرے خط اور عرضی پر ہوا ہے، مشتمل اُس حکم پر خط میرے نام آیا ہے۔ حاکم نے اب بھی یہی حکم دیا تھا کہ لکھا جاوے کہ یوں کرو۔ عملے نے خط نہ لکھا، صرف وہ عرضی حکم چڑھی ہوئی بھیج دی۔ خیر:

ہر چہ از دوست می رسد، نیکوست

سُنو مرزا تفتہ! اب میں جو اپنا حال تم کو لکھا کروں، وہ تم میرے بھائی کو اور مولوی قمرالدین خاں کو دکھا دیا کرو۔ تین تین جگہ ایک بات کو کیوں لکھوں؟

جمعہ ۱۲ مارچ ۱۸۵۸ء

(۳۵)

صاحب!

کیوں مجھے یاد کیا؟ کیوں خط لکھنے کی تکلیف اُٹھائی؟ پھر یہ کہتا ہوں کہ خدا تم کو جیتا رکھے کہ تمھارے خط میں مولوی قمرالدین خاں کا سلام بھی آیا اور بھائی منشی نبی بخش کی خیر و عافیت بھی معلوم ہوئی۔ وہ تو پنشن کے فکر میں تھے، ظاہرا یوں مناسب دیکھا ہوگا کہ نوکری کی خواہش کی۔ حق تعالیٰ اُن کی جو مراد ہو، بر لاوے۔ اُن کو میرا سلام کہہ دینا بلکہ یہ رقعہ پڑھوا دینا مولوی قمرالدین خاں صاحب کو بھی سلام کہنا۔

تم اپنے کلام کے بھیجنے میں مجھ سے پرسش کیوں کرتے ہو؟ چار جزو ہیں تو، بیس جزو ہیں تو، بے تکلف بھیج دو۔ میں شاعرِ سخن سنج اب نہیں رہا، صرف سخن فہم رہ گیا ہوں، بوڑھے پہلوان کی طرح پیچ بتانے کی گوں ہوں۔ بناوٹ نہ سمجھنا، شعر کہنا مجھ سے بالکل چھوٹ گیا۔ اپنا اگلا کلام دیکھ کر حیران رہ جاتا ہوں کہ یہ میں نے کیوں کر کہا تھا۔ قصہ مختصر، وہ اجزا جلد بھیج دو۔

یکشنبہ ۱۲ اپریل ۱۸۵۸ء غالب

(۳۶)

مرزا تفتہ!

عجب اتفاق ہوا، پنجشنبے کے دن بائیس اپریل کو کلیان خط ڈاک میں ڈال کر آیا کہ اُس کے متعاقب پارسل کا ہرکارہ آیا اور تمھارا بھیجا ہوا پاکٹ لایا۔ رسید لکھنی میں نے زائد سمجھی اور اُس کا دیکھنا شروع کیا۔ بے کارِ محض اور تنہا ہوں، پانچ پہر کا وان، میری بڑی دل لگی ہوگئی۔ خوب دیکھا۔ سچ تو یوں ہے کہ ان اشعار میں میں نے بہت حظ اُٹھایا۔ جیتے رہو، تمھارا دم غنیمت ہے۔

بھائی کا حال مفصل لکھو۔ پنسن کے طالب ہیں یا نوکری کے؟ منشی عبداللطیف

کہاں ہے اور کس طرح ہے؟ علاقہ بنا ہوا ہے یا جاتا رہا؟ صاحب لفٹنٹ گورنری کا محکمہ بالکل الہ آباد کو گیا یا ہنوز کچھ یہاں بھی ہے؟ منشی غلام غوث صاحب کہاں ہیں؟ نوکر ہیں یا مستعفی؟ عدالتِ دیوانی کا محکمہ یہیں رہے گا یا الہ آباد جائے گا؟ اس کا اور گورنری کے محکمے کا ساتھ[1] ہے، چاہیے یہ بھی وہیں جاوے۔

آج تمھارے اشعار کا کاغذ پمفلٹ پاکٹ اسی خط کے ساتھ ڈاک میں بھیجا گیا ہے، یقین ہے کہ یہ خط کل پرسوں اور وہ پاکٹ پانچ چار دن میں پہنچ جائے۔

یکشنبہ ۲۵ اپریل ۱۸۵۸ء

(۳۷)

صاحب!

پچیس اپریل کو ایک خط اور ایک پارسل ڈاک میں ارسال کر چکا ہوں، آج تیس ہے، یقین ہے کہ خط اور پارسل دونوں پہنچ گئے ہوں گے۔

ایک امرِ ضروری باعث اس تحریر کا ہے کہ جو میں اس وقت روانہ کرتا ہوں؛ ایک میرا دوست اور تمھارا ہمدرد[2] ہے، اُس نے اپنے حقیقی بھتیجے کو بیٹا کر لیا تھا، اٹھارہ اُنیس برس کی عمر، قوم کا کھتری، خوب صورت، وضع دار، نوجوان، ۱۲۷۳ھ میں بیمار پڑ کر مر گیا۔ اب اُس کا باپ مجھ سے آرزو کرتا ہے کہ میں ایک تاریخ اُس کے مرنے کی لکھوں، ایسی کہ وہ فقط تاریخ نہ ہو بلکہ مرثیہ ہو کہ وہ اُس کو پڑھ پڑھ کر رویا کرے۔ سو بھائی، اُس سائل کی خاطر مجھ کو عزیز اور فکرِ شعر متروک۔ معہذا یہ واقعہ تمھارے حسبِ حال ہے، جو خونچکاں شعر تم نکالو گے وہ مجھ سے کہاں نکلیں گے؟ بہ طریقِ مثنوی بیس تیس شعر لکھ دو۔ مصرعِ آخر میں مادۂ تاریخ ڈال دو۔ نام اُس کا برج موہن تھا اور اُس کو "بابو" کہتے

تھے۔ چنانچہ میں بحرِ ہزج مسدس مخبون میں ایک شعر تم کو لکھتا ہوں؛ چاہو اُس کو آغاز میں رہنے دو اور آیندہ اِسی بحر میں اور اشعار لکھ لو؛ چاہو کوئی اور طرح نکالو، لیکن یہ خیال میں رہے کہ سائل کو متوفیٰ کے نام کا درج ہونا منظور ہے اور "بابو برج موہن" سوائے اس بحر کے یا بحرِ رمل کے اور بحر میں نہیں آسکتا۔ وہ شعر میرا یہ ہے:

برم چوں نامِ بابو برج موہن
چکد خونِ دلِ ریش از لبِ من

نگاشتۂ روز جمعہ سی ام اپریل ۱۸۵۸ء غالب

(۳۸)

بھائی!

وہ خط پہلا تم کو بھیج چکا تھا کہ بیمار ہو گیا۔ بیمار کیا ہوا، توقع زیست کی نہ رہی۔ قولنج اور پھر کیسا شدید کہ پانچ پہر مرغِ نیم بسمل کی طرح تڑپا کیا۔ آخر عصارۂ ریوند اور ارنڈی کا تیل پیا۔ اُس وقت تو بچ گیا مگر قصہ قطع نہ ہوا۔ مختصر کہتا ہوں، میری غذا تم جانتے ہو کہ تندرستی میں کیا ہے۔ دس دن میں دو بار آدھی آدھی غذا کھائی۔ گویا دس دن میں ایک بار غذا تناول فرمائی۔ گلاب اور املی کا پنا اور آلو بخارے کا افشردہ، اِس پر مدار رہا۔ کل سے خوفِ مرگ گیا ہے اور صورت زیست کی نظر آئی ہے۔ آج صبح کو بعد دوا پینے کے تم کو یہ خط لکھا ہے۔ یقین تو ہے کہ آج پیٹ بھر کر روٹی کھا سکوں۔

صاحب! وہ جو میں نے بائیس شعر مرثیے کے لکھ کر تم کو بھیجے، اُس سے مقصود یہ تھا کہ تم اپنے اشعار دوسرے ماتم زدہ کو دے دو۔ کس واسطے کہ

تمھاری تحریر سے معلوم ہوا تھا کہ کوئی اور بھی فلک زدہ ہے اور یہ جو تم لکھتے ہو کہ کچھ اوپر اسّی شعر میں سے ایک شعر بھی تو نے نہ لیا؛ اس کا حال یہ ہے کہ وہ شعر سب دست و گریباں تھے، ایک کو ایک سے ربط، ایک یا دو شعر اُس میں سے کیوں کر لیے جاتے؟ اشعار سب میرے پسند، بے سقم، بے عیب۔ وہ جو تم لکھتے ہو کہ:

حرفِ بابو برج موہن "می زنم" اور اس کا دوسرا مصرع میں بھول گیا ہوں؛ مگر قافیے میں "من" ہے؛ یہ شعر غالب کو بُرا معلوم ہوا ہوگا۔ واللہ باللہ! جب تک کہ تم نے نہیں لکھا، میرے خیال میں بھی یہ بات نہ تھی۔ بہ ہر حال، بات وہی ہے، جو میں اوپر لکھ آیا ہوں۔

بارے، اب کہیے بھائی منشی نبی بخش صاحب اور مولوی قمرالدین خاں صاحب روزوں کے متوالے، ہوش میں آئے یا نہیں آئے؟ آج دس شوال کی ہے، پنشنبہ؛ عید کا بھی زمانہ گزر گیا۔ خدا کے واسطے، اُن کی خیر و عافیت لکھو اور یہ عبارت بھائی صاحب کی نظرِ انور سے گزرانو۔ شاید وہ مجھ کو خط لکھیں۔

محرّرہ و مرسلہ، دوشنبہ ۲۴ مئی ۱۸۵۸ء غالب

(۳۹)

کیوں صاحب!

مجھ سے کیوں خفا ہو؟ آج مہینا بھر ہو گیا ہوگا یا بعد دو چار دن کے ہو جائے گا کہ آپ کا خط نہیں آیا۔ انصاف کرو، کتنا کثیر الاحباب آدمی تھا۔ کوئی وقت ایسا نہ تھا کہ میرے پاس دو چار دوست نہ ہوتے ہوں۔ اب یاروں میں ایک شیو جی رام برہمن اور بال مکند اُس کا بیٹا، یہ دو شخص ہیں کہ گاہ گاہ آتے ہیں۔ اس سے گزر کر، لکھنؤ اور کالپی اور فرخ آباد اور کس کس ضلع سے خطوط آتے

رہتے تھے۔ اُن دوستوں کا حال ہی نہیں معلوم کہ کہاں ہیں اور کس طرح ہیں؟ وہ آمد خطوط کی موقوف۔ صرف تم تین صاحبوں کے خط آنے کی توقع؛ اُس میں وہ دونوں صاحب گاہ گاہ، ہاں ایک تم کہ ہر مہینے میں ایک دو بار مہربانی کرتے ہو۔

سنو صاحب! اپنے پر لازم کر لو ہر مہینے میں ایک خط مجھ کو لکھنا۔ اگر کچھ کام آ پڑا، دو خط، تین خط؛ ورنہ صرف خیر و عافیت لکھی اور ہر مہینے میں ایک بار بھیج دی۔

بھائی صاحب کا بھی خط دس بارہ دن ہوئے کہ آیا تھا، اُس کا جواب بھیج دیا گیا۔ مولوی قمرالدین خاں، یقین ہے کہ الہ آباد گئے ہوں، کس واسطے کہ مجھ کو مئی میں لکھا تھا کہ اوائل جون میں جاؤں گا۔

بہ ہر حال، اگر آپ آزردہ نہیں، تو جس دن میرا خط پہنچے، اُس کے دوسرے دن اِس کا جواب لکھیے، اپنی خیر و عافیت، منشی صاحب کی خیر و عافیت، مولوی صاحب کا احوال۔ اِس سے سوا، گوالیار کے فتنہ و فساد کا ماجرا جو معلوم ہوا ہو وہ الفاظِ مناسبِ وقت میں ضرور لکھنا۔ راجا جو وہاں آیا ہوا ہے، اُس کی حقیقت، دھول پور کا رنگ، صاحبانِ عالی شان کا ارادہ وہاں کے بندوبست کا کس طرح پر ہے؟ آگرے کا حال کیا ہے؟ وہاں کے رہنے والے کچھ خائف ہیں یا نہیں؟

نگاشتہ شنبہ ۱۹ جون ۱۸۵۸ء غالب

(۴۰)

جیتے رہو اور خوش رہو:

اے وقتِ تو خوش کہ وقتِ ما خوش کردی

زیادہ خوشی کا سبب یہ کہ تم نے تحریر کو تقریر کا پرداز دے دیا تھا۔ گرمیِ ہنگامۂ انطباعِ دیوان وغیرہ، میں پہلے سے جانتا ہوں۔ بنک گھر کا روپیہ مصرفِ کاغذ و کاپی ہے۔ خدا تم کو سلامت رکھے، مغتنمات سے ہو۔ رجب علی بیگ سرور نے جو "فسانۂ عجائب"[۱] لکھا ہے، آغازِ داستان کا شعر اب مجھ کو بہت مزہ دیتا ہے:

یادگارِ زمانہ ہیں ہم لوگ[۲]
یاد رکھنا، فسانہ ہیں ہم لوگ

مصرعِ ثانی کتنا گرم ہے، اور "یاد رکھنا" "فسانے" کے واسطے کتنا مناسب۔

منشی عبداللطیف کے گھر میں لڑکے کے پیدا ہونے کی خبر مجھ کو ہو چکی ہے۔ اور تہنیت میں بھائی کو خط لکھ چکا ہوں۔ اب جو اُن سے ملو تو میرا سلام کہہ کر، اُس خط کے پہنچنے کی اطلاع لے لینا۔ مولوی معنوی جب کانپور سے معاودت فرمائیں، مجھ کو اطلاع دینا۔ میرا حال بہ دستور:

ہمان[۳] پہلو، ہمان بستر، ہمان درد

شنبہ ۲۶ جون ۱۸۵۸ء روزِ ورودِ نامہ

(۱۴۱)

مرزا تفتہ کو دعا پہنچے۔ بہت دن سے خط کیوں نہیں لکھا؟ آگرے میں ہو یا نہیں؟ مرزا حاتم علی صاحب کا شفقت نامہ آیا، یہاں سے اُس کا جواب بھیجا گیا، وہاں سے اُس کا جواب آ گیا۔ میر مکرم حسین صاحب کا خط پرسوں آیا، دو چار دن میں اُس کا جواب لکھوں گا۔ میرا حال بہ دستور ہے:

نہ نویدِ کامیابی، نہ نہیبِ نا اُمیدی

بھائی صاحب کا خط کئی دن ہوئے کہ آیا ہے اور وہ میرے خط کے جواب

میں ہے۔ دو ایک دن کے بعد جب جی باتیں کرنے کو چاہے گا، تب اُن کو خط لکھوں گا۔ تم اگر ملو تو اُن سے کہہ دینا کہ بھائی میر قاسم علی خاں کے شعر نے مجھ کو بڑا مزہ دیا۔ حُسنِ اتفاق یہ کہ کئی دن ہوئے تھے جو میں نے ایک ولایتی چغہ اور ایک شالی رومال ڈھائی گزا دلال کو دیا تھا اور وہ اُس وقت روپیہ لے کر آیا تھا۔ میں روپیہ لے کر اور خط پڑھ کر خوب ہنسا کہ خط اچھے وقت آیا۔

۱۸ جولائی ۱۸۵۸ء غالب

(۴۲)

مرزا تفتہ!

کل قریب دوپہر کے ڈاک کا ہرکارہ، وہ جو خط بانٹا کرتا ہے، آیا اور اُس نے پارسل موم جامے میں لپٹا ہوا دیا۔ پہلے تو میں بھی حیران رہا کہ پاکٹ خطوں کی ڈاک میں کیوں آیا۔ بارے، جب اُس کی تحریر دیکھی، تو تمھارے ہاتھ کا پمفلٹ لکھا ہوا اور دو ٹکٹ لگے ہوئے، مگر اُس کے آگے کالی مہر اور کچھ انگریزی لکھا ہوا۔ ہرکارے نے کہا کہ ایک روپیہ دس آنے دلوائیے۔ دلوا دیے اور پارسل لے لیا، مگر حیران کہ یہ کیا پیچ پڑا؟ قیاس ایسا چاہتا ہے کہ تمھارا آدمی جو ڈاک گھر گیا، اُس کو خطوں کے بکس میں ڈال دیا۔ ڈاک کے کارپردازوں نے غور نہ کی اور اُس کو بیرنگ خطوں کی ڈاک میں بھیج دیا۔

وہ صاحب جو میرے عرف سے آشنا اور میرے نام سے بیزار ہیں، یعنی منشی بھگوان پرشاد مسل خواں میرا سلام قبول کریں۔

۲۸ جولائی ۱۸۵۸ء غالب

(۴۳)

رکھیو غالبؔ مجھے اس تلخ[1] نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

بندہ پرور[2]!

تم کو پہلے یہ لکھا جاتا ہے کہ میرے دوست قدیم میر مکرم حسین صاحب کی خدمت میں میرا سلام کہنا اور یہ کہنا کہ[3] اب تک جیتا ہوں اور اس سے زیادہ میرا حال مجھ کو بھی معلوم نہیں۔ مرزا حاتم علی صاحب مہرؔ کی جناب میں میرا سلام کہنا اور یہ میرا شعر میری زبان سے پڑھنا[4]:

شرطِ اسلام بود ورزشِ ایماں بالغیب
اے تو غائب زِ نظر، مہرِ تو ایمانِ من ست

تمھارے پہلے خط کا جواب بھیج چکا تھا کہ اُس کے دو دن یا تین دن کے بعد دوسرا خط پہنچا۔

سنو صاحب! جس شخص کو جس شغل کا ذوق ہو[5] اور وہ اُس میں بے تکلف عمر بسر کرے، اس کا نام عیش ہے۔ تمھاری توجہِ مفرط بہ طرف شعر و سخن کے، تمھاری شرافتِ نفس اور حسنِ طبع کی دلیل ہے۔ اور بھائی! یہ جو تمھاری سخن گستری ہے، اس کی شہرت میں میری بھی تو نام آوری ہے۔ میرا حال اس فن میں اب یہ ہے کہ شعر کہنے کی روش اور اگلے کہے ہوئے اشعار سب بھول گیا؛ مگر ہاں، اپنے ہندی کلام میں سے ڈیڑھ شعر، یعنی ایک مقطع اور ایک مصرع یاد رہ گیا ہے؛ سو گاہ گاہ، جب دل اُلٹنے لگتا ہے، تب دس پانچ بار یہ مقطع زبان پر آجاتا ہے:

زندگی اپنی جب اِس شکل سے گزری غالبؔ[6]
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

پھر جب سخت گھبراتا ہوں اور تنگ آتا ہوں تو یہ مصرع پڑھ کر چپ ہو جاتا ہوں:

اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

یہ کوئی نہ سمجھے کہ میں اپنی بے رونقی اور تباہی کے غم میں مرتا ہوں؛ جو دُکھ مجھ کو ہے اُس کا بیان تو معلوم، مگر اُس بیان کی طرف اشارہ کرتا ہوں: انگریزی قوم میں سے، جو اِن روسیاہ کالوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے، اُس میں کوئی میرا اُمید گاہ تھا اور کوئی میرا شفیق اور کوئی میرا دوست اور کوئی میرا یار اور کوئی میرا شاگرد۔ ہندوستانیوں میں کچھ عزیز، کچھ دوست، کچھ شاگرد، کچھ معشوق؛ سو وہ سب کے سب خاک میں مِل گئے۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے؛ جو اتنے[۲] عزیزوں کا ماتم دار ہو، اُس کو زیست کیوں کر نہ دُشوار ہو۔ ہائے! اتنے یار مرے کہ جواب میں مروں گا، تو میرا کوئی رونے والا بھی نہ ہوگا۔

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ۔

جون یا جولائی ۱۸۵۸ء[۳]

(۴۴)

مرزا تفتہ!

تمھارے اوراقِ مثنوی کا پمفلٹ پاکٹ پرسوں پندرہ اگست کو اور جناب رِزا حاتم علی صاحب کی نثر شاید آغازِ اگست میں روانہ کر چکا ہوں۔ اُس نثر کی رسید نہیں پائی اور نہیں معلوم ہوا کہ میری خدمت مخدوم کے مقبولِ طبع ہوئی یا نہیں۔ نہیں معلوم بھائی نبی بخش صاحب کہاں ہیں اور کس طرح ہیں اور کس خیال میں ہیں؟ نہیں معلوم مولوی قمرالدین خاں الٰہ آباد سے آ گئے یا نہیں؟ اگر نہیں آئے تو وہ وہاں کیوں متوقف ہیں؟ میر منشی قدیم وہاں پہنچ گئے؟ اپنا کام کرنے لگے؟ یہ کیا کر رہے ہیں؟

آپ کو بہ تاکید لکھتا ہوں کہ اِن تینوں باتوں کا جواب الگ الگ لکھیے اور جلد لکھیے۔ اس خط کے پہنچنے تک اغلب ہے کہ پارسل پہنچ جائے، اُس کے پہنچنے کی بھی اطلاع دیجیے گا۔

اب ایک امر سنو: میں نے آغازِ یازدہم مئی ۱۸۵۷ء سے سی و یکم جولائی ۱۸۵۸ء تک رودادِ شہر اور اپنی سرگذشت یعنی پندرہ مہینے کا حال نثر میں لکھا ہے اور التزام اس کا کیا ہے کہ "دساتیر" کی عبارت یعنی پارسی قدیم لکھی جائے اور کوئی لفظ عربی نہ آئے۔ جو نظم اُس نثر میں درج ہے، وہ بھی بے آمیزش لفظ عربی ہے۔ ہاں، اشخاص کے نام نہیں بدلے جاتے۔ وہ عربی، انگریزی، ہندی جو ہیں، وہ لکھ دیے ہیں۔ مثلاً تمھارا نام منشی ہرگوپال؛ "منشی" لفظ عربی ہے، نہیں لکھا گیا؛ اس کی جگہ "شیوازبان" لکھ دیا ہے۔ یہی میرا خط جیسا اس رقعے میں ہے، یعنی نہ چھدرا نہ گنجان، اوراقِ بے مسطر، اس طرح کہ کسی صفحے میں بیس سطر اور کسی میں بائیس بلکہ کسی میں انیس سطر بھی آئے۔ چالیس صفحے یعنی بیس ورق ہیں۔ اگر اکیس سطر کے مسطر سے کوئی گنجان لکھے تو شاید دو جز میں آجائے۔ یہاں کوئی مطبع نہیں ہے۔ سُنتا ہوں کہ ایک ہے، اُس میں کاپی نگار خوش نویس نہیں ہے۔ اگر آگرے میں اس کا چھاپا ہو سکے تو مجھ کو اطلاع کرو۔ اس تہی دستی اور بے نوائی میں پچیس کا میں بھی خریدار ہو سکتا ہوں، لیکن صاحبِ مطبع اتنے پہ کیوں ماننے لگا؛ اور البتہ چاہیے، کہ اگر ہزار نہ ہوں تو پانسو جلد تو چھاپی جائے۔ یقین ہے کہ پانسو، سات سو جلد چھاپنے کی صورت میں تین آنے، چار آنے قیمت پڑے۔ کاپی تو ایک ہی ہوگی؛ رہا کاغذ، وہ بھی بہت نہ لگے گا۔ لکھائی متن کی تو آپ کو معلوم ہو گئی۔ حاشیے پر البتہ لغات کے معنی لکھے جائیں گے۔ بہ ہر حال، اگر ممکن ہو تو اس کا تکدمہ کرو اور حساب معلوم کرکے مجھ کو لکھو۔ اگر منشی قمرالدین خاں آ گئے ہوں تو اُن کو

بھی شریکِ مصلحت کرلو۔ ان تینوں باتوں کا جواب اور پارسل کی رسید اور اس مطلب خاص کا جواب، یہ سب ایک خط میں پاؤں، ضرور ضرور ضرور۔

نگاشتہ و رواں داشتہ، سہ شنبہ ہفدہم اگست ۱۸۵۸ء

جواب طلب۔ واسطے تاکید کے بیرنگ بھیجا گیا۔ غالب

(۴۵)

صاحب!

عجب اتفاق ہے، آج صبح کو ایک خط تم کو اور ایک خط، جاگیر کے گاؤں کی تہنیت میں اپنے شفیق کو ڈاک میں بھیج چکا تھا کہ دوپہر کو رضی الدین نیشنا پوری کا کلام ایک شخص بیچتا ہوا لایا۔ میں تو کتاب کو دیکھ لیتا ہوں، مول نہیں لیتا۔ قضارا، جب میں نے اُس کو کھولا، اُسی ورق میں یہ شعر[۲] نکلا:

اگر بہ گنجِ گہر مسلیم اوفتاد، چہ باک
کفِ جوادِ ترا از برائے آں دارم

چاہتا تھا کہ تم کو لکھوں کہ ناگاہ تمھارا خط آیا، مجھ کو لکھنا ضرور ہوا۔ آج تمھیں دو خط بھیجے ہیں، ایک تو صبح کو پوسٹ پیڈ، اور ایک اب بارہ پر تین بجے، بیرنگ۔ اُس شعر کو اب چاہو رہنے دو۔

ہائے ہائے! تم بھائی سے ملے "غیاث اللغات" کھلوائی، "جواد" کا لغت دیکھا، مگر میرا ذکر نہ کیا کہ وہ تمھارا جویائے حال ہے۔ "دستنبو" اور اُس کے چھاپے کا ذکر نہ کیا۔ البتہ اگر تم ذکر کرتے، تو وہ دونوں باب میں کچھ فرماتے اور مجھ کو دعا سلام کہہ دیتے۔ چوں کہ تم نے اپنے خط میں کچھ نہیں لکھا، اس سے معلوم ہوا کہ بھائی نے کچھ نہیں کہا۔ اگر انھوں نے کچھ نہیں کہا تو اُن کا ستم

اور اگر اُن کا کہا ہوا تم نے نہیں لکھا تو تمھارا کرم۔ بہ ہر حال، خوب مصرع حافظؔ کا تم نے مجھ کو یاد دلایا ہے:

یارب! مباد کس را مخدوم بے عنایت

خواہی تم، خواہی منشی نبی بخش سلمہ اللہ تعالیٰ۔ یہ یاد رہے یہ مصرع اگر مجھ پر زنجیر سے باندھو گے تو بھی نہیں بندھے گا۔

اگر "دستنبو" کو سراسر غور سے دیکھو گے تو اپنا نام پاؤ گے اور یہ بھی جانو گے کہ وہ تحریر، تمھاری اس تحریر سے سو برس پہلے کی ہے۔

آخرِ روز دوشنبہ ۲۳ اگست ۱۸۵۸ء

(۴۶)

نورِ نظر و لختِ جگر مرزا تفتہ!

تم کو معلوم رہے کہ رائے صاحب مکرم و معظم رائے امید سنگھ بہادر یہ رقعہ تم کو بھیجیں گے۔ تم اس رقعے کو دیکھتے ہی اُن کے پاس حاضر ہونا اور جب تک وہاں رہیں، تب تک حاضر ہوا کرنا اور "دستنبو" کے باب میں جو اُن کا حکم ہو، بجا لانا۔ اُن کو پڑھا بھی دینا اور فی جلد کا حساب سمجھا دینا۔ پچاس جلد کی قیمت عنایت کریں گے، وہ لے لینا۔ جب کتاب چھپ چکے، دس جلدیں رائے صاحب کے پاس اندور بھیج دینا اور چالیس جلدیں بہ موجب اُن کے حکم کے، میرے پاس ارسال کرنا۔ اور وہ جو میں نے پانچ جلد کی آرایش کے باب میں تم کو لکھا ہے، اُس کا حال مجھ کو ضرور لکھنا۔

ہاں صاحب، ایک رباعی میرے سہو سے رہ گئی ہے؛ اُس رباعی کو چھاپا ہونے سے پہلے حاشیے پر لکھ دینا، جہاں یہ فقرہ ہے: "نے نے اختر بخت

خسرو در بلندی بجاے رسید کہ رُخ از خاکیاں نہفت":

جائیکہ ستارہ شوخ چشمی ورزد
افسر افسار و گرزن ارزان ارزد
خرشید ز اندیشۂ جادر گردش
بر چرخ نہ بینی کہ چساں می لرزد

چوں کہ حاشیۂ معنیِ لغات سے بھرا ہوا ہے، تو تم اس فقرے کے آگے نشان بناکر، اوپر کے حاشیے پر رُباعی لکھ دینا اور حاشیۂ یمین پر، جہاں اور معنی لکھے ہوئے ہیں، وہاں رُباعی کے لغات کے معنی خفی قلم سے لکھ دینا: "افسر" "افسار" "گرزن" بہ ہر دو فتحہ، "جادر گردش"!

نگاشتۂ ۲۸ اگست ۱۸۵۸ء
غالب

(۴۷)

بھائی!

تمھارا وہ خط، جس میں اوراقِ مثنوی ملفوف تھے، پہنچا۔ اوراقِ مثنوی، اوراقِ "دستنبو" کے ساتھ پہنچیں گے۔ اب تمھارے مطالب کا جواب جُدا جُدا لکھتا ہوں۔ الگ الگ سمجھ لینا۔

صاحب! تم نے مرزا حاتم علی صاحب سے کیوں کہا؟ بات اتنی تھی کہ مجھ کو لکھ بھیجتے کہ نثر آئی اور مرزا صاحب نے پسند کی۔ اب اُن سے میرا سلام کہو اور یہ کہو کہ آپ کے تشکر بجالانے کا تشکر بجالاتا ہوں۔

چھاپے کے باب میں جو آپ نے لکھا، وہ معلوم ہوا۔ اس تحریر کو جب دیکھو گے، تب جانو گے۔ اہتمام اور عجلت اس کے چھپوانے میں اس واسطے ہے

کہ اس میں سے ایک جلد نواب گورنر جنرل بہادر کی نذر بھیجوں گا اور ایک جلد بذریعے اُن کے جناب ملکۂ معظمۂ انگلستان کی نذر کروں گا۔ اب سمجھ لو، طرزِ تحریر کیا ہوگی اور صاحبانِ مطبع کو اُس کا انطباع کیوں نامطبوع ہوگا۔

جیتے رہو، اس غم زدگی میں مجھ کو ہنسایا۔ وہ کون ملّا تھا جس نے تم کو پڑھایا:

گرچہ عمل کار، خرد مند نیست

عملکار، اہلکار۔ یہ شعر شیخ سعدی کا بادشاہ کی نصیحت میں ہے:

جز بخرد مند مفرما عمل

یعنی خدمت و اعمال سوائے علما اور عقلا کے، اور کے تفویض نہ کر، پھر خود کہتا ہے:

گرچہ عمل کارِ خرد مند نیست

یعنی اگرچہ خدمات و اشغال سُلطانی کا قبول کرنا خردمندوں کا کام نہیں اور عقل سے بعید ہے کہ آدمی اپنے کو خطر میں ڈالے۔ ”عمل“ الگ ہے اور ”کار“ مضاف ہے بطرف ”خردمند“ کے؛ ورنہ دوہائی خدا کی، ”عمل کار“ ”اہل کار“ کے معنی پر نہیں آتا مگر قتیل اور واقف یا اور پورب کے مُلکیوں کی فارسی۔

اگست ۱۸۵۸ء

(۴۸)

صاحب!

عجب تماشا ہے۔ تمھارے کہے سے منشی شیونرائن صاحب کو خط لکھا تھا سو کل اُن کا خط آیا اور انھوں نے ”دستنبو“ کی رسید لکھی۔ ڈاک کا ہرکارہ تو اُن کے پاس لے نہ گیا ہوگا، آخر تمھیں نے بھیجا ہوگا۔ یہ کیا کہ تم نے مجھ کو اُس کی رسید اور میرے خط کا جواب نہ لکھا۔

اگر یہ گمان کیا جائے کہ تم نے رائے اُمید سنگھ کی ملاقات ہو لینے پر خط کا

لکھنا منحصر رکھا ہے تو وہ بھی ہو چکی ہو گی۔ مجھے تو صورت ایسی نظر آتی ہے کہ گویا تم الگ ہو گئے ہو۔ کتاب مطبع میں حوالے کر دی، اب اُس کی تزئین و تصحیح سے کچھ غرض نہیں۔ پس اگر یوں ہے تو میں اس انطباع سے در گزرا۔ سینکڑوں مطالب و مقاصد رہ جائیں گے اور پھر اس وحشت کی وجہ کیا؟ اگر کہا جائے کہ وحشت نہیں ہے تو اُس کتاب اور مثنوی کی رسید نہ لکھنے کی وجہ کیا؟ بے تکلف قیاس چاہتا ہے کہ تم مجھ سے خفا ہو گئے ہو؟ خدا کے واسطے، خفگی کی وجہ لکھو۔ صبح کو میں نے یہ خط روانہ کیا ہے، بدھ کا دن ستمبر کی پہلی تاریخ؛ اگر شام تک تمھارا خط آیا تو خیر، ورنہ تمھاری رنجش کا بالکل یقین ہو جائے گا اور بہ سبب وجہ نہ معلوم ہونے کے، جی گھبرائے گا۔ میں تو اپنے نزدیک کوئی سبب ایسا نہیں پاتا۔ خدا کے واسطے، خط جلد لکھو، اگر خفا ہو تو خفگی کا سبب لکھو۔

جانتا ہوں کہ تم رائے اُمید سنگھ سے بھی نہ ملے ہو گے۔ عیاذاً باللہ! میں اُن سے شرمندہ رہا کہ میں نے کہا تھا کہ ہاں، مرزا تفتہ "دستنبو" تم کو اچھی طرح پڑھا دیں گے۔

اگرچہ ایسے حال میں کہ مجھ کو تم پر الگ ہونے اور پہلو تہی کرنے کا گمان گزرا ہے، کوئی مطلب تم کو لکھنا نہ چاہیے مگر ضرورت کو کیا کروں، ناچار لکھتا ہوں۔ صاحبِ مطبع نے خط کے لفافے پر لکھا ہے: "مرزا نوشہ صاحب غالبؔ" للہ غور کرو، یہ کتنا بے جوڑ جملہ ہے۔ ڈرتا ہوں کہ کہیں صفحۂ اول کتاب پر بھی نہ لکھ دیں۔ آیا "فارسی کا دیوان یا اُردو یا "پنج آہنگ" یا "مہرِ نیمروز" چھاپے کی، یہ کوئی کتاب اُس شہر میں نہیں پہنچی جو وہ میرا نام لکھ دیتے؟ تم نے بھی اُن کو میرا نام نہیں بتایا۔ صرف اپنی نفرت عرف سے، وجہ اس واویلا کی نہیں ہے بلکہ سبب یہ ہے کہ دلّی کے حکام کو تو عرف معلوم ہے مگر کلکتے سے ولایت تک، یعنی

وزرا کے محکمے میں اور ملکۂ معظمہ عالیہ کے حضور میں کوئی اس نالائق عرف کو نہیں جانتا۔ پس اگر صاحبِ مطبع نے "مرزا نوشہ صاحب غالبؔ" لکھ دیا تو میں غارت ہو گیا، کھو اگیا، میری محنت رایگاں گئی، گویا کتاب کسی اور کی ہو گئی۔ لکھتا ہوں اور پھر سوچتا ہوں کہ دیکھوں تم یہ پیام مطبع میں پہنچا دیتے ہو یا نہیں۔

بُدھ کا دن ستمبر کی پہلی تاریخ ۱۸۵۸ء

(۴۹)

للہ الشکر، تمھارا خط آیا اور دلِ سودا زدہ نے آرام پایا۔ تم میرا خط اچھی طرح پڑھا نہیں کرتے، میں نے ہرگز نہیں لکھا کہ یہ عبارت دو جزمیں آجائے۔ میں نے یہ لکھا تھا کہ عبارت اس قدر ہے کہ دو جز میں آجائے لیکن میں چاہتا ہوں کہ حجم زیادہ ہو۔ بہ ہر حال، اس نمونے کی تقطیع اور حاشیہ مطبوع ہے۔ لغات کے معنی حاشیے پر چڑھیں۔ اُس کی روش دلآویز اور تقسیم نظر فریب ہو۔ رباعی حاشیے پر لکھ دی، اچھا کیا۔ بھائی منشی نبی بخش صاحب سے نثر کے دو فقرے، جس محل پر کہ اُن کو بتلائے ہیں، ضرور لکھوا دینا۔ میں نے جو تم کو "مرزائی" کا خطاب دیا ہے، اُن فقروں میں اس کا اظہار کیا ہے۔

بہت ضروری یہ امر ہے اور میں منشی شیو نرائن صاحب کو آج صبح کو لکھ چکا ہوں، تیسرے صفحے کے آخر یا چوتھے صفحے کے اوّل یہ جملہ ہے: "اگر در دم دیگرہ نہیب مباش بہم زند"۔ "نہیب" کی جگہ "نوائے" بنا دینا، "بہ نوائے مباش بہم زند"۔ "نہیب" لفظ عربی ہے اگر رہ جائے گا تو لوگ مجھ پر اعتراض کریں گے۔ تیز چاقو کی نوک سے "نہیب" کا لفظ چھیلا جائے اور اُسی جگہ "نوائے" لکھ دیا جائے۔

راے امید سنگھ نے مجھ پر عنایت اور مطبع کی اعانت کی، حق تعالیٰ اُن کو اس کارسازی اور فقیر نوازی کا اجر دے۔ صاحب! کبھی نہ کبھی میرا کام تم سے آپڑا ہے اور پھر کام کیسا کہ جس میں میری جان اُلجھی ہوئی ہے اور میں نے اُس کو اپنے بہت سے مطالب کے حصول کا ذریعہ سمجھا ہے۔ خدا کے واسطے پہلوتہی نہ کرو اور بہ دل توجہ فرماؤ۔ کاپی کی تصحیح کا ذمہ بھائی کا ہو گیا ہے۔ چھپے جلدوں کی آراستگی کا ذمہ برخوردار عبداللطیف کا کردو۔ میری طرف سے دعا کہو اور کہو کہ میں تمھارا بوڑھا اور مفلس چچا ہوں۔ تصحیح بھائی کریں، تزئین تم کرو۔ کہتا ہوں، مگر نہیں جانتا کہ تزئین کیوں کر کیا چاہیے۔ سُنتا ہوں کہ چھاپے کی کتاب کے حرفوں پر سیاہی کی قلم پھیر دیتے ہیں تاکہ حرف روشن ہو جائیں۔ سیاہ قلم سے جدول بھی کھچ جاتی ہے۔ پھر جلد بھی پُر تکلف بن سکتی ہے۔ بھتیجے کی دستکاری اور صناعی اور ہوشیاری اُن کی میرے کس دن کام آئے گی؟

مرزا تفتہ! تم بڑے بے درد ہو، دلّی کی تباہی پر تم کو رحم نہیں آتا! تم اُس کو آباد جانتے ہو۔ یہاں نیچہ بند تو میسر نہیں، صحاف اور نقاش کہاں! شہر آباد ہوتا تو میں آپ کو تکلیف کیوں دیتا؟ یہیں سب درستی میری آنکھوں کے سامنے ہو جاتی۔ قصہ مختصر، یہ عبارت منشی عبداللطیف کو پڑھا دو۔ میں تو اُن کے باپ کو اپنا حقیقی بھائی جانتا ہوں؛ اگر وہ مجھے اپنا حقیقی چچا جانیں اور میرا کام کریں تو کیا عجب ہے۔ دو روپیہ فی جلد، اس سے زیادہ کا مقدور نہیں۔ جب مجھ کو لکھو گے، ہنڈوی بھیج دوں گا۔ چھے روپے، آٹھ روپیے، دس روپیے حد بارہ روپیے۔ میاں کو سمجھا دینا، کمی کی طرف نہ کریں، چیز اچھی بنے۔ نہایت، بارہ میں چھے جلدیں تیار ہوں۔

منشی شیو نرائن کو سمجھا دینا کہ زنہار عرف نہ لکھیں، نام اور تخلص، بس۔

اجزاے خطابی کا لکھنا نامناسب، بلکہ مضر ہے۔ مگر ہاں، نام کے بعد لفظ ”بہادر“ کا اور ”بہادر“ کے لفظ کے بعد تخلص ”اسداللہ خاں بہادر“ غالبؔ۔

بھائی! تم نے اوراقِ مثنوی کی رسید نہ لکھی۔ کہیں وہ پارسل میں سے گر تو نہ گئے ہوں؟ دیکھو، کس لطف سے میرے نام کی حقیقت بیان ہوئی ہے۔ اوروں کے چھاپنے کی ممانعت ضرور ہے مگر میں اُس کی عبارت کیا بتاؤں؛ صاحبِ مطبع اِس امر کو، اردو میں، آخرِ کتاب لکھ دیں۔ منشی جی سے نثر لکھوالو، منشی عبداللطیف کو یہ خط پڑھا دو، ”نہیب“ کی جگہ ”نوائے“ بنا دو، صاحبِ مطبع کو میرا نام بنادو، خاتمے پر ممانعت کا حکم صاحبِ مطبع سے لکھوا دو، برخوردار عبداللطیف سے مقدار روپیے کی دریافت کر کے مجھ کو لکھ بھیجو، اپنی مثنوی کی رسید لکھو، اپنے بہ جان و دل مصروف ہونے کا اقرار کرو، اِن سب امور کی مجھے خبر دو۔

جمعہ سوم ستمبر ۱۸۵۸ء ہنگام نیمروز
غالبؔ

(۵۰)

مرزا تفتہ کو دعا پہنچے۔ دونوں فقرے جس محل پر بتلائے ہیں، حاشیے پر لکھ دیے ہوں گے۔ ”نہیب“ کے لفظ کو چھیل کر ”نوائے“ بنا دیا ہوگا۔ برخوردار منشی عبداللطیف کو میرا خط اپنے نام کا دکھا دیا ہوگا۔ اُن کی سعادت مندی سے یقین ہے کہ میری التماس قبول کریں اور اِدھر متوجہ ہوں۔ کاپی لکھی جانی اور چھاپا ہونا شروع ہو گیا ہوگا؛ اگر پتھر بڑا ہے تو چاہیے آٹھ آٹھ صفحے بلکہ بارہ بارہ صفحے چھاپے جائیں اور کتاب جلد منطبع ہو جائے۔

بھائی! منشی صاحب کی شفقت کا حال پوچھنا ضرور نہیں، مجھ پر مہربان اور حسنِ کلام کے قدردان ہیں؛ اُس کی تصحیح میں بے پروائی کریں گے تو کیا میری تفضیح کے روادار ہوں گے؟ بھائی! تم نے بھی لکھا اور منشی شیو نرائن

صاحب نے بھی لکھا؛ میں ایک عبارت لکھتا ہوں، اگر پسند آئے تو خاتمۂ عبارت میں چھاپ دو: "نامہ نگار غالبِ خاکسار کا یہ بیان ہے کہ یہ جو میری سرگذشت کی داستان ہے، اس کو میں نے مطبع مفیدِ خلائق میں چھپوایا ہے۔ اور میری رائے میں اُس کا یہ قاعدہ قرار پایا ہے کہ اور صاحبانِ مطابع جب تک مجھ سے طلب رخصت نہ کریں، اپنے مطبع میں اس کے چھاپنے پر جرأت نہ کریں۔" اِس کے سوا اگر کوئی طرح کی تحریر منظور ہو تو منشی شیونرائن صاحب کو اجازت ہے کہ میری طرف سے چھاپ دیں۔ یہ سب باتیں پہلے بھی لکھ چکا ہوں۔ اب دو امر ضروری الاظہار تھے، اِس واسطے یہ خط لکھا ہے: ایک تو اُردو عبارت، دوسرے یہ کہ میرے شفیق مکرم سید مکرم حسین صاحب کا خط میرے نام آیا ہے اور انھوں نے ایک بات جواب طلب لکھی ہے، اُس کا جواب اسی خط میں لکھتا ہوں۔ تم کو چاہیے کہ اُن سے کہہ دو، بلکہ یہ عبارت اُن کو دکھا دو:

بندہ پرور، نواب عطاءاللہ خاں میرے بڑے دوست اور شفیق ہیں۔ اُن کے فرزند رشید میر غلام عباس المخاطب بہ سیف الدولہ، یہ دونوں صاحب صحیح وسالم ہیں۔ شہر سے باہر دو چار کوس پر کوئی گاؤں ہے، وہاں رہتے ہیں۔ شہر میں اہلِ اسلام کی آبادی کا حکم نہیں اور اُن کے مکانات قرق ہیں؛ نہ ضبط ہو گئے ہیں، نہ واگذاشت کا حکم ہے۔

۳۔ ۷ ستمبر ۱۸۵۸ء

(۵۱)

مشفق میرے، کرم فرما میرے!

تمھارا خط اور تین دو ورقے چھاپے کے پہنچے۔ شاید میرے دکھانے

کے واسطے بھیجے گئے ہیں۔ ورنہ رسم تو یوں ہے کہ پہلے صفحے پر کتاب کا نام اور مصنف کا نام اور مطبع کا نام چھاپتے ہیں اور دوسرے صفحے پر لوح سیاہ قلم سے بنتی ہے اور کتاب لکھی جاتی ہے۔ اِس کا بھی چھاپا اِسی طرح ہوگا۔ غرض کہ تقطیع اور شمارِ سطور اور کاپی کا حسنِ خط اور الفاظ کی صحت، سب میرے پسند۔ صحتِ الفاظ کا کیا کہنا ہے! واللہ! بے مبالغہ کہتا ہوں؛ اگر بھائی منشی نبی بخش صاحب بہ دل متوجہ ہوں تو اگر احیاناً اصل نسخے میں سہوِ کاتب سے غلطی واقع ہوئی ہو تو اُس کو بھی صحیح کردیں گے۔ تم میری طرف سے اُن کو سلام کہنا، بلکہ یہ خط دکھا دینا۔ خدا کرے، انجام تک یہی قلم اور یہی خط اور یہی طرزِ تصحیح چلی جائے۔ جدول بھی مطبوع ہے۔ پہلے صفحے کی صورت اور دوسرے صفحے کی لوح بھی خدا چاہے تو دل پسند اور نظر فریب ہوگی۔

کاغذ کے باب میں یہ عرض ہے کہ فرنچ کاغذ اچھا ہے۔ چھے جلدیں جو نذرِ حکام ہیں، وہ اس کاغذ پر ہوں اور باقی چاہو شیورام پوری پر اور چاہو نیلے کاغذ پر چھاپو اور یہ بات کہ دو جلدیں جو ولایت جانے والی ہیں، وہ اُس کاغذ پر چھاپی جائیں اور باقی شیورام پوری پر یا نیلے کاغذ پر، یہ تکلفِ محض ہے۔ یہاں کے حاکموں نے کیا کیا ہے کہ اُن کی نذر کی کتابیں اچھے کاغذ پر نہ ہوں؛ مگر جو ایسا ہی صرف اور خرچ زائد پڑتا ہو، تو خیر، دو جلدیں اس کاغذ پر اور چار جلدیں شیورام پوری پر ہوں؛ باقی جلدوں میں تمھیں اختیار ہے۔ ہاں صاحب، اگر ہوسکے تو کاپی کی سیاہی ذرا اور سیاہ اور رخشندہ ہو اور آخر تک رنگ نہ بدلے۔ آگے اس سے میں نے برخوردار منشی عبداللطیف کو لکھا تھا کہ ان چھے کتابوں کی کچھ تزئین اور آرایش کی فکر کریں۔ معلوم نہیں، تم نے وہ پیام اُن کو پہنچایا یا نہیں۔ آپ اور منشی عبداللطیف اور مرزا حاتم علی صاحب مہر

باہم صلاح کریں۔ اور کوئی بات خیال میں آوے تو بہتر، ورنہ ان چھپے نسخوں کی جلدیں انگریزی ڈیڑھ ڈیڑھ، دو دو روپیے کی لاگت کی بنوا دینا اور اِس کا روپیہ تیاری سے پہلے مجھ سے منگوا لینا:

”آن کہ ہمہ را در یکدم بہ نوید بشو پدید آورد اگر در دم دیگر بہ نہیب
مباش بہم زند الخ“:

اس میں ”نہیب“ کا لفظ کچھ میری سہل انگاری سے اور کچھ سہوِ کاتب سے رہ گیا ہے۔ اِس کو تیز چاکو سے چھیل کر ”بہ نوائے“ لکھ دینا۔ یعنی ”بہ نوائے مباش بہم زند“ ضرور ضرور۔ اس کا انتظار نہ کیجیو کہ جب یہاں چھاپا آئے گا تو بنا دیں گے۔ نہ اصل کتاب میں غلط رہے نہ چھاپے میں غلط ہو، اگر اجزائے اصل میر امیر علی صاحب کاپی نویس کے پاس ہوں تو اُن کو یا بھائی منشی نبی بخش صاحب کو یہ رقعہ دکھا کر سمجھا دینا اور بنوا دینا۔

روز سہ شنبہ ہفتم ستمبر ۱۸۵۸ء
از غالب

(۵۲)

اچھا میرا بھائی! ”نہیب“ والے دو ورقے چار سو ہوں، پانسو ہوں، سب بدلوا ڈالنا۔ کاغذ کا جو نقصان ہو وہ مجھ سے منگوا لینا۔ اس لفظ کے رہ جانے میں ساری کتاب نکمی ہو جائے گی اور میرے کمال کو دھبا لگ جائے گا۔ یہ لفظ عربی ہے ہرچند مسودے میں بنا دیا تھا لیکن کاتب کی نظر سے رہ گیا۔

لکھتے ہو کہ مرزا صاحب دو جلدیں درست کریں گے، یہ تو صورت اور ہے، یعنی میں نے چھے جلدیں، بارہ روپیے کی لاگت میں بہ کارسازی و ہنر پردازیِ برخوردار منشی عبداللطیف چاہیں تھیں۔ منتظر تھا کہ اب اُن کا قبول کرنا مجھ کو لکھو گے

اور روپیہ مجھ سے منگواؤ گے۔ ظاہرا عبداللطیف نے پہلو تہی کیا۔ مرزا صاحب اگر کفیل ہوئے تھے، تو چھے جلدیں بنوا لیتے نہ کہ دو۔ البتہ اس احتمال کی گنجایش ہے کہ دو بہت پر تکلف اور چار بہ نسبت اُس کے کچھ کم۔ اگر یوں ہے، تو یہ تو مدعاے دلی میرا ہے مگر اطلاع ضرور ہے۔

راے امید سنگھ کے نام کا خط بہ احتیاط رہنے دو۔ جب وہ آئیں، اُن کو دے دو۔ یہ جو تم لکھتے ہو کہ "نہیب" کا لفظ لکھ دیا گیا تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ چھاپا شروع ہو کر دور تک پہنچ گیا۔ کیا عجب ہے کہ کتابیں جلد منطبع ہو جائیں۔

ہمارے منشی شیو نرائن صاحب اپنے مطبع کے اخبار میں اس کتاب کے چھاپے کا اشتہار کیوں نہیں چھاپتے "تاکہ درخواستیں خریداروں کی فراہم ہو جائیں۔

مرزا تفتہ سنو: اِن دنوں میں میرے محسن حکیم احسن اللہ خاں "آفتاب عالمتاب" کے خریدار ہوئے ہیں اور میں نے بہ موجب ان کے کہنے کے برادر دینی مولانا مہر کو لکھا ہے۔ حضرت نے لا و نعم جواب میں نہیں لکھا۔ تم اُن سے کہو کہ وہ ستمبر ۱۸۵۸ء سے خریدار ہیں۔ آج سولہ ستمبر کی ہے، دو نمبر اخبار کے، حکیم صاحب کے نام کا سر نامہ، خان چند کے کوچے کا پتا لکھ کر روانہ کریں۔ آیندہ ہفتہ بہ ہفتہ بھیجے جائیں اور حکیم احسن اللہ خاں کا نام خریداروں میں لکھ لیں۔ دوسرے، اخبار مذکور میں ایک صفحہ ڈیڑھ صفحہ بادشاہِ دہلی کے اخبار کا ہوتا ہے۔ جس دن سے کہ وہ اخبار شروع ہوا ہے، اُس دن سے صرف اخبار شاہی کا صفحہ نقل کر کے ارسال کریں۔ کاتب کی اجرت اور کاغذ کی قیمت یہاں سے بھیج دی جائے گی۔ بھائی! تم مرزا صاحب سے اس کو کہہ کر جواب لو اور مجھ کو اطلاع دو۔ "نہیب" کے نہیب سے مرا جاتا ہوں، اُس کی درستی کی خبر بھیجو۔ باقی جو چھاپے کے حالات ہوں، اُس کی آگاہی ضرور ہے۔

پنجشنبہ ۱۶ ستمبر ۱۸۵۸ء

غالب

(۵۳)

بھائی!

مجھ میں تم میں نامہ نگاری کا ہے کو ہے، مکالمہ ہے۔ آج صبح کو ایک خط بھیج چکا ہوں، اب اس وقت تمھارا خط اور آیا۔

سنو صاحب! لفظ مبارک، میم، حا، میم، دال؛ اس کے ہر حرف پہ میری جان نثار ہے؛ مگر چوں کہ یہاں سے ولایت تک حکام کے ہاں سے یہ لفظ، یعنی "محمد اسد اللہ خاں" نہیں لکھا جاتا، میں نے بھی موقوف کر دیا ہے۔ رہا "مرزا" و "مولانا" و "نواب" اس میں تم کو اور بھائی کو اختیار ہے؛ جو چاہو، سو لکھو۔

بھائی کو سلام کہنا۔ اُن کے خط کا جواب صبح کو روانہ کر چکا ہوں۔

مرزا تفتہ، اب تم تزئین جلد ہاے کتاب کے باب میں برادر زادۂ سعادت مند کو تکلیف نہ دو۔ مولانا مہرؔ کو اختیار ہے، جو چاہیں سو کریں۔

خط تمام کر کے خیال میں آیا کہ وہ جو مرزا صاحب سے مجھ کو مطلوب ہے، تم پر بھی ظاہر کروں۔ صاحب، وہاں ایک اخبار موسوم بہ "آفتابِ عالمتاب" نکلتا ہے، اُس کے مہتمم نے التزام کیا ہے کہ ایک صفحہ یا ڈیڑھ صفحہ بادشاہِ دہلی کے حالات کا لکھتا ہے۔ نہیں معلوم، آغاز کس مہینے سے ہے۔ سو، حکیم احسن اللہ خاں یہ چاہتے ہیں کہ سابق کے جو اوراق ہیں، جب سے ہوں، وہ جو چھاپے خانے میں مسودے رہتے ہیں، اُس کی نقل کسی کاتب سے لکھوا کر یہاں بھیجی جائے۔ اجرت جو لکھی آئے گی، وہ بھیجی جائے گی۔ اور ابتداے ستمبر ۱۸۵۸ء سے اُن کا نام خریداروں میں لکھا جائے۔ دو ہفتے کے دو نمبر اُن کو ایک لفافے میں بھیج دیے جائیں۔ اور پھر ہر مہینے، ہفتہ در ہفتہ اُن کو لفافہ اخبار کا پہنچا کرے۔

یہ مراتب جناب مرزا حاتم علی صاحب کو لکھ چکا ہوں اور اب تک آثارِ قبول ظاہر نہیں ہوئے۔ نہ لفافے حکیم صاحب پاس پہنچے نہ اُن صفحات کی نقل میرے

پاس آئی۔ آپ کو اِس میں سعی ضرور ہے۔ اور ہاں صاحب "آفتاب عالمتاب" کا مطبع تو کشمیری بازار میں ہے مگر آپ مجھ کو لکھیں کہ "مفید خلائق" کا مطبع کہاں ہے؟ عجب ہے کہ اِن صاحب شفیق نے میری تحریرات کا جواب نہیں لکھا۔ فرمایش حکیم احسن اللہ خاں صاحب کی بہت اہم ہے۔ عندالملاقات میرا سلام کہہ کر اُس کا جواب؛ بلکہ وہ اخبار اُن سے بھجواؤ۔

جمعہ، ۱۷ ستمبر ۱۸۵۸ء
غالب

(۵۴)

بھائی!

آج صبح کو بہ سبب حکیم صاحب کے تقاضے کے شکوہ آمیز خط جناب مرزا صاحب کی خدمت میں لکھ کر بھیجا۔ کلیان خط ڈاک میں ڈال کر آیا ہی تھا کہ ڈاک کا ہرکارہ ایک خط تمھارا اور ایک خط مرزا صاحب کا لایا۔ اب کیا کروں! اخیر، چُپ ہو رہا۔ شکوہ محبت بڑھائے گا۔ مرزا صاحب کی عنایت کا شکر بجا لاتا ہوں؛ یقین ہے کہ جلدیں میرے خاطر خواہ بن جائیں گی؛ کس واسطے کہ جو آج کے خط میں اُنھوں نے لکھا ہے، وہ بعینہٖ میرا مکنونِ ضمیر ہے۔ خدا اُن کو سلامت رکھے۔ میرا سلام کہہ دینا۔ اُن کے خط کا جواب کل پرسوں بھیجوں گا۔

رائے امید سنگھ بہادر خوبانِ روزگار میں سے ہیں۔ فقیر کا سلام نیاز اُن کو کہہ دینا۔ خدا کرے، اُن کے سامنے کتابیں چھپ چکیں۔ بارے، جب وہ گوالیار کو تشریف لے جائیں تو مجھ کو اطلاع لکھنا۔

"نہیب" کے "نواے" بن جانے سے خاطر جمع ہو گئی۔ بھائی! میں فارسی کا محقق ہوں؛ کاتب اُن اجزا کا، جن کے رُو سے کاپی لکھی جاتی ہے، فارسی کا عالم ہے۔

علم اُس کا غیاث الدین رام پوری اور حکیم محمد حسین دکنی سے زیادہ ہے۔ تصحیح

سے غرض یہ ہے کہ کاپی سراسر موافق اُن اوراق کے ہو، نہ یہ کہ فرہنگوں میں دیکھا جائے۔ آگے اِس سے تم کو بھی اور بھائی کو بھی لکھ چکا ہوں، اب صرف اُس تحریر کا اشارہ لکھنا منظور تھا۔ آج جس طرح مجھ کو تمھارا اور مرزا صاحب کا خط پہنچا، لازم تھا کہ حکیم صاحب کو بھی لفافۂ اخبار پہنچ جاتا مگر اِس وقت تک نہیں پہنچا اور یہ دوپہر کا وقت ہے۔ خیر، پہنچ جائے گا۔ میں نے تمھارا خط اُن کے پاس بھیج دیا تھا، انھوں نے تمھاری رائے منظور کی۔ اب تم وہ اخبار جس طرح کہ تم نے لکھا ہے، اُن کے پاس بھیج دو۔ اور صاحبِ مطبع قیمتِ اخبار اور اجرت کاتب اُن کو لکھ بھیجے۔ اپنے نام اور مسکن سے اُن کو اطلاع دے، بس۔ اُس کو اپنے طور پر روپیہ بھیج دیں گے۔ ہم تم واسطۂ شناسائیِ ہم دگر ہو گئے۔ ہاں، اگر احیاناً روپیے کے بھیجنے میں دیر ہوگی، تو میں کہہ کر بھجوا دوں گا، یہ البتہ میرا ذمہ ہے۔

سہ شنبہ ۲۰ ستمبر ۱۸۵۸ء

(۵۵)

صاحب!

قصیدے کے چھاپے جانے کی بشارت صاحبِ مطبع نے بھی مجھ کو دی ہے، خدا اُن کو سلامت رکھے۔ کل مرزا صاحب کے خط میں اُن کو ایک مصرع کسی اُستاد کا لکھ چکا ہوں۔ میں سراسر اُن کا ممنونِ احسان ہوں۔ میرا سلام کہنا اور لفافۂ اخبار کے نہ پہنچنے کی اطلاع دینا۔ میرے نام کا کوئی لفافہ ضائع نہیں جاتا۔ خدا جانے اس پر کیا بجوگ پڑا۔؟ ظاہراً انھوں نے پوسٹ پیڈ بھیجا ہوگا؛ پھر پوسٹ پیڈ بھی کیوں تلف ہو؟

"شیہہ" بہ معنی "صدائے اسپ" لغت فارسی ہے؛ بہ شینِ مکسور و یائے

معروف و ہائے ہوز مفتوح و ہائے ثانی زدہ، اور عربی میں اُس کو "صہیل" کہتے ہیں۔ "صیہہ" کوئی لغت نہیں ہے، نہ عربی نہ فارسی۔ اگر غنیمتؔ کے کلام میں "صیہہ" لکھا ہے تو کاتب کی غلطی ہے" غنیمتؔ کا کیا گناہ:

" درخود زروے ہندسہ گاہے شمار یافت" اصل مصرع یوں ہے۔ میں نے سہو سے خدا جانے کیوں کر لکھ دیا ہے بھائی! مہر خواں" کے دو معنی ہیں: ایک تو "خطاب" کہ جو سلاطین امرا کو دیں، اور دوسرے وہ نام جو لڑکوں کا پیار سے رکھیں، یعنی "عرف" حاشیے پر شوق سے لکھوا دو۔ مگر تم نے دیکھا ہوگا کہ اس عبارت سے، جو تمھارے ذکر میں ہے، پہلے "مہرخواں" کے معنی حاشیے پر چڑھ گئے ہیں، مکرر لکھنے کی حاجت کیا ہے اور اگر لکھ بھی دو تو قباحت کیا ہے۔ بھائی صاحب کیوں مضائقہ فرمائیں؟ حال اوراق کی تحریر کا معلوم ہوا۔ صاحبانِ کونسل کی رائے ولایتِ آگرہ، یعنی میرے محکمے میں منظور و مقبول۔ نام میرا جس طرح چاہو لکھ دو:

بنامِ آں کہ او نامے ندارد
بہر نامیکہ خوانی سر برآرد

شفیق بالتحقیق مولانا مہرؔ، ذرۂ بے مقدار کا سلام قبول کریں۔ کل آپ کو خط لکھ چکا ہوں، آج یا کل پہنچ جائے گا۔ رات سے ایک بات اور خیال میں آئی ہے مگر چوں کہ تحکم و کار فرمائی ہے، کہتے ہوئے ڈرتا ہوں، ڈرتے ڈرتے عرض کرتا ہوں، بات یہ ہے کہ دو جلدیں طلائی لوح کی ولایت کے واسطے تیار ہوں گی اور وہ چار جلدیں جو یہاں کے حکام کے واسطے درکار ہوں گی، اُن کی صورت یہی ٹھہری ہے کہ سیاہ قلم کی لوح اور انگریزی جلد۔ کیوں بھائی صاحب! قرارداد اور تجویز یہی ہے؟ اور پھر سمجھا چاہیے کہ یہ چار جلدیں کس کس کی نذر ہیں:

نواب گورنر جنرل بہادر، چیف کمشنر بہادر، صاحب کمشنر بہادر دہلی، ڈپٹی کمشنر بہادر دہلی۔ یہ کیا میری بد وضعی ہے کہ جناب اڈمنسٹن صاحب کی نذر نہ بھیجوں۔ آخر گورمنٹ کی نذر انھیں کی معرفت بھیجوں گا۔ نہ صاحب، ایک جلد اُن کی نذر بہت ضروری ہے۔ آپ گنجایش نکال کر جیسی یہ چار جلدیں بنوائیں، ایک اور بھی ایسی ہی بنوالیں۔ یقین ہے کہ آپ اس رائے کو پسند فرمائیں گے اور چار کی جگہ پانچ بنوائیں گے۔ یہ عرض مقبول اور یہ گستاخی، کہ بار بار آزار دیتا ہوں، معاف ہو۔

بھائی مرزا تفتہ! کل کے مرزا صاحب کے خط میں سے اُس مادۂ تاریخ کا قطعہ لکھ لینا۔ تم کو لکھ چکا ہوں، ایک قطعہ مرزا صاحب کا، ایک قطعہ تمھارا، بابہ ایک قطعہ مولانا حقیر سے بھی لکھواؤ۔

صبح پنجشنبہ سی اُم ستمبر ۱۸۵۸ء

(۵۶)

کیوں صاحب!

اس کا کیا سبب ہے کہ بہت دن سے ہماری آپ کی ملاقات نہیں ہوئی؟ نہ مرزا صاحب ہی آئے، نہ منشی صاحب ہی تشریف لائے۔ ہاں، ایک بار منشی شیونرائن صاحب نے کرم کیا تھا اور خط میں یہ رقم کیا تھا کہ اب ایک فرما باقی رہا ہے۔ اس راہ سے میں یہ تصور کر رہا ہوں کہ اگر ایک فرما نثر کا باقی تھا تو اب قصیدہ چھاپا جاتا ہوگا اور اگر فرما قصیدے کا تھا تو اب جلدیں بننی شروع ہوگئی ہوں گی۔

تم سمجھے؟ میں تمھارے اور بھائی منشی نبی بخش صاحب اور جناب مرزا

حاتم علی صاحب کے خطوط کے آنے کو، تمھارا اور اُن کا آنا سمجھتا ہوں۔ تحریر گویا وہ مکالمہ ہے جو باہم ہوا کرتا ہے؛ پھر تم کہو مکالمہ کیوں موقوف ہے اور اب کیا دیر ہے؛ اور وہاں کیا ہو رہا ہے؟ بھائی صاحب کو کاپی کی تصحیح سے فراغت ہو گئی؟ مرزا صاحب نے جلدیں صحاف کو دے دیں؟ میں اب اُن کتابوں کا آنا کب تک تصور کروں؟ دسہرے میں ایک دو دن کی تعطیل مقرر ہوئی ہوگی، کہیں دوالی کی تعطیل تک نوبت نہ پہنچ جائے۔

ہاں صاحب، تم نے کبھی کچھ حال قمرالدین خاں صاحب کا نہ لکھا۔ آگے اس سے تم نے اگست، ستمبر میں اُن کا آگرے کا آنا لکھا، پھر وہ اکتوبر تک کیوں نہ آئے؟ وہاں تو منشی غلام غوث خاں صاحب اپنا کام بہ دستور کرتے ہیں، پھر یہ اُس دفتر میں کیا کر رہے ہیں؟ کہیں کسی اور کام پر معین ہو گئے ہیں؟ اِس کا حال جلد لکھو۔ مجھ کو یاد پڑتا ہے کہ تم نے لکھا تھا کہ منشی غلام غوث خاں صاحب کو ایک گاؤں جاگیر میں ملا ہے، مولوی قمرالدین خاں صاحب اُس کے بندوبست کو آیا چاہتے ہیں؛ اُس کا ظہور کیوں نہ ہوا؟ ان سب باتوں کا جواب جلد لکھیے۔

جناب مرزا صاحب کو میرا سلام کہیے اور یہ پیام کہیے کہ کتاب کا حُسن کانوں سے سُنا، دل کو دیکھنے سے زیادہ یقین آیا؛ مگر آنکھوں کو رشک ہے کانوں پر اور کان چشمک زنی کر رہے ہیں آنکھوں پر۔ یہ ارشاد ہو کہ آنکھوں کا حق آنکھوں کو کب تک ملے گا۔؟

بھائی صاحب کو بعد از سلام کہیے گا کہ حضرت اپنے مطلب کی تو مجھ کو جلدی نہیں ہے، آپ کی تخفیفِ تصدیع چاہتا ہوں؛ یعنی اگر کاپی کا قصہ تمام ہو جائے تو آپ کو آرام ہو جائے۔

جناب منشی شیونرائن صاحب کی عنایتوں کا شکر میری زبانی ادا کیجیے گا

اور یہ کہیے گا کہ آپ کا خط پہنچا چوں کہ میرے خط کا جواب تھا اور مہذا کوئی امر جواب طلب نہ تھا؛ اِس واسطے اُس کا جواب نہیں لکھا۔ زیادہ زیادہ۔

نگاشتہ و رواں داشتہ صبح شنبہ ۱۶ اکتوبر ۱۸۵۸ء راقم غالب

(۵۷)

اللہ اللہ! ہم تو کول سے تمھارے خط کے آنے کے منتظر تھے۔ ناگاہ کل جو خط آیا، معلوم ہوا کہ دو دن کول میں رہ کر سکندر آباد آ گئے ہو اور وہاں سے تم نے خط لکھا ہے۔ دیکھیے، اب یہاں کب تک رہو اور آگرے کب جاؤ۔ پرسوں برخوردار شیو نرائن کا خط آیا تھا۔ لکھتے تھے کہ کتابوں کی شیرازہ بندی ہو رہی ہے، اب قریب ہے کہ بھیجی جائیں۔ مرزا مہر بھی ایک ہفتہ بتاتے ہیں۔ دیکھیے کس دن کتابیں آ جائیں، خدا کرے سب کام دلخواہ بنا ہو۔

ہاں صاحب، منشی بالمکند بے صبر کے ایک خط کا جواب ہم پر قرض ہے۔ میں کیا کروں؟ اُس خط میں انھوں نے اپنا سیر و سفر میں مصروف ہونا لکھا تھا؛ پس میں اُن کے خط کا جواب کہاں بھیجتا؟ اگر تم سے ملیں، تو میرا سلام کہہ دینا، اور مطبع آگرہ سے کتابوں کا حال تو تم خود دریافت کر ہی لوگے، میرے کہنے اور لکھنے کی کیا حاجت۔

چار شنبہ سوم نومبر ۱۸۵۸ء

(۵۸)

کیوں صاحب!

کیا یہ آئین جاری ہوا ہے کہ سکندر آباد کے رہنے والے دلّی کے خاک نشینوں کو خط نہ لکھیں؟ بھلا اگر یہ حکم ہوا ہوتا، تو یہاں بھی تو اشتہار ہو جاتا کہ زنہار کوئی خط سکندر آباد کو یہاں کی ڈاک میں نہ جاوے۔ بہ ہر حال: کس بشنود یا نشنود من گفتگوے می کنم۔

کل جمعے کے دن بارہ تاریخ نومبر کو، تینتیس جلدیں بھیجی ہوئی برخوردار شیونرائن کی پہنچیں۔ کاغذ، خط، تقطیع، سیاہی، چھاپا، سب خوب، دل خوش ہوا اور شیونرائن کو دعا دی۔ سات کتابیں جو مرزا حاتم علی صاحب کی تحویل میں ہیں، وہ بھی یقین ہے کہ آج کل پہنچ جائیں۔ معلوم نہیں، منشی شیونرائن نے اندور کو واسطے رائے امید سنگھ کے، کس طرح بھیجی ہیں یا ابھی نہیں بھیجیں۔

صاحب! تم اِس خط کا جواب جلد لکھو اور اپنے قصد کا حال لکھو، سکندرآباد کب تک رہو گے، آگرے کب جاؤ گے؟

شنبہ ۱۳ نومبر ۱۸۵۸ء

جواب طلب۔

(۵۹)

آج پنجشنبے کے دن اٹھارہ نومبر کو تمھارا خط آیا اور میں آج ہی جواب لکھتا ہوں۔ کیا تماشا ہے کہ تمھارا خط پہنچتا ہے اور میرا خط نہیں پہنچتا۔ میرے خط کے نہ پہنچنے کی دلیل یہ کہ تم نے اصلاحی غزل کی رسید نہیں لکھی۔ میں نے کتب کا پہنچنا تم کو لکھا تھا، اُس کا تم نے ذکر نہ لکھا۔ صاحب! تینتیس کتابیں پہنچ گئیں اور تقسیم ہو گئیں۔ سات کتابیں مرزا مہر کی بھیجی ہوئی موافق اُن کی تحریر کے آج شام تک اور مطابق منشی شیونرائن کی اطلاع کے کل تک میرے پاس پہنچ جائیں گی۔ اور یہی منشی شیونرائن نے اندور کی کتابوں کی روانگی کی اطلاع دی ہے۔

منشی نبی بخش صاحب تمھارے خط نہ لکھنے کا بہت گلہ رکھتے ہیں، شاید میں تم کو لکھ بھی چکا ہوں۔ میر قاسم علی صاحب کی بدلی کا حال معلوم ہوا۔

یہ میرے بڑے دوست ہیں۔ دلّی ان دنوں میں آئے تھے، مجھ سے مل گئے ہیں؛ اُن کو ایک کتاب ضرور بھیج دینا۔

بھائی! میں ہرگز نہیں جانتا کہ میر بادشاہ دہلوی کون ہیں اور پھر ایسے کہ جو کہیں کے منصف ہوں۔ کچھ اُن کے خاندان کا حال اور اُن کے والد کا نام لکھو تو میں غور کروں، ورنہ میں تو اِس نام کے آدمی سے آشنا نہیں ہوں۔

پنجشنبہ ۱۸ نومبر ۱۸۵۸ء وقت دوپہر

(۶۰)

برخوردار!

تمھارا خط پہنچا، اصلاحی غزلوں کی رسید معلوم ہوئی۔ مقطع اب اچھا ہو گیا، رہنے دو۔ کل جمعے کے دن انیس نومبر کو سات کتابوں کا پارسل بھیجا ہوا مولانا مہر کا پہنچا۔ زبان نہیں جو تعریف کروں۔ شاہانہ آرایش ہے، آفتاب کی سی نمایش ہے۔ مجھے یہ فکر کہ کہیں اُن کا روپیہ تیاری میں صرف نہ ہوا ہو۔ اچھا میرے بھائی! اِس کا حال جو تم کو معلوم ہو، مجھ کو لکھ بھیجو۔

رقعات کے چھاپے جانے میں ہماری خوشی نہیں ہے، لڑکوں کی سی ضد نہ کرو اور اگر تمھاری اسی میں خوشی ہے تو صاحب! مجھ سے نہ پوچھو، تم کو اختیار ہے، یہ امر میرے خلافِ رائے ہے۔

میر بادشاہ کی اور اپنی ناشناسائی آگے تم کو لکھ چکا ہوں۔ اب تمھارے اس خط سے معلوم ہوا کہ وہ تمھارے اور امراؤ سنگھ کے آشنا ہیں۔ کچھ اُن کے خاندان کا نام و نشان دریافت ہو، تو مجھ کو بھی لکھ بھیجو، تاکہ میں جانوں کہ یہ کس گروہ میں سے ہیں۔

میاں، وہ "راست دروغ بہ گردنِ راوی" نے مجھ کو بہت پریشان کیا ہے۔ واسطے خدا کے، جو راوی نے روایت کی ہے وہ مجھ کو ضرور لکھو اور تاج گنج کے رہنے والوں کی ابتری کی حقیقت سے بھی اطلاع دو۔ حکمِ عفوِ توقیر عام ہو گیا ہے۔ لڑنے والے آتے جاتے ہیں اور آلاتِ حرب و پیکار دے کر توقیعِ آزادی پاتے ہیں۔ یہ دو شخص کیسے مجرم تھے جو مقید ہوئے!

محررۂ صبح شنبہ ۲۰ نومبر ۱۸۵۸ء

(۶۱)

مرزا تفتہ!

تمھارا خط آیا۔ فقیر کو حقیر کا حال معلوم ہوا، خدا فضل کرے۔ اگر تم اس راز کے اظہار کو منع نہ کرتے تو بھی میرا شیوہ ایسا لغو نہیں ہے کہ میں اُن کو لکھتا۔

لکھتے ہو کہ مرزا مہر کے دو چار روپیے زائد صرف ہو گئے تو کیا اندیشہ ہے۔ حال یہ ہے کہ میں نے اُن سے استفسار کیا تھا۔ اُنھوں نے مجھ کو لکھا کہ کتابوں کی درستی میں وہی بارہ روپیے صرف ہوئے ہیں۔ محصول کی ایک رقم خفیف اگر میں نے اپنے پاس سے دی تو اس کا کیا مضائقہ، مجھ کو تمھارا قول مطابق واقع نظر آتا ہے، البتہ اُن کے دو تین روپیے اُٹھ گئے ہوں گے۔

لالہ گنگا پرشاد شاد تخلص اپنے کو تمھارا شاگرد بتاتے ہیں مگر ریختہ کہتے ہیں۔ کئی دن ہوئے کہ یہاں آئے اور بالمکند بے صبر کی غزلیں اصلاح کو لائے، وہ دیکھ کر اُن کو حوالے کر دیں۔

ہنری اسٹوارٹ ریڈ صاحب، ممالک مغربی کے مدرسوں کے ناظم اور گورمنٹ کے بڑے مصاحب ہیں، امن کے دنوں میں ایک ملاقات میری اُن

کی ہوئی تھی۔ میں نے اب ایک کتاب، سادہ بے جلد، اُن کو بھیجی تھی۔ کل اُن کا خط مجھ کو اُس کتاب کی رسید میں آیا، بہت تعریف لکھتے تھے اور ہاں بھئی ایک تماشا اور ہے، وہ مجھ کو لکھتے تھے کہ یہ "دستنبو" پہلے اس سے کہ تم بھیجو، "مطبع مفید خلائق" نے ہمارے پاس بھیجی ہے اور ہم اُس کو دیکھ رہے ہے اور خوش ہو رہے تھے کہ تمھارا خط مع کتاب کے پہنچا۔ اُن کے اِس لکھنے سے یہ معلوم ہوا کہ مطبع میں سے گورنر کی نذر بھی ضرور گئی ہوگی۔ کیا اچھی بات ہے کہ وہاں بھی میرے بھیجنے سے پہلے میرا کلام پہنچ جائے گا۔ میں چیف کمشنر پنجاب کو یہ کتاب بھیج چکا ہوں اور نواب گورنر کی نذر اور ملکہ کی نذر اور سکرتروں کی نذر یہ پارسل اِنشاءَاللہ تعَالیٰ آج روانہ ہو جائیں گے۔ دیکھوں، چیف کمشنر کیا لکھتے ہیں اور گورنر کیا فرماتے ہیں:

تا نہالِ دوستی کے بر دہد
حالیا رفتیم و تخمے کاشتیم

شنبہ ۲۷ نومبر ۱۸۵۸ء

(۶۲)

صاحب!

تمھارا خط آیا، میں نے اپنے سب مطالب کا جواب پایا۔ امراؤ سنگھ کے حال پر اُس کے واسطے مجھ کو رحم اور اپنے واسطے رشک آتا ہے۔ اللہ اللہ! ایک وہ ہیں کہ دو بار اُن کی بیڑیاں کٹ چکی ہیں اور ایک ہم ہیں کہ ایک اوپر پچاس برس سے جو پھانسی کا پھندا گلے میں پڑا ہے تو نہ پھندا ہی ٹوٹتا ہے نہ دم ہی نکلتا ہے۔ اُس کو سمجھاؤ کہ تیرے بچوں کو میں

پال لوں گا، تو کیوں بلا میں پھنستا ہے؟

وہ جو مصرع تم نے لکھا ہے، وہ حکیم سنائی کا ہے، اور وہ نقل حدیقہ میں مرقوم ہے:

پسرے با پدر بزاری گفت
کہ مرا یار شو بہ ہمرہِ جفت
گفت: بابا! زنا کن و زن نے
پند از خلق گیر و از من نے
در زنا، گر بگیرد ت عسسے
بہلد، کو گرفت چوں تو بسے
زن کنی، ہرگزت رہا نکند
ور تو بگزاریش، چہا نکند

بس تو اب تم سکندر آباد میں رہے، کہیں اور کیوں جاؤ گے؟ بنک گھر کا روپیہ اٹھا چکے ہو، اب کہاں سے کھاؤ گے؟ میاں! نہ میرے سمجھانے کو دخل ہے، نہ تمھارے سمجھنے کی جگہ ہے۔ ایک چرخ ہے کہ وہ چلا جاتا ہے، جو ہونا ہے، وہ ہوا جاتا ہے۔ اختیار ہو تو کچھ کیا جائے، کہنے کی بات ہو تو کچھ کہا جائے۔ مرزا عبدالقادر بیدل خوب کہتا ہے:

رغبتِ جاہ چہ و نفرتِ اسباب کدام
زیں ہوسہا بگزر یا مگزر، می گزرد

مجھ کو دیکھو کہ نہ آزاد ہوں نہ مقید، نہ رنجور ہوں نہ تندرست، نہ خوش ہوں نہ ناخوش، نہ مردہ ہوں نہ زندہ، جیے جاتا ہوں، باتیں کیے جاتا ہوں، روٹی روز کھاتا ہوں، شراب گاہ گاہ پیے جاتا ہوں۔ جب

موت آئے گی، مر رہوں گا۔ نہ شکر ہے نہ شکایت ہے، جو تقریر ہے بہ سبیلِ حکایت ہے۔ بارے جہاں رہو، جس طرح رہو، ہر ہفتے میں ایک بار خط لکھا کرو۔

یکشنبہ ۱۹ دسمبر ۱۸۵۸ء

(۶۳)

کیوں صاحب!

روٹھے ہی رہو گے یا کبھی منو گے بھی؟ اور اگر کسی طرح نہیں منتے تو روٹھنے کی وجہ تو لکھو۔ میں اس تنہائی میں صرف خطوں کے بھروسے جیتا ہوں یعنی جس کا خط آیا، میں نے جانا کہ وہ شخص تشریف لایا۔ خدا کا احسان ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں ہوتا، جو اطراف و جوانب سے دو چار خط نہیں آ رہتے ہوں بلکہ ایسا بھی دن ہوتا ہے کہ دو دو بار ڈاک کا ہرکارہ خط لاتا ہے۔ ایک دو صبح کو اور ایک دو شام کو۔ میری دل لگی ہو جاتی ہے۔ دن اُن کے پڑھنے اور جواب لکھنے میں گزر جاتا ہے۔ یہ کیا سبب دس دس بارہ بارہ دن سے تمھارا خط نہیں آیا۔ یعنی تم نہیں آئے۔ خط لکھو، صاحب۔ نہ لکھنے کی وجہ لکھو، آدھ آنے میں بخل نہ کرو۔ ایسا ہی ہے تو بیرنگ بھیجو۔

سوموار ۲۷ دسمبر ۱۸۵۸ء غالب

(۶۴)

دیکھو صاحب!

یہ باتیں ہم کو پسند نہیں۔ ۱۸۵۸ء کے خط کا جواب ۱۸۵۹ء میں بھیجتے

ہو، اور مزہ یہ ہے کہ جب تم سے کہا جائے گا، تو یہ کہو گے کہ میں نے دوسرے ہی دن جواب لکھا ہے۔ لطف اِس میں ہے کہ میں بھی سچا اور تم بھی سچے۔

آج تک راے امید سنگھ یہیں ہیں اور ابھی نہیں جائیں گے۔ تمھارا مدعا حاصل ہو گیا ہے۔ جس دن وہ آئے تھے، اُسی دن مجھ سے کہ گئے تھے۔ میں بھول گیا اور اُس خط میں تم کو نہ لکھا۔ صاحب! وہ فرماتے تھے کہ میں نے کئی مجلد مرزا تفتہ کے دیوان کے اور کئی نسخے "تضمین اشعارِ گلستاں" کے اُن کی خواہش کے بموجب، کوئی پارسی ہے بمبئی میں، اُس کے پاس بھیج دیے ہیں۔ یقین ہے کہ وہ ایران کو ارسال کرے گا۔ امید سنگھ نے اُس پارسی کا نام بھی لیا تھا، میں بھول گیا۔ اب جو تم کو اُس خیال میں مبتلا پایا تو اُن کا بیان مجھ کو یاد آیا۔ جانتا ہوں کہ وہ کہاں رہتے ہیں۔ دو بار اُن کے گھر گیا بھی ہوں مگر محلے کا نام نہیں جانتا ۔ نہ میرے آدمیوں میں کوئی جانتا ہے۔ اب کسی جاننے والے سے پوچھ کر تم کو لکھ بھیجوں گا۔

میر بادشاہ صاحب سے عند الملاقات میری دعا کہ دینا۔

لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہ! لکھنے کے قابل بات پھر بھول گیا۔ کل میر کرامت علی صفاؔ تخلص، کہ میں نے آگے اُن کو کبھی نہیں دیکھا تھا، ناگاہ مجھ سے آ کر ملے اور تمھارا حال پوچھتے رہے۔ میں نے کہ دیا کہ بہ خیر و عافیت سکندر آباد میں ہیں جب میں نے اُن سے کہا کہ کیا وہ تمھارے آشنا ہیں؟ اُنھوں نے کہا: صاحب! وہ میرے بزرگ اور اُستاد ہیں، میں اُن کا شاگرد ہوں۔ کہیں مدرسے کے علاقے میں نوکر ہیں۔ بہ سبیل ڈاک آئے تھے اور آج بہ سبیلِ ڈاک انبالے کو گئے۔ انبالہ اُن کا وطن ہے اور نوکر بھی وہ اسی ضلع میں ہیں۔

نگاشتۂ دوشنبہ ۳ جنوری ۱۸۵۹ء

✓

۶۵

صاحب!

تمھارا خط مع رقعۂ مردِ سخن فہم پہنچا۔ تمھاری خوشامد نہیں کرتا، سچ کہتا ہوں کہ تمھارے کلام کی تحسین کرنے والا فی الحقیقت اپنے فہم کی تعریف کرتا ہے۔ جواب میں درنگ اس راہ سے ہوئی کہ میں مصطفیٰ خاں کی ملاقات کو بہ سبیلِ ڈاک میرٹھ گیا تھا۔ تین دن وہاں رہا، کل وہاں سے آیا، آج تم کو یہ خط بھجوایا۔

محرّرہ و مرسلۂ چہار شنبہ ۲۶ جنوری ۱۸۵۹ء غالب

(۶۶)

صاحب!

میرٹھ سے آکر تم کو خط لکھ چکا ہوں، شاید نہ پہنچا ہو؛ اس واسطے ازروے احتیاط لکھتا ہوں کہ نواب مصطفیٰ خاں کے ملنے کو بہ سبیلِ ڈاک میرٹھ گیا اور سہ شنبے کے دن دلّی آگیا اور چارشنبے کے دن تم کو خط بھیجا۔

کل آخرِ روز راجا امید سنگھ بہادر میرے گھر آئے تھے۔ تمھارا خط اُن کے دکھانے کو رکھ چھوڑا تھا۔ وہ اُن کو دکھایا۔ پڑھ کر یہ فرمایا کہ کسی اور مندر میں قصدِ اقامت نہیں ہے، نیا ایک تکیہ بنایا چاہتا ہوں۔ آدمی بندرابن گئے ہیں، کوئی مکان مول لیں گے، وہاں اپنی وضع پر رہوں گا۔ میرا سلام لکھنا اور یہ پیام لکھنا کہ آپ کا کلام بمبئی تک پہنچ گیا۔ اب طہران کو بھی روانہ ہو جائے گا:

سوادِ ہند گرفتی بہ نظمِ خود، تفتہ
بیا کہ نوبتِ شیراز و وقتِ تبریز است

صبح یک شنبہ سی ام جنوری ۱۸۵۹ء

صاحب!

تم تو اچھے خاصے عارف ہو اور تمھارا کشف سچا ہے۔ میں راہ دیکھ رہا تھا کہ تمھارا خط آئے تو جواب لکھوں۔ کل تمھارا خط شام کو آیا، آج صبح کو جواب لکھا گیا۔ بات یہ ہے کہ نامور آدمی کے واسطے محلے کا پتا ضرور نہیں۔ میں غریب آدمی ہوں مگر فارسی، انگریزی جو خط میرے نام کے آتے ہیں، تلف نہیں ہوتے۔ بعض فارسی خط پر پتا محلے کا نہیں ہوتا اور انگریزی خط پر تو مطلق پتا ہوتا ہی نہیں؛ شہر کا نام ہوتا ہے۔ تین چار خط انگریزی، ولایت سے مجھ کو آئے۔ جلنے اُن کی بلا کہ "بلّی ماروں کا محلہ" کیا چیز ہے۔ وہ تو بہ نسبت میرے بہت بڑے آدمی ہیں، سینکڑوں خط انگریزی ہر روز اُن کو آتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ میں نے پھر اُن کے پاس آدمی بھیجا اور آپ کا خط اپنے نام کا بھیج دیا۔ انھوں نے میرے آدمی سے کہا کہ نواب صاحب کو میرا سلام کہنا اور کہنا کہ میں اِس کا کیا جواب لکھوں؟ محلے کا پتا آپ ہی لکھ بھیجیے سو میں پہلے امرِ واقعی تم کو لکھ کر تمھاری خواہش کے موافق لکھتا ہوں۔ اُن کے مکان کا پتا: "بلّی ماروں کا محلہ، دسوں کا کوچہ"۔

"دستنبو" کا حال یہ ہے کہ میں نے ایک بار سات روپیے کی ہنڈوی بھیج کر بارہ جلدیں اور ایک جنتری اُن سے منگوائی، پھر اُن کو اٹھارہ آنے کے ٹکٹ بھیج کر دو جلدیں لکھنؤ کو، انھیں کے ہاتھوں، وہیں سے بھجوائیں اور اُس کے بعد پھر اٹھارہ آنے کے ٹکٹ بھجوا کر دو جلدیں وہیں سے سردھنے کو بھجوائیں۔ غرض اِس تحریر سے یہ ہے کہ میں بعد اُس پچاس جلد کے، سولہ جلدیں اور اُن سے لے چکا ہوں مگر نقد، ہرگز قرض میں نے نہیں منگوائی ہیں۔ ایک بار ہنڈوی اور دو بار ٹکٹ بھیج چکا ہوں۔ تم کو میری جان کی قسم، سہل طور پر اُن کو لکھ بھیجنا کہ غالب نے کتنی کتابیں منگوائی ہیں؟ اور نقد منگوائی ہیں یا قرض، اور جو وہ لکھیں، مجھ کو لکھ بھیجنا۔

شنبہ ۱۹ فروری ۱۸۵۹ء

غالب

(٦٨)

صاحب!

تمھارا خط آیا، دل خوش ہوا۔ تمھاری تحریر سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تم کو آگرے سے کتابوں کا منگوانا بے ارسالِ قیمت مظنون ہے؛ چنانچہ حق التصنیف تم نے لکھا ہے۔ بھائی! کیا میں تم کو جھوٹ لکھوں گا۔؟ اور شیو نرائن نے اگر ذکر ارسالِ قیمت کا نہیں لکھا، تو یہ بھی تو نہیں لکھا کہ بے ارسالِ قیمت منگوائی ہیں۔ تم کو میرے سر کی قسم اور میری جان کی قسم! شیو نرائن سے اتنا پوچھو کہ اُس پچاس جلد کے بعد، کے جلدیں غالب نے اور منگوائیں؟ اور قیمت بھیج کر منگوائیں یا قیمت اُس سے لینی ہے؟ دیکھو، میں نے قسم لکھی ہے، یوں ہی عمل میں لانا۔

رائے امید سنگھ صاحب یہیں ہیں۔ مجھ سے اِن دنوں میں ملاقات نہیں ہوئی، جو تمھارے خط کا ذکر آتا۔ یقین ہے کہ پہنچ گیا ہوگا اور یہ جو تم نے مجھ کو لکھا تھا کہ اگر "دسوں کا کوچہ" نہ ملے گا تو وہ خط تیرے پاس آئے گا۔ سو وہ میرے پاس نہیں آیا۔ صاحب! تم کو وہم کیوں ہے؟ ایک امیر نامور آدمی ہے، اُس کے نام کا خط کیوں نہ پہنچے گا؟

اجی مرزا تفتہ! بھائی منشی نبی بخش صاحب کو تمھارے حال کی بڑی پرسش ہے۔ تم نے اُن کو خط لکھنا کیوں موقوف کیا ہے؟ وہ مجھ کو لکھتے تھے کہ اگر آپ کو مرزا تفتہ کا حال معلوم ہو تو مجھ کو ضرور لکھیے گا۔

یک شنبہ ٢٧ فروری ١٨٥٩ء غالب

(٦٩)

کیوں مرزا تفتہ!

تم بے وفا، یا میں گنہگار؟ یہ بھی تو مجھ کو معلوم نہیں کہ تم کہاں ہو

ابھی ایک صاحب میری ملاقات کو آئے تھے، تقریبًا تمھارا ذکر درمیان آیا۔ وہ کہنے لگے کہ وہ کول میں ہیں۔ اب میں حیران ہوں کہ خط کول بھیجوں یا سکندرآباد؟ اگر کول بھیجوں تو مسکن کا پتا کیا لکھوں؟ بہ ہر حال، سکندرآباد بھیجتا ہوں، خدا کرے پہنچ جائے، تمھارا دیوان بہ طریقِ پارسل میرے پاس آیا۔ میں نے ہرکارے کو راجا اُمید سنگھ بہادر کے گھر کا پتا بتا کر وہاں بھجوا دیا۔ یقین ہے کہ پہنچ گیا ہوگا۔ پانچ چار دن سے سُنتا ہوں کہ وہ متھرا اور اکبرآباد کی طرف گئے ہیں۔ مجھ سے مل کر نہیں گئے۔ بہ ہر حال، اِس خط کا جواب جلد لکھو اور ضرور لکھو۔

بھائی! تم سیاح آدمی ہو؛ جہاں جایا کرو، مجھ کو لکھ بھیجا کرو کہ میں وہاں جاتا ہوں یا جہاں جاؤ، وہاں سے خط لکھو۔ تمھارے خط کے نہ آنے سے مجھے تشویش رہتی ہے۔ میری تشویش تم کو کیوں پسند ہے؟

محررۂ یک شنبہ ۲۷ مارچ ۱۸۵۹ء غالب

(۷۰)

صاحب!

آج تمھارا خط صبح کو آیا، میں دوپہر کو جواب لکھتا ہوں۔ تمھاری ناسازگاریِ طبیعت سُن کر دل کڑھا۔ حق تعالیٰ تم کو زندہ اور تندرست اور خوش رکھے۔

اوراقِ مثنوی بھیجے ہوئے بہت دن ہوئے، جس میں حکایت طالبِ علم اور سُنار کی تھی۔ واقعہ بلند شہر کا اور وہ اوراق میں نے پمفلٹ پاکٹ نہیں بھیجے، خط میں لپیٹ کر، چوں کہ خط ڈبل تھا، دو ٹکٹ لگا کر ارسال کیے ہیں۔ رسید ملے تو اُس کو دیکھ کر تاریخ معلوم ہو جائے۔ قیاس سے ایسا جانتا ہوں کہ پان

سات دن ہوئے ہوں گے۔

منشی نبی بخش کا خط بہت دن سے نہیں آیا۔ گھر اُن کا تاج گنج، وہ خود مع بعض متعلقین آگرے۔ ایک بار تاج گنج کے پتے سے خط اُن کو بھیجا تھا، جواب نہ آیا۔ اب ناچار برخوردار شیونرائن سے اُن کا حال پوچھوں گا۔ تم باہمہ کمالات خفقانی بھی ہو۔ راے امید سنگھ سے خط کی امید کیوں رکھتے ہو؟ جب آگرے جاؤ گے اور وہ وہاں ہوں گے تو ملاقات ہوجائے گی۔ میں خود واقف نہیں کہ وہ کہاں ہیں۔ از روے قیاس کہہ سکتا ہوں کہ آگرے یا بندرابن۔ کبھی کہیں سے اُن کا کوئی خط مجھ کو آیا ہو تو میں گناہگار۔

یک شنبہ سوم ذی القعدہ پنجم جون سالِ حال ۱۸۵۹ء غالب

(۱۷)

صاحب!

ہم تمھارے اخبار نویس ہیں اور تم کو خبر دیتے ہیں کہ برخوردار میر بادشاہ آئے، میں اُن کو دیکھ کر خوش ہوا، وہ اپنے بھائیوں سے مل کر شاد ہوئے، تمھارا حال سُن کر مجھ کو رنج ہوا۔ کیا کروں، نہ اپنے رنج کا چارہ کر سکتا ہوں، نہ اپنے عزیزوں کی خبر لے سکتا ہوں۔ خیر:

ہر آنچہ ساقیِ ما ریخت، عین الطاف است

آج چوتھا دن ہے یعنی منگل کے دن، کوئی پہر بھر دن چڑھا ہوگا کہ راجا امید سنگھ بہادر ناگاہ میرے گھر تشریف لائے۔ پوچھا گیا کہ کہاں سے آئے ہو؟ فرمایا کہ آگرے سے آتا ہوں۔ لباون کی گلی میں، جو حکیموں کی گلی کے قریب ہے، جورس صاحب کی کوٹھی انھوں نے مول لی ہے اور اُس کے قریب کی زمینِ افتادہ بھی

خریدی ہے اور اُس کو بنوا رہے ہیں۔ تمھارا میں نے ذکر کیا کہ ہر خط میں تم کو پوچھتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ میں نے کئی خط بھیجے، جواب نہیں آیا۔ بولے کہ ایک خط اُن کا آیا تھا، اُس کا جواب لکھ چکا ہوں؛ پھر اُن کا کوئی خط نہیں آیا۔

بہ ہر حال، میرے پھوڑے نکل رہے ہیں۔ میں بازدید کو نہیں گیا۔ شاید وہ آج گئے ہوں یا جاویں، پھر اکبرآباد کو جائیں گے۔ میں آج آدمی اُن کے پاس بھیجوں گا۔

کل مرزا حاتم علی مہرؔ کا خط آیا تھا۔ تم کو بہت پوچھتے تھے کہ آیا مرزا تفتہ کہاں ہیں اور کس طرح ہیں؟ بھائی! اُن کو خط لکھ بھیجو۔

محررۂ ۱۷ جون ۱۸۵۹ء

(۷۲)

صاحب!

ایک خط تمھارا پرسوں آیا، اُس میں مندرج کہ میں میرٹھ جاؤں گا۔ آج صبح کو ایک خط تمھارا اور آیا، اُس میں مندرج کہ پہلی جولائی کو جاؤں گا۔ اور تجھ سے ملتا جاؤں گا۔ پرسوں کے خط میں بھی اور آج کے خط میں بھی پارسل کا ذکر تھا کہ بیس جون کو ہم نے بھیجا ہے۔ بیسویں جون کو آج دسواں دن ہے۔ اِس دس دن میں کوئی پارسل کوئی پمفلٹ پاکٹ میرے پاس نہیں پہنچا۔ آخری پمفلٹ پاکٹ دو مثنویوں کا وہ تھا کہ جس میں ایک مثنوی بلند شہر کے واقعے کی تھی، کہ ایک لڑکا مر گیا، اُس کی ارتھی پھنکتی رہی، اُس کا عاشق سامنے کھڑا جلتا رہا۔ سو اُن دونوں مثنویوں کو میں نے اصلاح دے کر

تمھارے پاس بھیج دیا ہے بلکہ یوں یاد پڑتا ہے کہ تم نے اُس کی رسید بھی لکھ بھیجی ہے۔ لیکن مجھ کو گمان یہ ہے کہ یہ امر بیس جون سے آگے کا ہے۔ بہ ہر تقدیر، بعد اِس پارسل کے کوئی اور پارسل میرے پاس نہیں آیا۔ اصلاحی کواغذ ہر طرف کے عموماً اور تمھارے خصوصاً دو دن سے زیادہ میں نہیں رکھتا۔ جو کاغذ مجھ تک نہ پہنچے، میں ناچار ہوں بلکہ خود میرے ایک خط کا جواب تم پر قرض ہے۔ یا تو وہ نہ پہنچا یا تم نے اُس کا جواب لکھنا ضرور نہ جانا۔ وہ خط جس میں میر بادشاہ کا دلی آنا اور اُن کا مجھ سے ملنا اور تمھارا ذکر مجھ میں اور اُن میں ہونا۔ معہذا، راجا امید سنگھ کا دلی میں آنا اور بے خبر میرے گھر آجانا اور تمھارا اُن سے ذکر ہونا اور اُن کا یہ کہنا کہ اُن کا کُل ایک خط میرے پاس آیا تھا، سو میں نے اُس کا جواب لکھ بھیجا تھا۔ اب میں کیا جانوں کہ تم کو یہ خط پہنچا یا نہیں پہنچا۔ تمھارا وہ پارسل جس کو تم اب مانگتے ہو، میرے پاس ہرگز نہیں آیا۔

چارشنبہ ۲۹ جون ۱۸۵۹ء وقتِ نیم روز غالب

(۷۳)

بھائی!

تمھارے ذہن نے خوب انتقال کیا۔ میں نے جس وقت یہ شعر پڑھا:

بہ ہند آمدندے زایراں دیار

"آمدند" کی جگہ "آمدندے" بہ صیغۂ استمرار ٹکسال باہر معلوم ہوا:

رسیدند در ہند ز ایراں دیار

اُس کی جگہ لکھ دیا۔ واقعی پوستین کا بیچنا راہ میں واقع ہوا، پھر

"رسید ند در ہند" بے جا۔ تمھارا تصرف مستحسن۔ جس طرح تم نے لکھا ہے اُسی طرح رہنے دو۔

صاحب! "سنبلستان" سے کیوں گھبراتے ہو؟ میں تمھارے گھبرانے سے گھبراتا ہوں۔ رخ کو "گل" زلف کو "سنبل" فرض کرتے ہیں! "سنبلستان" میں کیا عیب ہے؟ اور اگر نہیں پسند تو یہ قصہ ہی جانے دو۔ اِس وقت تک کہ اکتوبر کی آٹھویں، ہفتے کا دن، تیسرے پہر کا وقت ہے، میر قاسم علی صاحب تشریف نہیں لائے۔ ہاترس کے منصف اور دلّی کے نامنصف ہیں۔

روز شنبہ ہشتم اکتوبر ۱۸۵۹ء آخر روز
از غالب

(۴۷)

صاحب!

تمھارا خط آیا، حال معلوم ہوا:

جہانیان زتو برگشتہ اند اگر غالبؔ
تراچہ باک، خدائیکہ داشتی، داری

خدا کے واسطے، میرے باب میں لوگوں نے کیا خبر مشہور کی ہے؟ بہ نسبت حکیم احسن اللہ خاں کے جو بات مشہور ہے، وہ محض غلط۔ ہاں، مرزا الٰہی بخش جو شہزادوں میں ہیں، اُن کو حکم کراچی بندر جانے کا ہے اور وہ انکار کر رہے ہیں، دیکھیے کیا ہو۔ حکیم جی کو اُن کی حویلیاں مل گئی ہیں، اب وہ مع قبائل اُن مکانوں میں جا رہے ہیں۔ اتنا حکم اُن کو ہے کہ شہر سے باہر نہ جائیں۔ رہا میں:

تو بیکسی و غریبی، ترا کہ می پرسد

نہ جزا نہ سزا، نہ نفریں نہ آفریں، نہ عدل نہ ظلم، نہ لطف، نہ قہر۔ پندرہ دن پہلے تک دن کو روٹی، رات کو شراب ملتی تھی، اب صرف روٹی ملے جاتی ہے، شراب نہیں۔ کپڑا ایامِ تنعم کا بنا ہوا ابھی ہے، اُس کی کچھ فکر نہیں ہے، مگر تم کو میرے سر کی قسم، یہ لکھ بھیجو کہ میری خبر تم نے کیا سُنی؟ مجھے اُس کے معلوم ہونے سے مزہ ملے گا۔

شنبہ ۵ نومبر ۱۸۵۹ء

غالب

(۷۵)

میری جان!

کیا سمجھے ہو! سب مخلوقات تفتہ و غالب کیوں کر بن جائیں:

ہر یکے را بہر کارے ساختند

انت منا، سو منا۔ مصری میٹھی، نمک سلونا، کبھی کسی شے کا مزہ نہ بدلے گا۔ اب جو میں اُس شخص کو نصیحت کروں، وہ کیا نہ سمجھے گا کہ غالب کیا جانے کہ عبدالرحمٰن کون ہے اور مجھ سے اُس سے کیا رسم و راہ ہے؟ بے شبہہ جانے گا کہ تفتہ نے لکھا ہو گا۔ میں اُس کی نظر میں سبک ہو جاؤں گا اور تم سے وہ اور بھی سرگراں ہو جائے گا۔ اور یہ جو تم لکھتے ہو کہ تو نے اُس شخص کو اپنے عزیزوں میں گنا ہے؛ بندہ پرور! میں تو بنی آدم کو، مسلمان ہو یا ہندو یا نصرانی، عزیز رکھتا ہوں اور اپنا بھائی گنتا ہوں۔ دوسرا مانے یا نہ مانے۔ باقی رہی وہ عزیز داری، جس کو اہلِ دنیا قرابت کہتے ہیں، اُس کو قوم اور ذات اور مذہب اور طریق شرط ہے اور اُس کے مراتب و مدارج ہیں۔ نظر اس دستور پر اگر دیکھو تو مجھ کو اُس شخص سے خس برابر علاقہ عزیزداری کا نہیں۔

ازراہِ حسنِ اخلاق اگر عزیز لکھ دیا یا کہہ دیا تو کیا ہوتا ہے۔ زین العابدین خاں عارف میری سالی کا بیٹا، یہ شخص اُس کی سالی کا بیٹا، اس کو جو چاہو سمجھ لو۔ خلاصہ یہ کہ جب اُدھر سے آدمیت نہ ہوئی تو اب اُس کو لکھنا لغو و بے فائدہ بلکہ مضر ہے۔

تمھارا میرٹھ جانا اور نواب مصطفیٰ خاں سے ملنا، ہم پہلے ہی دریافت کر چکے ہیں۔ اب تمھارے خط سے مراد آباد ہو کر سکندر آباد آنا معلوم ہو گیا۔ حق تعالیٰ شانہٗ، تم کو خوش و خرم رکھے۔

مرقومۂ جمعہ ۲۳ دسمبر ۱۸۵۹ء

(۷۶)

بھائی!

میں نے دلّی کو چھوڑا اور رام پور کو چلا۔ پنج شنبہ انیس کو مراد نگر اور جمعے بیس کو میرٹھ پہنچا۔ آج شنبہ اکیس کو بھائی مصطفیٰ خاں کے کہنے سے مقام کیا۔ یہاں سے یہ خط تم کو لکھ کر بھیجا۔ کل شاہ جہاں پور، پرسوں گڑھ مکٹیشر رہوں گا۔ پھر مراد آباد ہوتا ہوا رام پور جاؤں گا۔ اب جو مجھ کو خط بھیجو، رام پور بھیجنا۔ سرنامے پر رام پور کا نام اور میرا نام کافی ہے۔ اب اسی قدر لکھنا کافی تھا۔ باقی جو کچھ لکھنا ہے، وہ رام پور سے لکھوں گا۔

مرقومۂ چاشتگاہ شنبہ ۲۱ جنوری ۱۸۶۰ء   راقم   غالب

(۷۷)

صاحب!

تمھارے یہ اوراق سکندر آباد سے دلّی اور دلّی سے رام پور پہنچے۔ یقین

ہے کہ رام پور سے میرے بھیجے ہوئے سکندر آباد پہنچے ہوں گے۔ سوائے ایک مصرع کے مجھے اور جگہ کی اصلاح یاد نہیں۔ تم جو اپنے فرزند کو ناشناسائے مزاجِ روزگار کہتے ہو، خود اِس میں اُس سے کیا کم ہو؟ پہلے تو یہ بتاؤ کہ رام پور میں مجھے کون نہیں جانتا؟ کہاں مولوی وجیہ الزماں صاحب، کہاں میں! اُن کا مسکن میرے مسکن سے دُور۔ پھر درِ دولتِ رئیس کہاں اور میں کہاں! چار دن والیِ شہر نے اپنی کوٹھی میں اُتارا، میں نے مکان جداگانہ مانگا، دو تین حویلیاں برابر برابر مجھ کو عطا ہوئیں، اب اُس میں رہتا ہوں۔ بہ حسبِ اتفاق ڈاک گھر مسکن کے پاس ہے، ڈاک منشی آشنا ہو گیا ہے۔ برابر دلّی سے خط چلے آتے ہیں۔ صرف رام پور کا نام اور میرا نام۔ محلے کی اور عرف کی حاجت نہیں بلکہ درِ دولت اور مولوی صاحب کے نشان سے شاید خط تلف ہو جائے۔ دوسری بات جو تم نے لکھی ہے، وہ بھی مطابقِ واقع و مناسبِ حال نہیں۔ اگر اقامت قرار پائی تو تم کو بلا لوں گا۔

اوائل فروری سنہ ۱۸۶۰ء

غالب

(۷۸)

میری جان!

آخر لڑکے ہو، بات کو نہ سمجھے۔ میں اور تفتہ کا اپنے پاس ہونا غنیمت نہ جانوں؟ میں نے یہ لکھا تھا کہ بہ شرطِ اقامت بلا لوں گا اور پھر لکھتا ہوں کہ اگر میری اقامت یہاں کی ٹھہری تو بے تمھارے نہ رہوں گا، نہ رہوں گا، زنہار نہ رہوں گا۔

منشی بالمکند بے صبر کا خط بلند شہر سے دلّی اور دلّی سے رام پور پہنچا،

تلف نہیں ہوا۔ اگر میں یہاں رہ گیا، تو یہاں سے، اور اگر دلّی چلا گیا تو وہاں سے اصلاح دے کر اُن کے اشعار بھیج دوں گا۔ بے صبر کو اب کی بار مہینا بھر صبر چاہیے۔ وہ لفافہ بہ دستور رکھا ہوا ہے۔ از بس کہ یہاں کے حضرات مہربانی فرماتے ہیں اور ہر وقت آتے ہیں، فرصتِ مشاہدۂ اوراق نہیں ملی۔ تم اسی رقعے کو اُن کے پاس بھیج دینا۔

سہ شنبہ ۱۴ فروری ۱۸۶۰ء غالب

(۷۹)

برخوردار سعادت آثار منشی ہرگوپال سلمہ اللہ تعالیٰ

اِس سے آگے تم کو حالات مجمل لکھ چکا ہوں۔ ہنوز کوئی رنگ قرار نہیں پایا۔ بالفعل نواب لفٹنٹ گورنر بہادر مراد آباد اور وہاں سے رام پور آئیں گے۔ بعد اُن کے جانے کے کوئی طور اقامت یا عدم اقامت کا ٹھہرے گا۔ منظور مجھ کو یہ ہے کہ اگر یہاں رہنا ہوا، تو فوراً تم کو بُلا لوں گا۔ جو دن زندگی کے باقی ہیں، وہ باہم بسر ہو جائیں۔ والدعا۔

یکم مارچ ۱۸۶۰ء راقم غالب

(۸۰)

مرزا تفتہ!

اس غمزدگی میں مجھ کو ہنسانا تمھارا ہی کام ہے۔ بھائی! "تضمینِ گلستاں" چھپوا کر کیا فائدہ اُٹھایا ہے۔ جو انطباعِ "سنبلستان" سے نفع اٹھاؤ گے۔ روپیہ جمع رہنے دو۔ آمد اچھی چیز ہے، اگرچہ قلیل ہو اور اگر روپیہ لینا منظور

ہے تو ہرگز اندیشہ نہ کرو اور درخواست دے دو۔ بعد نو مہینے کے روپیہ تم کو مل جائے گا۔ یہ میرا ذمہ کہ اس نو مہینے میں کوئی انقلاب واقع نہ ہوگا۔ اگر احیاناً ہوا بھی تو ہوتے ہوتے اُس کو مدت چاہیے۔ "رستخیز بیجا" ہو چکا اب ہو تو "رستخیز" ہو یعنی "قیامت" اور اُس کا حال معلوم نہیں کہ کب ہوگی۔ اگر اعداد کے حساب سے دیکھو تو بھی "رستخیز" کے ۱۲۷۷ ہوتے ہیں۔ احتمالِ فتنہ سالِ آیندہ پر رہا، سو بھی موہوم۔

میاں! میں جو آخر جنوری کو رام پور جاکر آخر مارچ میں یہاں آگیا ہوں تو کیا کہوں کہ یہاں کے لوگ میرے حق میں کیا کیا کچھ کہتے ہیں۔ ایک گروہ کا قول یہ ہے کہ یہ شخص والی رام پور کا اُستاد تھا اور وہاں گیا تھا؛ اگر نواب نے کچھ سلوک نہ کیا ہوگا، تو بھی پانچ چار ہزار روپیے سے کم نہ دیا ہوگا۔ ایک جماعت کہتی ہے کہ نوکری کو گئے تھے مگر نوکر نہ رکھا۔ ایک فرقہ کہتا ہے کہ نواب نے نوکر رکھ لیا تھا، دو سو روپیہ مہینا کر دیا تھا، لفٹنٹ گورنر الہ آباد جو رام پور آئے اور اُن کو غالب کا وہاں ہونا معلوم ہوا تو انھوں نے نواب صاحب سے کہا کہ اگر ہماری خوشنودی چاہتے ہو تو اِس کو جواب دو۔ نواب نے برطرف کر دیا۔

یہ تو سب سُن لیا، اب تم اصل حقیقت سنو۔ نواب یوسف علی خاں بہادر تیس تیس برس کے میرے دوست اور پانچ چھے برس سے میرے شاگرد ہیں۔ آگے گاہ گاہ کچھ بھیج دیا کرتے تھے، اب جولائی ۱۸۵۹ء سے سو روپیہ مہینا ماہ بہ ماہ بھیجتے ہیں۔ بلاتے رہتے تھے؛ اب میں گیا، دو مہینے رہ کر چلا آیا۔ بہ شرطِ حیات بعد برسات کے پھر جاؤں گا۔ وہ سو روپیہ مہینا؛ یہاں رہوں، وہاں رہوں؛ خدا کے ہاں سے میرا مقرر ہے۔

۳۱ مارچ ۱۸۶۰ء

غالب

(۸۱)

مرزا تفتہ !

ایک امرِ عجیب تم کو لکھتا ہوں اور وہ امر بعد تعجبِ مفرط کے موجبِ نشاطِ مفرط ہوگا۔ میں اجرائے پنشنِ سرکارِ انگریزی سے مایوس تھا۔ بارے، وہ نقشہ پنشن داروں کا، جو یہاں سے بن کر صدر کو گیا تھا اور یہاں کے حاکم نے بہ نسبت میرے صاف لکھ دیا تھا کہ یہ شخص پنشن پانے کا مستحق نہیں ہے؛ گورمنٹ نے برخلاف یہاں کے حاکم کی رائے کے، میرے پنشن کے اجرا کا حکم دیا اور وہ حکم یہاں آیا اور مشہور ہوا۔ میں نے بھی سُنا۔ اب کہتے ہیں کہ ماہِ آیندہ یعنی مئی کی پہلی کو تنخواہوں کا بٹنا شروع ہوگا۔ دیکھا چاہیے پچھلے روپیے کے باب میں کیا حکم ہوتا ہے۔

۱۶ اپریل ۱۸۶۰ء

غالب

(۸۲)

بھائی !

آج اس وقت تمھارا خط پہنچا۔ پڑھتے ہی جواب لکھتا ہوں۔ زرِ سہ سالۂ مجتمعہ ہزاروں کہاں سے ہوئے! سات سو پچاس روپیے سال پاتا ہوں۔ تین برس کے دو ہزار دو سو پچاس ہوئے۔ سو روپیے مجھے مددِ خرچ ملے تھے، وہ کٹ گئے۔ ڈیڑھ سو روپیے متفرقات میں گئے۔ رہے دو ہزار روپیے؛ میرا مختار کار ایک بنیا ہے اور میں اُس کا قرض دارِ قدیم ہوں۔ اب جو وہ دو ہزار لایا، اُس نے اپنے پاس رکھ لیے اور مجھ سے کہا کہ میرا حساب کیجیے۔ سات کم پندرہ سو اُس کے سود مول کے ہوئے۔ قرض متفرق کا اُسی

سے حساب کروایا۔ گیارہ سو کئی روپے وہ نکلے۔ پندرہ اور گیارہ چھبیس سو ہوئے۔ اصل ہیں، یعنی دو ہزار میں چھے سو کا گھاٹا۔ وہ کہتا ہے پندرہ سو میرے دے دو، پانسو سات روپے باقی کے تم لے لو۔ میں کہتا ہوں متفرقات گیارہ سو چکا دے؛ نو سو باقی رہے، آدھے تو لے، آدھے مجھ کو دے۔ پرسوں چوتھی کو وہ روپیہ لایا ہے، کل تک قصہ نہیں چکا۔ میں جلدی نہیں کرتا۔ دو ایک مہاجن بیچ میں ہیں، ہفتہ بھر میں جھگڑا فیصل ہو جائے گا۔ خدا کرے یہ خط تم کو پہنچ جائے۔ جس دن برات سے پھر کر آؤ، اُسی دن مجھ کو اپنے ورودِ مسعود کی خبر دینا۔ والدعا۔

شنبہ ششم مئی ۱۸۶۰ء ہنگامِ نیم روز

غالب

(۸۳)

برخوردار مرزا تفتہ!

دوسرا مسودہ بھی کل پہنچا۔ تم سچے اور میں معذور۔ اب میری کہانی سنو۔ آخر جون میں صدر پنجاب سے حکم آگیا کہ پنشن دارانِ قدیم ماہ بہ ماہ نہ پائیں، سال میں دو بار بہ طریقِ ششماہہ فصل بہ فصل پایا کریں۔ ناچار، ساہوکار سے سود کاٹ کر روپیہ لیا گیا، تارام پور کی آمد میں مل کر صرف ہو۔ یہ سود چھے مہینے تک اسی طرح کٹواں دینا پڑے گا۔ ایک رقم معقول گھاٹے میں جائے گی:

رسم ہے مردے کی چھماہی ایک
خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو کہ ہوں بہ قیدِ حیات
اور چھماہی ہو سال میں دو بار

دس گیارہ برس سے اُس تنگنا میں رہتا تھا۔ سات برس تک ماہ بہ ماہ چار روپیہ دیا گیا۔ اب تین برس کا کرایہ کچھ اوپر سو روپیہ یک مشت دیا۔ مالک نے مکان بیچ ڈالا۔ جس نے لیا ہے، اُس نے مجھ سے بہ پیام بلکہ ابرام کیا کہ مکان خالی کر دو۔ مکان کہیں ملے تو اُٹھوں۔ بے درد نے مجھ کو عاجز کیا اور مدد لگا دی۔ وہ صحن بالا خانے کا جس کا دو گز کا عرض اور دس گز کا طول، اس میں پاڑ بندھ گئی۔ رات کو وہیں سونا، گرمی کی شدت، پاڑ کا قرب، گمان یہ گزرتا تھا کہ یہ کٹگھرا ہے اور صبح کو مجھ کو پھانسی ملے گی۔ تین راتیں اسی طرح گزریں۔ دوشنبہ نو جولائی کو دوپہر کے وقت ایک مکان ہاتھ آگیا، وہاں جا رہا، جان بچ گئی۔ یہ مکان بہ نسبت اُس مکان کے بہشت ہے، اور یہ خوبی کہ محلہ وہی بلی ماروں کا۔ اگرچہ ہے یوں کہ میں اگر اور محلے میں بھی جا رہتا تو قاصدانِ ڈاک وہیں پہنچتے؛ لیکن اب اکثر خطوط لال کنوئیں[۲] کے پتے سے آتے ہیں اور بے تکلف یہیں پہنچتے ہیں۔ بہ ہر حال، تم وہی "دلّی، بلی ماروں" کا محلہ لکھ کر خط بھیجا کرو۔ دو مسودے تمھارے اور ایک مسودہ بے صبر کا، یہ تین کاغذ در پیش ہیں۔ دو ایک دن میں بعد اصلاح ارسال کیے جائیں گے، خاطر عاطر جمع رہے۔

صبح جمعہ ۲۰ جولائی ۱۸۶۰ء

(۴۸)

مرزا تفتہ!

کل تمھارا خط مع کاغذ اشعار آیا۔ آج تم کو یہ خط لکھتا ہوں اور اسی خط کے ساتھ خط موسومۂ میر بادشاہ بھیجتا ہوں۔ کاغذ اشعار کل یا پرسوں روانہ ہوگا۔ فنِ تاریخ کو دون مرتبۂ شاعری جانتا ہوں اور تمھاری طرح سے یہ بھی میرا عقیدہ نہیں ہے کہ تاریخ وفات

لکھنے سے ادائے حقِ محبت ہوتا ہے۔ بہ ہر حال میں نے منشی نبی بخش مرحوم کی تاریخِ رحلت میں یہ قطعہ لکھ کر بھیجا۔ منشی قمرالدین خاں صاحب نے ناپسند کیا۔ قطعہ یہ ہے:

شیخ نبی بخش کہ با حسن خلق — داشت مذاقِ سخن و فہم نیز
مرگِ ستم پیشہ امانش نداد — کیست کہ با مرگ بسیجد ستیز
سالِ وفاتش زپئے یادگار — بادل زار و مژہ دجلہ ریز
خواستم از غالب آشفتہ سر — گفت: مدہ طول و بگو رستخیز

ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ کوئی لفظ جامع اعداد نکال لیا کرتے ہیں، بلکہ قید معنی دار ہونے کی بھی مرتفع ہے۔ جیساکہ یہ مصرع:

در سال غرس ہر آنکہ ماند بیند

الوری کے قصائد کو دیکھو، دو چار جگہ ایسے الفاظ قصیدے کے آغاز میں لکھے ہیں، جس میں اعدادِ سالِ مطلوب نکل آتے ہیں اور معنی کچھ نہیں ہوتے۔ لفظ "رستخیز" کیا پاکیزہ معنی دار لفظ ہے اور پھر واقع کے مناسب۔ اگر تاریخ ولادت یا تاریخِ شادی میں یہ لفظ لکھتا تو بے شبہ نامستحسن تھا۔ قصہ مختصر اگر تاریخ کی فکر موجبِ ادائے حقِ مودت ہے تو میں حقِ دوستی ادا کر چکا۔ زیادہ کیا لکھوں۔

صبح دوشنبہ پنجم جمادی الاول ۱۲۷۷ھ — داد کا طالب غالب
نوزدہم نومبر سالِ حال ۱۸۶۰ء[۲]

(۸۵)

صاحب!

تمھارا خط میرٹھ سے آیا۔ "مرآۃ الصحائف" کا تماشا دیکھا۔ "سنبلستان" کا چھاپا خدا تم کو مبارک کرے، اور خدا ہی تمھاری آبرو کا نگہبان رہے۔ بہت گزر گئی

ہے، تھوڑی رہی۔ اچھی گزری ہے، اچھی گزر جائے گی۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ عرفیؔ کے قصائد کی شہرت سے عرفیؔ کے کیا ہاتھ آیا۔ جو میرے قصائد کے اشتہار سے مجھ کو نفع ہوگا؟ سعدیؔ نے "بوستاں" سے کیا پھل پایا، جو تم "سنبلستان" سے پاؤ گے؟ اللہ کے سوا جو کچھ ہے موہوم و معدوم ہے۔ نہ سخن ہے، نہ سخنور ہے، نہ قصیدہ ہے نہ قصد ہے۔ لَامَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰہ۔

جناب بھائی صاحب یعنی مصطفیٰ خاں بہادر سے ملاقات ہو تو میرا سلام کہہ دینا۔ ہمشیرہ کی پنسن کا جاری ہو جانا بہت خوشی کی بات ہے؛ مگر خوشی سے تعجب زیادہ ہے۔ کیا عجب ہے کہ اس سے بھی زیادہ خوشی اور زیادہ تعجب کی بات بروے کار آوے، یعنی آپ کا پنسن بھی واگذاشت ہو جاوے۔ اللہ اللہ اللہ۔

صبح یک شنبہ ۲۰ جنوری ۱۸۶۱ء

(۸۶)

اجی مرزا تفتہ!

تم نے روپیہ بھی کھویا اور اپنی فکر کو اور میری اصلاح کو بھی ڈبویا۔ ہائے کیا بری کاپی ہے! اپنے اشعار کی اور اس کاپی کی مثال جب تم پر کھلتی کہ تم یہاں ہوتے اور بیگماتِ قلعہ کو پھرتے چلتے دیکھتے! صورت ماہِ دو ہفتہ کی سی اور کپڑے میلے، پائچے لیر لیر، جوتی ٹوٹی۔ یہ مبالغہ نہیں بلکہ بے تکلف "سنبلستان" ایک معشوقِ خوبرو ہے، بدلباس ہے۔ بہرحال، دونوں[۲] لڑکوں کو دونوں[۳] جلدیں دے دیں اور معلم کو حکم دیا کہ اسی کا سبق دے، چنانچہ آج سے شروع ہو گیا۔

مرقومۂ صبح سہ شنبہ ۹ ماہ اپریل ۱۸۶۱ء

غالب

(۸۷)

میاں مرزا تفتہ!

ہزار آفریں! کیا اچھا قصیدہ لکھا ہے! واہ واہ، چشم بد دور، تسلسلِ معنی، سلاستِ الفاظ۔ ایک مصرع میں تم کو محمد اسحاق شوکت بخاری سے توارد ہوا۔ یہ بھی محلِ فخر و شرف ہے کہ جہاں شوکت پہنچا، وہاں تم پہنچے۔ وہ مصرع یہ ہے:

چاک گردیدم و از جیب بہ داماں رفتم

پہلا مصرع تمھارا اگر اُس کے پہلے مصرع سے اچھا ہوتا، تو میرا دل اور زیادہ خوش ہوتا۔ خدا تم کو اتنا جلائے کہ ایک دیوان بیس جز قصائد کا کہہ لو۔ مگر خبردار! قصائد بہ قیدِ حروفِ تہجی نہ جمع کرنا۔

صاحب! مجھے اس بزرگوار کا معاملہ اور یہ جو تم نے اس کا وطن اور پیشہ اب لکھا ہے، سابق کا تمھارا لکھا ہوا سب یاد ہے۔ میں نے اُس کو دوست بہ طریقِ طنز لکھا ہے۔ بہ ہر حال، وہ جو میں نے خاقانی کا شعر لکھ کر اُس کو بھیجا؛ اُس کی ماں مرے، اگر میرے اُس خط کا جواب لکھا ہو۔

بڑا پُرانا قصہ تم نے یاد دلایا، داغِ کہنۂ حسرت کو چمکایا۔ یہ قصیدہ منشی محمد حسن کی معرفت روشن الدولہ پاس اور روشن الدولہ کے توسط سے نصیر الدین حیدر کے پاس گزرا اور جس دن گزرا، اُسی دن پانچ ہزار روپیے کے بھیجنے کا حکم ہوا۔ متوسط یعنی منشی محمد حسن نے مجھ کو اطلاع نہ دی۔ مظفر الدولہ مرحوم لکھنؤ سے آئے، اُنھوں نے یہ راز مجھ پر ظاہر کیا اور کہا خدا کے واسطے میرا نام منشی محمد حسن کو نہ لکھنا۔ ناچار، میں نے شیخ امام بخش ناسخ کو لکھا کہ تم دریافت کر کے لکھو کہ میرے قصیدے پر کیا گزری؟ اُنھوں نے جواب میں لکھا کہ

پانچ ہزار ملے، تین ہزار روشن الدولہ نے کھائے، دو ہزار منشی محمد حسن کو دیے اور فرمایا کہ اِس میں سے جو مناسب جانو غالب کو بھیج دو۔ کیا اُس نے ہنوز تم کو کچھ نہ بھیجا؟ اگر نہ بھیجا ہو تو مجھ کو لکھو۔ میں نے لکھ بھیجا کہ مجھے پانچ روپیے بھی نہیں پہنچے۔ اِس کے جواب میں اُنھوں نے لکھا کہ اب تم مجھے خط لکھو، اُس کا مضمون یہ ہو کہ میں نے بادشاہ کی تعریف میں قصیدہ بھیجا ہے اور یہ مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ وہ قصیدہ حضور میں گزرا مگر یہ میں نے نہیں جانا کہ اُس کا صلہ کیا مرحمت ہوا۔ میں کہ ناسخ ہوں اپنے نام کا، خط بادشاہ کو پڑھواکر، ان کا کھایا ہوا روپیہ اُن کے حلق سے نکال کر تم کو بھیج دوں گا۔ بھائی یہ خط لکھ کر میں نے ڈاک میں روانہ کیا۔ آج خط روانہ ہوا، تیسرے دن شہر میں خبر اُڑی کہ نصیرالدین حیدر مرگیا۔ اب کہو، میں کیا کروں اور ناسخ کیا کرے!

دوشنبہ ۱۹ اگست ۱۸۶۱ء
غالب

(۸۸)

مرزا تفتہ صاحب!

اِس قصیدے کے باب میں بہت باتیں آپ کی خدمت میں عرض کرنی ہیں۔ پہلے تو یہ کہ "خنجرِ او گوہرِ را" کو تم نے از قسم تنافر سمجھا اور اُس پر اشعارِ اساتذہ سند لائے۔ یہ خدشہ نہیں پیدا ہوتا مگر لڑکوں کے اور مبتدیوں کے دل میں۔ سلیم:

شراب نقل نخواہد، بگیر ساغر را
کہ احتیاجِ شکر نیست شیرِ مادر را

یہ غزل شاہ جہاں کے عہد کی طرحی ہے۔ صائب و قدسی و شعرائے ہند نے

اس پر غزلیں لکھی ہیں۔

دوسرے یہ کہ ممدوح کا پورا نام بے تکلف آتے ہوئے خالی کیوں اڑا دو۔ "ضیاءالدین احمد خاں" نام ہے؛ ہندی میں رخشاں تخلص، فارسی میں نیّر تخلص:

ہمانا نیّرِ رخشاں ضیاءالدین احمد خاں

دیکھو تو کیا پاکیزہ مصرع ہے! یہ نہ کہنا کہ شعرا ممدوح کا نام ننگا لکھ جاتے ہیں؛ وہ بہ حسبِ ضرورتِ شعر ہے۔ جس بحر میں پورا نام نہ آئے، اُس میں شوق سے لکھو: جائز، روا، مستحسن۔ جس بحر میں نام ممدوح کا درست آئے، اُس میں فروگذاشت کیوں کرو۔ ؟

دوشنبہ نہم ستمبر ۱۸۶۱ء غالب

(۸۹)

صاحب؛

"گوہر را" "خاور را" یہ قصیدہ بہت اصلاح طلب تھا۔ ہم نے اصلاح دے کر تمھارے پاس بھیج دیا ہے۔ جب تم صاف کر کے بھیجو گے، ہم تمھارے ممدوح کو دے دیں گے۔ کل تمھارا یہ قصیدہ پہنچا۔ ہم نے دوپہر کو دیکھ کر درست کیا۔ آج پنجشنبہ بارہ ستمبر کو ڈاک میں بھجوا دیا۔

صاحب! آج میر بادشاہ آئے، تمھاری خیر و عافیت اُن کی زبانی معلوم ہوئی۔ اللہ تمھیں خوش رکھے اور مجھ کو تمھارے خوش رکھنے کی توفیق دے۔ ممدوح کا نام کیا لکھوں؟ بات اسی قدر ہے کہ رام پور میں کوئی صورت کسی طرح بنتی نظر نہیں آتی، ورنہ کیا تمھارا قصیدہ وہاں نہ بھجواتا؟

"دُرّاعہ" کو یہ نہ کہو کہ تشدید نہیں ہے۔ اصل لغت مشدّد ہے۔ شعرا اُس

کو مخفف بھی باندھتے ہیں۔ سعدی کے مصرع سے اتنا مقصود حاصل ہوا کہ ”دُرّاعہ“ بے تشدید بھی جائز ہے۔ یاد رہے ”جادّہ“ اور ”دُرّاعہ“ دونوں عربی لغت ہیں۔ وہ دال کی تشدید سے اور یہ ”رے“ کی تشدید سے۔ مگر خیر، ”جادہ“ و ”دراعہ“ بھی لکھتے ہیں۔ یہ نہ کہو کہ ”دُرّاعہ“ ہرگز نہیں ہے۔ یہ کہو کہ ”دُراعہ“ بے تشدید بھی جائز ہے۔

پنجشنبہ ۱۲ ستمبر ۱۸۶۱ء[1]

غالب

(۹۰)

”انگشتری“ اور ”خاتم“ دونوں ایک ہیں۔ تم نے ”خاتم“ بہ معنی ”نگین“ باندھا، یہ غلط۔ ”جنس وفائے کس مخر“ کیا ترکیب ہے؟ ”جنس کس مخر وفا“ البتہ درست ہے۔ نظرِ اوّل میں بہ سبب تکدرِ حواس اور کثرتِ دردِ ورمِ پا کے میں نے خیال نہ کیا ہوگا۔

یہ خط لکھ کر بند کر[2] رکھا تھا کہ کل صبح روانہ کروں گا؛ چشم بد دور! آج اسی وقت کہ دو گھڑی دن ہے، آپ کا نوازش نامہ پہنچا۔ وہ سرا جو میں نے خالی چھوڑ دیا ہے، اُس کو کتر کر یہ سطریں لکھ کر پھر بند کرتا ہوں۔ سبحان اللہ!:

”دیگر نتواں گفت اخص را کہ اعم ست ایں“

اس کا وزن کب درست ہے؟ کیا فرماتے ہو! غور کرو، بعد غور کے اس کی ناموزونی کا خود اقرار کروگے۔ شرف قزوینی کے مطلع میں ”ساغرِ غم درکشیدہ ایم“ و ”دم درکشیدہ ایم“۔ دوسرے شعر میں:

پیمانہائے زہرِ ستم درکشیدہ ایم

”درکشیدن“ کو ربط ”پیمانہ“ کے ساتھ ہے یا ”زہر“ کے ساتھ؟ اگر

"زہر درکشیدن" جائز ہوتا تو وہ "سم" کے قافیے کو کیوں چھوڑتا؟ تیسرے شعر میں "قلم درکشیدن" ہے۔ چوتھے شعر میں "آب درکشیدن" ہے۔ پانچویں میں "سر درکشیدن" ہے۔ کیا زہر پانی ہے؟ اگر بہ مثل "زہراب" ہوتا تو روا تھا۔

سبحان اللہ! "یہ عبارت: "جائیکہ شرف قزوینی ساغر و پیمانہ و زہر درکشید" اے برادر! شرف زہر کجا درکشید؟ بلکہ پیمانۂ زہر درکشید۔ شما ہم ساغرِ سم درکشید۔ "سم درکشیدن" کجا و "پیمانۂ غم درکشیدن" کجا۔ ہم نے تو تم کو اجازت دی ہے۔ خیر رہنے دو، ہند میں اس کو کون سمجھے گا؟ چاہو یوں کر دو:

دانی من و دل آنچہ بہم درکشیدہ ایم
در یک نفس دو ساغرِ سم درکشیدہ ایم   غالبؔ

سبحان اللہ! تم جانتے ہو کہ میں اب دو مصرعے موزوں کرنے پر قادر ہوں جو مجھ سے مطلع مانگتے ہو:

گمانِ زیست بود بر منت ز بیدردی
بد است مرگ، ولے بدتر از گمانِ تو نیست

خیر، شرف قزوینی کی سند پر وہ مطلع رہنے دو۔ 'غالبؔ'

میں ایسا جانتا ہوں کہ "درّاغ" بہ تشدید ہے اور وہ "درع" بہ وزن "زرع" اور لغت ہے۔

صاحب! یہ قصیدہ تم نے ایسا لکھا ہے کہ میرا دل جانتا ہے۔ کیا کہنا ہے! ایک خیال رکھا کرو کہ شعرِ اخیر میں کوئی بات ایسی آجائے کہ جس سے اختتام کے معنی پیدا ہوا کریں۔

ایک قصیدہ اصلاح دے کر بھیج چکا ہوں اور اُسی ورق پر فلانے صاحب کے باب میں تم کو ایک نصیحت کر چکا ہوں۔ اُدھر کے جواب کا ہرگز خیال

نہ رکھو اور اِدھر سے اگر قصیدے کے ارسال میں دیر ہوا کرے تو گھبرایا نہ کرو۔ اب میرے پاس دو قصیدے ہیں: ایک "لشکر برآورم" اور ایک کل آیا ہے۔ "برجا ماند" و "دریا ماند" خوب کہے، کہ مضمون سے پہلے ممدوح ڈھونڈھنا پڑتا ہے! اگر میں تم کو ممدوح بتا سکتا تو قصیدہ اُس کے نام کا تم سے منگوا چکا ہوتا اور اُس ممدوح تک پہنچا چکا ہوتا۔ بھائی! ایک دقیقہ ہے، کہ لکھنے کے قابل نہیں۔ ہاں، ملاقات ہوئے پر کہہ سکتا ہوں۔ اللہ اللہ۔

۲ ستمبر ۱۸۶۱ء

(۹۱)

صاحب!

قصیدے پر قصیدہ لکھا اور خوب لکھا۔ آفریں ہے! پھر اُستاد کے شعر تضمین کیوں کرتے ہو؟ نہ اس کی کچھ حاجت، نہ اس میں کوئی افزایشِ حسن تمھاری۔ ایک شعر کو ایک شعر کے بعد رکھ دیا ہے تاکہ مقطعِ کلام ہو جائے۔ پہلا قصیدہ تمھارا "برآورم" "درآورم" کی ردیف کا سست ہے، اُس کو ہم نے نامنظور کیا؛ مگر نظرِ ثانی میں جو شعر قابل رکھنے کے ہوں گے، وہ لکھ کر تم کو بھیج دیں گے۔ بالفعل ایک شعر کی قباحت تم پر ظاہر کرتے ہیں تاکہ آیندہ اس پا لغز سے احتراز کرو:

نورِ سعادت از جبہۂ قاصدم چکید

یہ کیا ترکیب ہے؟ "جبہہ" بروزن "چشمہ" ہے۔ یعنی دو ہائے ہوز ہیں۔ "جبۂ قاصد" ایک ہائے ہوز کہاں گئی؟:

ہر کجا چشمۂ بود شیریں

"چشمہ" کی جگہ "چشہ" لکھتے ہو۔ یہ بات ہمیشہ کو یاد رہے۔ اتنے بڑے مشاق سے ایسی غلطی بہت تعجب کی بات ہے۔ میاں:

برگِ دنیا نہ سازد نیش بوَد

یہ کوئی لغت نہیں۔ ایک لفظ نہیں کہ کسی فرہنگ میں سے نکل آئے؛ یہ طرزِ تحریر ہے۔ کس کو یاد ہے کہ اس کا نظیر کہاں موجود ہے؟ اس امر سے قطع نظر، وہ شخص ایسا کہاں کا فارسی داں اور عالم ہے کہ میں لڑکوں کی طرح بیت بحثی کروں۔ دو جوتیاں آپ لگا دیں، ایک جوتی تم سے لگوا دی۔ اب قطع نظر کرو اور سکوت اختیار فرماؤ۔ میں "برہان" کا خاکہ اُڑا رہا ہوں، "چار شربت" اور "غیاث اللغات" کو حیض کا لتا سمجھتا ہوں؛ ایسے گم نام چھوکروں سے کیا مقابلہ کروں گا۔ "برہانِ قاطع" کے اغلاط بہت نکالے ہیں۔ دس جز کا ایک رسالہ لکھا ہے اُس کا نام "قاطعِ برہان" رکھا ہے؛ اب اُس کے چھاپنے کی فکر ہے۔ اگر یہ مُدعا حاصل ہو گیا تو ایک جلد چھاپے کی تم کو بھیج دوں گا ورنہ کاتب سے نقل کروا کر قلمی ایک جلد بھیج دوں گا۔ بہت سود مند نسخہ ہے۔

اس قصیدۂ متبرکہ کو موافق اصلاح کے، اس کاغذ سے اور کاغذ پر نقل کر کے، اور جو مطالب کہ اِس کاغذ پر مرقوم ہیں، اُن کو حافظے کے سپرد کر کے، اس ورق کو پھاڑ ڈالو اور اس قصیدے پر ناز کیا کرو۔ یہ قصیدہ تمھارا ہم کو بہت پسند آیا ہے۔

جمعہ ۴ اکتوبر ۱۸۶۱ء
غالب

(۹۲)

صاحب!

یہ قصیدہ تم نے بہت خوب لکھا ہے، حق تعالےٰ شانہٗ اس کا تمھیں صلہ دے۔

نواب مصطفےٰ خاں صاحب کے ہاں سے قصیدے کی رسید آگئی۔ یقین ہے کہ تم کو بھی وہ خط لکھیں۔ دریں ولا یہاں آیا چاہتے ہیں اور مجھ کو یہ لکھا تھا کہ قصیدہ پہنچا، کیا کہنا ہے، ایسا ہے اور ایسا ہے، میں چند روز میں وہاں آتا ہوں، عند الملاقات اس قصیدے کے باب میں باتیں ہوں گی۔

ضیاء الدین خاں صاحب کا بھی مقدمہ آج کل فیصل ہوا چاہتا ہے۔ وہ قصیدہ جو میرے پاس امانت ہے، اُن کو دیا جائے گا، اِنشاءاللہ العَلیّ العَظِیم۔

از من فراغ برد، بریدم من از فراغ

"بریدم من از فراغ" یعنی قطع نظر کردم از فراغ و نومید شدم از فراغ۔

اکتوبر یا نومبر ۱۸۶۱ء[1]

(۹۳)

تم کو معلوم رہے کہ ایک ممدوح تمھارے یہاں آئے ہیں۔ اُن کو میں نے تمھاری فکر اور تلاش کا مداح پایا۔ جنوری ۱۸۶۲ء میں کچھ تمھاری خدمت میں بھیجیں گے، تم کو قبول کرنا ہوگا۔ سمجھے، یہ کون ہے؟ یعنی نواب مصطفےٰ خاں صاحب اور دوسرے ممدوح یعنی نواب ضیاء الدین خاں، وہ آخر دسمبر ۱۸۶۱ء میں یا اوائل جنوری ۱۸۶۲ء میں حاضر ہوں گے۔

اکتوبر یا نومبر ۱۸۶۱ء[2]

(۹۴)

صاحب!

دو زبانوں سے مرکب ہے یہ فارسی متعارف: ایک فارسی، ایک عربی۔ ہر چند اس

منطق میں لغاتِ ترکی بھی آجاتے ہیں مگر کمتر۔ میں عربی کا عالم نہیں مگر نرا جاہل بھی نہیں۔ بس اتنی بات ہے کہ اس زبان کے لغات کا محقق نہیں ہوں، علما سے پوچھنے کا محتاج اور سند کا طلب گار رہتا ہوں۔ فارسی میں مبدءِ فیاض سے مجھے وہ دستگاہ ملی ہے کہ اس زبان کے قواعد و ضوابط میرے ضمیر میں اس طرح جاگزیں ہیں، جیسے فولاد میں جوہر۔ اہلِ پارس میں اور مجھ میں دو طرح کے تفاوت ہیں: ایک تو یہ کہ اُن کا مولد ایران اور میرا مولد ہندوستان۔ دوسرے یہ کہ وہ لوگ آگے پیچھے سو، دو سو، چار سو، آٹھ سو برس پہلے پیدا ہوئے ہیں۔

”جود“ لغتِ عربی ہے بہ معنی ”بخشش“ ”جَوَاد“ صیغہ ہے صفتِ مشبّہ کا بے تشدید: اس وزن پر صیغۂ فاعل میری سماعت میں جو نہیں آیا تو میں اس کو خود نہ لکھوں گا مگر جب کہ نظیرؔی شعر میں لایا اور وہ فارسی کا مالک اور عربی کا عالم تھا تو میں نے مانا۔

کیا ہنسی آتی ہے کہ تم مانند اور شاعروں کے مجھ کو بھی یہ سمجھے ہو کہ اُستاد کی غزل یا قصیدہ سامنے رکھ لیا، یا اُس کے قوافی لکھ لیے اور اُن قافیوں پر لفظ جوڑنے لگے۔ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ! بچپن میں جب میں ریختہ لکھنے لگا ہوں، لعنت ہے مجھ پر اگر میں نے کوئی ریختہ یا اُس کے قوافی پیشِ نظر رکھ لیے ہوں۔ صرف بحر اور ردیف قافیہ دیکھ لیا۔ اور اُس زمین میں غزل قصیدہ لکھنے لگا۔ تم کہتے ہو، نظیرؔی کا دیوان وقتِ تحریرِ قصیدہ پیشِ نظر ہوگا اور جو اُس کے قافیے کا شعر دیکھا ہوگا، اُس پر لکھا ہوگا۔ واللہ اگر تمھارے اِس خط کو دیکھنے سے پہلے میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اِس زمین میں نظیرؔی کا قصیدہ بھی ہے، چہ جائے آں کہ وہ شعر: بھائی! شاعری، معنی آفرینی ہے؛ قافیہ پیمائی نہیں ہے۔

”زمان“ لفظ عربی ”ازمنہ“ جمع، دونوں طرح فارسی میں مستعمل۔ ”زمانے“، ”یک زمان“، ”ہر زمان“، ”زمان زمان“ ”دریں زمان“، ”در آں زمان“، سب صحیح اور

فصیح۔ جو اس کو غلط کہے وہ گدھا۔ بلکہ اہلِ فارس نے مثل "موج" و "موجہ" یہاں بھی "ہے" بڑھا کر "زمانہ" استعمال کیا ہے۔ "یک زمان" کو میں نے کبھی غلط نہ کہا ہوگا، سعدی کے شعر لکھنے کی کیا حاجت؟

سنو میاں! میرے ہم وطن یعنی ہندی لوگ جو وادیِ فارسی دانی میں دم مارتے ہیں، وہ اپنے قیاس کو دخل دے کر ضوابط ایجاد کرتے ہیں۔ جیسا وہ گھا گھس، اُلو عبدالواسع ہانسوی لفظ "نامراد" کو غلط کہتا ہے اور یہ اُلو کا پٹھا قتیل "صفوت کدہ" و "شفقت کدہ" و "نشتر کدہ" کو اور "ہمہ عالم" و "ہمہ جا" کو غلط کہتا ہے۔ کیا میں بھی ویسا ہی ہوں جو "یک زمان" کو غلط کہوں گا؟ فارسی کی میزان یعنی ترازو میرے ہاتھ میں ہے۔ لِلّٰہِ الحمدُ وَلِلّٰہِ الشکر؟

مرقومۂ چارشنبہ ۲۷ ماہ اگست ۱۸۶۲ء

(۹۵)

بھائی!

"ریمیاً" و "ہیمیاً" خرافات ہے۔ اگر ان کی کچھ اصل ہوتی تو ارسطو اور افلاطون اور بو علی، یہ بھی کچھ اس باب میں لکھتے۔ "کیمیا" اور "سیمیا" دو علم شریف ہیں۔ جو اشیا کی تاثیر سے تعلق رکھے، وہ "کیمیا" اور جو اسما سے متعلق ہو وہ "سیمیا":

جاں غمِ سیمیا نخورد گہے
دل سوے کیمیا نیاوَرد دم

شعر بامعنی ہو گیا۔ یہ نہ سمجھا کرو کہ اگلے جو لکھ گئے ہیں، وہ حق ہے۔ کیا آگے آدمی احمق پیدا نہیں ہوتے تھے؟

"زمان" و "زمانہ" کو میں پاگل ہوں جو غلط کہوں گا؟ ہزار جگہ میں نے نظم و نثر میں "زمان" و "زمانہ" لکھا ہوگا۔

وہ شعر کس واسطے کاٹا گیا؟ سمجھو پہلا مصرع لغو، دوسرے مصرع میں "نبرد" کا فاعل معدوم۔ "حلقۂ زا" کی "زے" پر نقطہ نہ تھا۔ میں نے غصے میں لکھا کہ نہ "حلقۂ را" درست نہ "حلقۂ زا" درست۔ مگر یہ فارسی بیدلانہ ہے، خیر رہنے دو۔ مرتا ہوں، مجھے سمجھاتے ہو کہ "صد جا در کلامِ اہلِ زباں خواہند یافت۔" مگر میں بانیِ کلامِ اہلِ زبان نہیں:

گردشِ چرخ استخواں سائید

اس سے یہ بہتر ہے:

سودہ شد استخواں زگردشِ چرخ

باقی اور مصرعے سب اچھے بنائے ہیں۔

اگست ۱۸۶۲ء غالب

(۹۶)

مرزا تفتہ!

جو کچھ تم نے لکھا، یہ بے دردی ہے اور بد گمانی۔ مَعَاذَ اللہ، تم سے اور آزردگی! مجھ کو اِس پر ناز ہے کہ میں ہندوستان میں ایک دوست صادق الولا رکھتا ہوں، جس کا ہرگوپال نام اور تفتہ تخلص ہے۔ تم ایسی کون سی بات لکھو گے کہ موجبِ ملال ہو؟ رہا غماز کا کہنا، اُس کا حال یہ ہے کہ میرا حقیقی بھائی کُل ایک تھا کہ وہ تیس برس دیوانہ رہ کر مر گیا؛ مثلاً وہ جیتا ہوتا اور ہوشیار ہوتا اور تمھاری

بُرائی کہتا تو میں اُس کو جھڑک دیتا اور اُس سے آزردہ ہوتا۔ بھائی! مجھ میں کچھ اب باقی نہیں ہے۔ برسات کی مصیبت گزر گئی لیکن بڑھاپے کی شدت بڑھ گئی۔ تمام دن پڑا رہتا ہوں، بیٹھ نہیں سکتا، اکثر لیٹے لیٹے لکھتا ہوں۔ معہذا یہ بھی ہے کہ اب مشق تمھاری پختہ ہو گئی، خاطر میری جمع ہے کہ اصلاح کی حاجت نہ پاؤں گا۔ اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ قصائد سب عاشقانہ ہیں، بہ کارِ آمدنی نہیں۔ خیر، کبھی دیکھ لوں گا، جلدی کیا ہے؟ تین بات جمع ہوئیں: میری کاہلی، تمھارے کلام کا محتاج بہ اصلاح نہ ہونا، کسی قصیدے سے کسی طرح کے نفع کا تصور نہ ہونا۔ نظر اِن مراتب پر، کاغذ پڑے رہے۔ لالہ بالمکند بے صبرؔ کا ایک پارسل ہے کہ اُس کو بہت دن ہوئے، آج تک سرنامہ بھی نہیں کھولا۔ نواب صاحب کی دس پندرہ غزلیں پڑی ہوئی ہیں:

ضعف نے غالبؔ نکمّا کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

یہ قصیدہ تمھارا کل آیا۔ آج اِس وقت کہ سورج بلند نہیں ہوا، اُس کو دیکھا، لفافہ کیا، آدمی کے ہاتھ ڈاک گھر بھجوایا۔

۲۷ نومبر ۱۸۶۲ء غالبؔ

(۹۷)

صاحب بندہ!

میں نے بکس کا ایک ایک خانہ دیکھا، سوائے تین کاغذوں کے، کوئی کاغذ تمھارا نہ نکلا۔ اور اِس وقت بہ سبب کم فرصتی کے میں ردیف اُن تینوں قصیدوں کی

نہیں بتا سکتا اور وہ مقدمہ پچاس کا بہ اقتضاے حالات زمانہ سست ہو گیا ہے، مٹ نہیں گیا۔ دیر آید درست آید، اِنشاءَ اللہ۔

اب میرا حال سنو:

در نومیدی بسے امید است
پایانِ شبِ سیہ، سپید است

ہمیشہ نواب گورنر جنرل کی سرکار سے دربار میں مجھ کو سات پارچے اور تین رقم جواہر خلعت ملتا تھا۔ لارڈ کیننگ صاحب میرا دربار و خلعت بند کر گئے۔ میں نا اُمید ہو کر بیٹھ رہا اور مدت العمر کو مایوس ہو رہا۔ اب جو یہاں لفٹنٹ گورنر پنجاب آئے، میں جانتا تھا کہ یہ بھی مجھ سے نہ ملیں گے۔ کل اُنھوں نے مجھ کو بُلا بھیجا۔ بہت سی عنایت فرمائی اور فرمایا کہ لارڈ صاحب دلّی میں دربار نہ کریں گے، میرٹھ ہوتے ہوئے اور میرٹھ میں اُن اضلاع کے علاقہ داروں اور مال گزاروں کا دربار کرتے ہوئے، انبالے جائیں گے؛ دلّی کے لوگوں کا دربار وہاں ہو گا۔ تم بھی انبالے جاؤ، شریکِ دربار ہو کر خلعتِ معمولی لے آؤ۔ بھائی! کیا کہوں کہ کیا میرے دل پر گزری؟ گویا مردہ جی اٹھا! مگر ساتھ اُس مسرت کے یہ بھی سنّاٹا گزرا کہ سامانِ سفرِ انبالہ و مصارفِ بے انتہا کہاں سے لاؤں اور طرّہ یہ کہ نذرِ معمولی میری قصیدہ ہے۔ اِدھر قصیدے کی فکر، اُدھر روپیے کی تدبیر؛ حواس ٹھکانے نہیں۔ شعر کام دل و دماغ کا ہے، وہ روپیے کی فکر میں پریشان۔ میرا خدا یہ مشکل بھی آسان کرے گا لیکن ان دنوں میں نہ دن کو چین ہے، نہ رات کو نیند ہے۔ یہ کئی سطریں تمھیں اور ایسی ہی کئی سطریں جناب نواب صاحب کو لکھ کر بھیج دی ہیں۔ جیتا رہا تو انبالے سے آ کر خط لکھوں گا۔

روز چار شنبہ ۱۳ رمضان ۱۲۷۹ھ
۴ مارچ ۱۸۶۳ء

(۹۸)

لو صاحب!

ہم نے لفٹنٹ گورنر کی ملازمت اور خلعت پر قناعت کرکے، انبالے کا جانا موقوف کیا اور بڑے گورنر کا دربار اور خلعت اور وقت پر موقوف رکھا۔ بیمار ہوں، ہاتھ پر ایک زخم، زخم کیا ایک غار ہو گیا ہے۔ دیکھیے انجامِ کار کیا ہوتا ہے۔

اپریل ۱۸۶۳ء[۱]

غالب

(۹۹)

حضرت!

آپ کے سب خط پہنچے، سب قصیدے پہنچے۔ بعد اصلاح بھیج دیے گئے۔ ستّر برس کی عمر! آلامِ روحانی، نہ میں کہوں، نہ کوئی باور کرے۔ امراضِ جسمانی میں کیا کلام ہے؛ بائیں پاؤں میں مہینا بھر سے ورم ہے، کھڑے ہونے میں رگیں پھٹنے لگتی ہیں۔ افعالِ دماغ ناقص ہو گئے۔ حافظہ گویا کبھی تھا ہی نہیں۔ قصہ مختصر، ایک قصیدہ سابق کا اور ایک کل کا آیا ہوا، یہ دونوں ایک لفافے میں آج روانہ کرتا ہوں۔

جمعہ ۳ جولائی ۱۸۶۳ء[۲]

غالب

(۱۰۰)

حضرت!

پرسوں صبح کو تمھارے سب کاغذ ایک لفافے میں بند کرکے ڈاک گھر

بھجوا دیے۔ سمجھا کہ اب چندروز کو جان بچی۔ اُسی دن شام کو ایک خط آپ کا اور پہنچا، اُس کو بھی روانہ کرتا ہوں۔

اپنا حال پرسوں کے خط میں مفصل لکھ چکا ہوں۔ ادنیٰ بات یہ ہے کہ جو کچھ لکھتا ہوں، وہ لیٹے لیٹے لکھتا ہوں۔ مزے کی بات ہے کہ میرا لکھا ہوا میرا حال باور نہیں، اور کسی نے جو کہہ دیا کہ غالبؔ کے پاؤں کا ورم اچھا ہو گیا اور اب وہ شراب دن کو بھی پیتا ہے تو حضور نے ان باتوں کو یقین جانا: بیس برس آگے یہ بات تھی کہ ابروباراں میں یا پیش از طعامِ چاشت یا قریبِ شام تین گلاس پی لیتا تھا اور شرابِ شبانہ، معمولی میں مجرا نہ لیتا تھا۔ اس بیس برس میں بیس برساتیں ہوئیں، بڑے بڑے مینہہ برسے، پینا یک طرف دل میں بھی خیال نہ گزرا بلکہ رات کی شراب کی مقدار کم ہو گئی ہے پاؤں کا ورم حد سے زیادہ گزر گیا۔ مادہ تحلیل کے قابل نہ نکلا، کھولن شروع ہو گئی۔ حکما جو دو تین یہاں ہیں، اُن کی رائے کے مطابق کل سے نیب کا بھرتا بندھے گا۔ وہ پکا لائے گا، تب اُس کو پھوڑنے کی تدبیر کی جائے گی، تلوا زخمی، پنڈلی زخمی، اگر وہ نامردِ بے درد جھوٹا ہے تو اُس پر ہزار لعنت اور اگر میں جھوٹا ہوں تو مجھ پر سو ہزار لعنت۔

۵ جولائی ۱۸۶۳ء

(۱۰۱)

مرزا تفتہ!

یہ غلطی تمھارے کلام میں کبھی نہیں دیکھی تھی کہ شعر ناموزوں ہو۔ بڑی قباحت یہ کہ "اعمّ" بہ تشدید لفظ عربی ہے:

"دیگر نتواں گفت اخص راکہ اعم است"

مگر بحر اور ہو جاتی ہے۔ مانا کہ فارسی نویسانِ عجم نے یوں بھی لکھا ہو، کاف کے اسقاط کی کیا توجیہ کرو گے؟ اور پھر اس صورت میں بھی تو بحر بدل جاتی ہے۔ ناچار، اس شعر کو نکال ڈالو۔ ہمیں نے تمھیں قصائد لکھنے کو کہا تھا، اب ہم منع کرتے ہیں کہ عاشقانہ قصائد نہ لکھا کرو۔ مدح بہ شرطِ ضرورت لکھو، مگر بہ فکر و غور۔

۱۶ جولائی ۱۸۶۳ء

غالب

(۱۰۲)

پیچ ہے اگر آپ اُستاد کا مصرع نہ لکھتے تو میں "بروے استادِن رنگ" کو کہاں سے سمجھتا؟:

بہ از من نصیحت گرے بایدت
ندانم پس از من چہ پیش آیدت

میں نے جو لکھا کہ میں اچھا ہوں، اُس کو آپ سچ سمجھ کر خدا کا شکر بجا لائے۔ وہ جو میں نے لکھا تھا کہ شدّتِ مرض کا بیان مبالغۂ شاعرانہ ہے، اُس کو بھی آپ نے سچ جانا ہوگا۔ حال آں کہ یہ دونوں کلمے ازراہِ طنز تھے۔ میں جھوٹ سے بیزار ہوں اور جھوٹے کو ملعون جانتا ہوں۔ کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ جب تم نے کسی طرح بیانِ واقعی کو باور نہ کیا، تو میں نے تمھیں لکھ بھیجا کہ اچھا ہوں۔ اور یہ کلمہ تمھیں میں نے جب لکھا ہے کہ عہد کر لیا ہے کہ جب تک دم میں دم اور ہاتھ میں جنبشِ قلم ہے، جب تک موقعِ اصلاح خیال

میں آسکتا ہے؛ آج جو تمھارا دفتر پہنچے گا، اُس کو کل روانہ کر دیا کروں گا۔

مجملاً حال میرا یہ ہے کہ قریب بہ مرگ ہوں۔ دونوں ہاتھوں میں پھوڑے، پاؤں میں ورم۔ نہ وہ اچھے ہوتے ہیں نہ یہ رفع ہوتا ہے۔ بیٹھ نہیں سکتا، لیٹے لیٹے لکھتا ہوں۔ کل تمھارا دو ورقہ آیا۔ آج صبح کو لیٹے لیٹے اُس کو دیکھ کر تمھیں بھجوایا۔ زنہار تم مجھے تندرست سمجھے جاؤ اور دفتر کے دفتر بھیجتے رہو، ایک دن سے زیادہ توقف نہ کروں گا۔ قریبِ مرگ ہوں تو بلا سے۔

صبح پنجشنبہ ۲۳ جولائی ۱۸۶۳ء غالب

(۱۰۴)

صاحب:

"کشیدن" کی جگہ "درکشیدن" و "برکشیدن" بلکہ "برکشیدن" کی جگہ "درکشیدن" نہ چاہیے۔ "برآمدن" و "درآمدن" کا استعمال بعض متاخرین نے عام کر دیا ہے، یعنی "درآید" سے "برآید" کے معنی لیے ہیں؛ لیکن "درکشیدن" اور ہے اور "کشیدن" اور۔

میں قریب بہ مرگ ہوں۔ پاؤں کے ورم نے اور ہاتھ کے پھوڑے نے مار ڈالا ہے۔ باور کرنا اور میرے سب آدمی، بلکہ بعض دوست جو روز آتے ہیں، وہ بھی گواہ ہیں کہ میں صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک پڑا رہتا ہوں۔ خطوط کی تحریر لیٹے لیٹے ہوتی ہے۔ اشعار اصلاح کو بہت جگہ سے آتے تھے، سب کو منع کر دیا۔ ایک رئیس رام پور اور ایک تم، ان کی اصلاح رہ گئی۔

مارچ۔ ستمبر ۱۸۶۳ء

(۱۰۴)

نورِ چشمِ غالب، از خود رفتہ، مرزا تفتہ!

خدا تم کو خوش اور تندرست رکھے۔ نہ دوست بخیل، نہ میں کاذب؛ مگر بہ قولِ میر تقی:

اتفاقات ہیں زمانے کے

بہ ہر حال، کچھ تدبیر کی جائے گی اور اِن شاءاللہ صورتِ وقوع جلد نظر آئے گی۔ تعجب ہے کہ اس سفر میں کچھ فائدہ نہ ہوا:

یا کرم خود نماند در عالم
یا مگر کس دریں زمانہ نکرد

اغنیائے دہر کی مدح سرائی موقوف کرو۔ اشعارِ عاشقانہ بہ طریقِ غزل کہا کرو اور خوش رہا کرو۔

سہ شنبہ ۲۴ نومبر ۱۸۶۳ء
نجات کا طالب۔ غالب

(۱۰۵)

صاحب!

کل پارسل اشعار کا ایک آنے کا ٹکٹ لگا کر اور اُس پر یہ لکھ کر کہ یہ پارسل ہے، خط نہیں ہے، ڈاک میں بھیج دیا۔ ڈاک منشی نے کہا کہ خطوں کے صندوق میں ڈال دو۔ خدمت گار ناخواندہ آدمی، اُس کا حکم بجا لایا اور اُس کو خطوں کے صندوق میں ڈال آیا۔ وہ لفظ کہ یہ خط نہیں ہے، پارسل ہے؛ دست آویزِ معقول ہے۔ اگر وہاں کے ڈاکی تم سے خط کا محصول مانگیں تو تم اُس جملے کے ذریعے سے گفتگو کر لینا۔

مکان، میرے گھر کے قریب، حکیم محمود خاں کے گھر کے نزدیک۔ عطار بھی پاس، بازار بھی قریب۔ ڈھائی روپیے کرایے کو موجود مگر مالک مکان سے یہ وعدہ ہے کہ ہفتہ بھر کسی اور کو نہ دوں گا۔ بعد ایک ہفتے کے اگر تمھارا مسافر نہ آیا تو مجھے اور کرایہ دار کے دینے کا اختیار ہے۔

رام پور کے باب میں مختصرِ کلام یہ ہے کہ نہ میں والیِ رام پور کو لکھ سکتا ہوں، نہ اس نہ لکھنے کی وجہ تم کو لکھ سکتا ہوں۔ اگر کبھی ریل میں بیٹھ کر آجاؤ گے تو زبانی کہہ دوں گا۔

سہ شنبہ ۳ ربیع الثانی و ششم ستمبر ۱۸۶۴ء غالب

(۱۰۶)

بھائی!

تم سچ کہتے ہو کہ بہت مسودے اصلاح کے واسطے فراہم ہوئے ہیں، مگر یہ نہ سمجھنا کہ تمھارے ہی قصائد پڑے ہیں۔ نواب صاحب کی غزلیں بھی اُسی طرح دھری ہوئی ہیں۔ برسات کا حال تمھیں بھی معلوم ہے اور یہ بھی تم جانتے ہو کہ میرا مکان گھر کا نہیں ہے، کرایے کی حویلی میں رہتا ہوں۔ جولائی سے مہینہ شروع ہوا۔ شہر میں سینکڑوں مکان گرے اور مینہ کی نئی صورت، دن رات میں دو چار بار برسے اور ہر بار اس زور سے کہ ندی نالے بہ نکلیں۔ بالاخانے کا جو دالان میرے بیٹھنے اُٹھنے، سونے جاگنے، جینے مرنے کا محل ہے، اگرچہ گرا نہیں، لیکن چھت چھلنی ہوگئی۔ کہیں لگن، کہیں چلمچی، کہیں اُگالدان رکھ دیا۔ قلم دان، کتابیں اُٹھا کر توشے خانے کی کوٹھری میں رکھ دیے۔ مالک مرمت کی طرف متوجہ نہیں۔ کشتیِ نوح میں تین مہینے رہنے کا اتفاق

ہوا، اب نجات ہوئی ہے۔ نواب صاحب کی غزلیں اور تمھارے قصائد دیکھے جائیں گے۔

میر بادشاہ میرے پاس آئے تھے، تمھاری خیر و عافیت اُن سے معلوم ہوئی تھی۔ میر قاسم علی صاحب مجھ سے نہیں ملے۔ پرسوں سے نواب مصطفیٰ خاں صاحب یہاں آئے ہوئے ہیں۔ ایک ملاقات اُن سے ہوئی ہے۔ ابھی یہیں رہیں گے، بیمار ہیں۔ احسن اللہ خاں معالج ہیں۔ فصد ہو چکی ہے، جونکیں لگ چکی ہیں، اب مسہل کی فکر ہے۔ سوا اس کے سب طرح کی خیر و عافیت ہے۔ میں ناتواں بہت ہو گیا ہوں، گویا صاحبِ فراش ہوں۔ کوئی شخص نیا، تکلف کی ملاقات کا، آ جائے تو اُٹھ بیٹھتا ہوں، ورنہ پڑ رہتا ہوں)۔ لیٹے لیٹے خط لکھتا ہوں، لیٹے لیٹے مسودات دیکھتا ہوں۔ اللہ۔ اللہ۔ اللہ۔

صبح جمعہ ۱۴ ماہ اکتوبر ۱۸۶۴ء

۱۰۷

منشی صاحب!

میں سالِ گذشتہ بیمار تھا۔ بیماری میں خدمتِ احباب سے متقصر نہیں رہا۔ اب مردہ ہوں، مردہ کچھ کام نہیں کر سکتا۔ کمشنر و ڈپٹی کمشنر وغیرہ حکامِ شہر سے ترکِ ملاقات ہے۔ مگر ڈپٹی کلکٹر شہر سے، کہ وہ مہتمم خزانہ ہے، ہر مہینے میں ایک بار ملنا ضرور ہے۔ اگر نہ ملوں، تو مختار کار کو تنخواہ نہ ملے۔ ڈکرو ور صاحب ڈپٹی کلکٹر چھ مہینے کی رخصت لے کر پہاڑ پر گئے۔ اُن کی جگہ ریٹی گن صاحب مقرر ہوئے، اُن سے ناچار ملنا پڑا۔ وہ تذکرہ، شعرائے ہند کا انگریزی میں لکھتے ہیں، مجھ سے بھی اُنھوں نے مدد چاہی۔ میں نے سات کتابیں بھائی ضیاء الدین خاں صاحب سے منگوا کر اُن کے پاس بھیج دیں۔ پھر اُنھوں نے مجھ سے کہا کہ جن شعرا کو تو اچھی طرح جانتا ہے اُن کا حال لکھ بھیج۔ میں نے سولہ آدمی لکھ بھیجے بہ قید

اس کے کہ اب زندہ موجود ہیں اور اُس سواد کی صورت یہ ہے:

نواب ضیاء الدین احمد خاں بہادر رئیس لوہارو فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ فارسی میں نیّر اور اُردو میں رخشاں تخلص کرتے ہیں، اسد اللہ خاں غالب کے شاگرد۔ نواب مصطفیٰ خاں بہادر علاقہ دارِ جہاں گیر آباد، اُردو میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی تخلص کرتے ہیں۔ اُردو میں مومن خاں کو اپنا کلام دکھاتے تھے

منشی ہرگوپال، معزز قانون گو سکندر آباد کے، فارسی شعر کہتے ہیں تفتہ تخلص کرتے ہیں۔ اسد اللہ خاں غالب کے شاگرد۔ ظاہر ا بعد اس فہرست کے بھیجنے کے انھوں نے کچھ اپنے منشی سے تم کو لکھوایا ہوگا، پھر کچھ آپ لکھا ہوگا۔ مجھ کو اس حال سے کچھ اطلاع نہیں۔ تمھارے خط کی رُو سے میں نے اطلاع پائی۔ اب میں مولوی مظہر الحق، اُن کے منشی کو بلواؤں گا اور سب حال معلوم کروں گا۔ اصل یہ ہے کہ تذکرہ انگریزی زبان میں لکھا جاتا ہے، اشعارِ ہندی اور فارسی کا ترجمہ شامل نہ کیا جائے گا، صرف شاعر کا اور اُس کے اُستاد کا نام اور شاعر کے مسکن و موطن کا نام مع تخلص درج ہوگا۔ خدا کرے کچھ تم کو فائدہ ہو جائے۔ ورنہ بہ ظاہر سوائے درج ہونے نام کے، اور کسی بات کا احتمال نہیں ہے۔

ریٹگن صاحب اب عدالتِ خفیفہ کے جج ہو گئے۔ ڈکروڈر صاحب پہاڑ سے آ گئے۔ اپنا کام کرنے لگے۔ ریٹگن صاحب شہر سے باہر دو کوس کے فاصلے پر جا رہے ہیں۔ معہذا جاڑے کا موسم بڑھاپے کا عالم، وہاں تک جانا دشوار، اور پھر کوئی مطلب نکلتا ہوا نظر ہیں نہیں — بہ ہر حال، مولوی مظہر الحق پرسوں یک شنبے کے دن میرے پاس آئیں گے، حال معلوم کر کے اگر میرا جانا یا لکھنا تمھاری فلاح کا موجب ہوگا تو ضرور جاؤں گا۔

غالب

روز جمعہ ۹ دسمبر ۱۸۶۴ء

(۱۰۸)

آؤ مرزا تفتہ، میرے گلے لگ جاؤ، بیٹھو اور میری حقیقت سنو: یک شنبے کو مولوی مظہر الحق آئے تھے، اُن سے سب حال معلوم ہوا۔ پہلا خط تم کو اُن کے بھائی مولوی انوار الحق نے بہ موجب حکم ریٹی گن صاحب کے لکھا تھا۔ پھر ایک خط صاحب نے آپ مسودہ کر کے اپنی طرف سے تم کو لکھا۔ دونوں دیوان تمھارے اور "نشترِ عشق" اور ایک تذکرہ؛ یہ چار کتابیں تمھاری بھیجی ہوئی، اُن کو پہنچیں۔ صاحب تم سے بہت خوش اور تمھارے بہت معتقد ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہم جانتے ہیں، اتنا بڑا شاعر کوئی اور ہندوستان میں نہ ہوگا کہ جو پچاس ہزار بیت کا مالک ہو۔ فائدہ اِس التفات کا یہ کہ تمھارا ذکر بہت اچھی طرح سے لکھیں گے۔ باقی ما بہ خیر، تما بہ سلامت۔ ہاں! ان کے تحت میں پندرہ بیس روپیے مشاہرے کے علاقے ہیں، اگر تمھاری اجازت ہو، تو اس امر میں اُن سے کلام کروں۔

میرا عجب حال ہے، حیران ہوں کہ تمھیں میرا کلام کیوں باور نہیں آتا؟:

گمانِ زیست بوَد بر منت زبیدردی
بدست مرگ، ولے بدتر از گمانِ تو نیست

سامعہ مر گیا تھا، اب باصرہ بھی ضعیف ہو گیا۔ جتنی قوتیں انسان میں ہوتی ہیں، سب مضمحل ہیں۔ حواس سراسر مختل ہیں۔ حافظہ گویا کبھی نہ تھا۔ شعر کے فن سے گویا کبھی مناسبت نہ تھی۔ رئیسِ رام پور سو روپیے مہینا دیتے ہیں؛ سالِ گذشتہ اُن کو لکھ بھیجا کہ اصلاحِ نظم حواس کا کام ہے اور میں اپنے میں حواس نہیں پاتا، متوقع ہوں کہ اِس خدمت سے معاف رہوں۔ جو کچھ مجھے آپ کی سرکار سے ملتا ہے، عوضِ خدماتِ سابقہ میں شمار کیجیے تو میں "سکہ[2] بہ" سہی، ورنہ خیرات خوار سہی اور اگر یہ عطیہ بہ شرطِ خدمت ہے تو جو آپ کی مرضی ہے، وہی میری

قسمت ہے۔ برس دن سے آپ کا کلام نہیں آتا۔ فتوحِ مقرری نومبر تک آئی، اب دیکھیے آگے کیا ہوتا ہے؟ آج تک نواب صاحب ازراہِ جواں مردی دیے جاتے ہیں۔ اور بھائی، تمھاری مشق، چشمِ بددور، صاف ہو گئی۔ رطب و یابس تمھارے کلام میں نہیں رہا۔ اور اگر خواہی نخواہی تمھارا عقیدہ یہی ہے کہ اصلاح ضرور ہے تو میری جان! میرے بعد کیا کرو گے؟۔

میں تو چراغِ دمِ صبح و آفتابِ سرِ کوہ ہوں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

۱۴ رجب سنہ ۱۲۸۱ھ

۱۴ دسمبر سنہ ۱۸۶۴ء

نجات کا طالب، غالب

(۱۰۹)

منشی صاحب سعادت و اقبال نشان منشی ہرگوپال صاحب سلّمہ اللہ تعالیٰ غالب کی دعاے درویشانہ قبول کریں۔

ہم تو آپ کو سکندر آباد، قانون گویوں کے محلے میں سمجھے ہوئے ہیں اور آپ لکھنؤ، راجا مان سنگھ کی حویلی، مطبعِ اودھ اخبار میں بیٹھے ہوئے مدار یا حقہ لکھنؤ کا پی رہے ہیں اور منشی نول کشور صاحب سے باتیں کر رہے ہیں۔ بھلا، منشی صاحب کو میرا سلام کہنا۔ آج یکشنبہ ہے، اخبار کا لفافہ ابھی تک نہیں پہنچا۔ ہر ہفتے تو پنجشنبے، حد جمعے کو پہنچتا تھا۔

مرزا تفتہ کیا فرماتے ہو؟ کیسے ریٹی گن صاحب، کہاں ریٹی گن صاحب! پنجشنبے کے دن، انیس جنوری سنہِ حال کو وہ پنجاب کو گئے۔ ملتان یا پشاور کے ضلع میں کہیں کے حاکم ہوئے ہیں۔ میں اپنی ناتوانی کے سبب اُن کی ملاقاتِ تودیع کو نہیں گیا۔ انوار الحق گھاٹ پر نوکر ہیں، پندرہ روپیے مشاہرہ پاتے ہیں۔ زیادہ زیادہ۔

صبح یکشنبہ ۱۲ فروری سنہ ۱۸۶۵ء

نجات کا طالب غالب

(۱۱۰)

میرزا تفتہ، کہ بپیوستہ بدل جا دارد
ہر کجا ہست، خدایا بسلامت دارش

صاحب!

کئی بار جی چاہا کہ تم کو خط لکھوں مگر متحیر کہ کہاں بھیجوں؟ اب جو تمھارا خط آیا، معلوم ہوا کہ حضرت ابھی لکھنؤ میں رونق افروز ہیں۔ خط نہ بھیجوں تو گنہگار۔ میں نے یہ عرض کیا ہے کہ مجھ میں اصلاح کی مشقت کی طاقت نہیں رہی، معہذا تمھارا کلام پختگی کو پہنچ گیا ہے، اصلاح طلب نہیں رہا ہے۔ شیر اپنے بچے کو ایک مدت تک آئینِ شکار سکھاتا ہے؛ جب وہ جوان ہو جاتا ہے تو خود بے اعانتِ شیر شکار کیا کرتا ہے۔ یہ میں نے نہیں کہا کہ تم مجھے اپنے کلام کے دیکھنے سے محروم رکھو۔ جو غزل، قصیدہ لکھا کرو، نہ مسودہ بل ایک نقل اُس کی ضرور مجھ کو بھیجا کرو۔

فروری ۱۸۶۵ء[۱] غالب

(۱۱۱)

مرزا تفتہ! پیر شو و بیاموز۔

تم خوش گو اور زود گو مقرر ہو لیکن جس کو تم تحقیقات کہتے ہو، وہ محض توہمات اور تخیلات ہیں۔ قیاس دوڑاتے ہو، وہ قیاس کہیں مطابق واقع ہوتا ہے، کہیں خلاف۔ عرفی کہتا ہے:

روح را ناشتا فرستادی

یعنی روح کو تو نے بھوکا بھیجا۔ "ناشتا" اُس کو کہتے ہیں جس نے کچھ کھایا نہ ہو۔ ہندی اُس کی: "نہار منہ"۔ تم لکھتے ہو:

کہ عجب ناشتا فرستادی

یعنی غذاے صبح، جیسا کہ ہندی میں مشہور ہے: اُس نے ناشتا ابھی کیا ہے یا نہیں؟ واقفؔ کہتا ہے:

نے محرمِ قفس، نہ بہ دام آشنا شدیم
نفرین کنیم ساعتِ پروازِ خویش را

یہ بھی ہندی کی فارسی ہے: "بری گھڑی" اور "سبھ گھڑی"۔ اہلِ زبان ایسے موقع پر "طالع" لکھتے ہیں:

نفرین کنیم طالعِ پروازِ خویش را

قتیلؔ کہتا ہے:

یک وجب جاے بکوے تو زخوں پاک نبود
کشتہ بر کشتہ تپاں بود، دگر خاک نبود

یہاں "ہیچ نہ بود" کا محل ہے۔ ہندی میں "کچھ نہیں" کی جگہ "خاک نہیں" بولتے ہیں اور پھر صاحبِ "برہانِ قاطع" کا کیا ذکر کرتے ہو، وہ تو ہر لغت کو تینوں حرکتوں سے لکھتا ہے، زیر، زبر، پیش کا تفرقہ منظور نہیں رکھتا ہے۔ لکھتا ہے کہ یوں بھی آیا ہے اور یوں بھی دیکھا ہے۔ جس لغت کو کافِ عربی سے لکھے گا، کافِ فارسی سے بھی بیان کرے گا۔ جس لفظ کو طاے حطی سے لائے گا، تاے قرشت سے بھی ضرور لکھے گا۔ فضلاے کلکتہ کے حاشیے دیکھو کہ وہ اُس کی کیا تحمیق کرتے ہیں۔ "نبیا" "نبوّت" کے مشتقات میں سے ہرگز نہیں۔ "امامن" "امام" کے مشتقات میں سے زنہار نہیں۔ "نبی بخش" کا مخفف "نبیا" اور "امام" کا متعلق اگر مذکر ہے، تو "امامی" اور اگر مونث ہے تو "امامن"۔ طغراؔ نے ہندی لغت کے لانے کا التزام کیا ہے:

وقت آں آمد کہ مینا راگِ ہندی سر کند

اور اساتذہ کو اس کا التزام منظور نہیں مگر کیا کریں؟ گڑگانواں نام ہے ایک گاؤں کا، اس کو کیوں کر بدلیں؟ ہاں "گڑ" بہ راے قرشت کہیں گے۔ لکھنؤ نام ہے ایک شہر کا، وہ "لکنؤ" بغیر ہاے مخلوط کے کہیں گے۔ فی زماننا "چھاپے" کو "چاپ" بولتے ہیں۔ عَرفی "جھگَّڑ" کو "جگَر" بولتا ہے:

آں باد کہ در ہند گر آید، جگر آید

راے ثقیلہ، ہاے مخلوط، تشدید؛ یہ تینوں ثقالتیں مٹا دیں۔ صاحب "برہان قاطع" اِس لفظ کو فارسی بتاتا ہے اور زبان علمی اہل ہند میں بھی اس کو مشترک جانتا ہے؛ اپنے کو رُسوا اور خلق کو گمراہ کرتا ہے:

ہرزہ مشتاب و پے جادہ شناساں بردار
اے کہ در راہِ سخن چوں تو ہزار آمد و رفت

اہلِ ہند میں سواے خسرو دہلوی کے کوئی مُسلم الثبوت نہیں۔ میاں فیضی کی بھی کہیں کہیں ٹھیک نکل جاتی ہے۔ فرہنگ لکھنے والوں کا مدار قیاس پر ہے، جو اپنے نزدیک صحیح سمجھا، وہ لکھ دیا۔ نظامی و سعدی وغیرہ کی لکھی ہوئی فرہنگ ہو، تو ہم اُس کو مانیں۔ ہندیوں کو کیوں کر مُسلم الثبوت جانیں۔ گاے کا بچہ بہ زورِ سحر آدمی کی طرح کلام کرنے لگا، بنی اسرائیل اُس کو خدا سمجھے۔ یہ جھگڑے قصے جانے دو، دو باتیں سُنو: ایک تو یہ کہ "ارغنوں" کو بہ غینِ مضموم میں نے سہو سے لکھا۔ دراصل "ارغَنون" بہ غینِ مفتوح اور مخفف اُس کا "ارغن" اور مبدل منہ "ارگن" ہے۔ دوسرے یہ کہ جب موسوی خاں نے "ایواے" کو "ایوا" لکھا تو اِس لفظ کی صحت میں کچھ تامل نہ رہا۔

رام پور سے اپریل مہینے کا روپیہ اور تعزیت و تہنیت کے خط کا جواب آ گیا۔ آیندہ جو خدا چاہے۔[٢]

یکشنبہ ١٤ مئی ١٨٦٥ء نجات کا طالب غالب

(۱۱۲)

صاحب!

تم نے "تن نن" کا ذکر کیوں کیا؟ میں نے اِس باب میں کچھ لکھا نہ تھا۔ "تن تن" اور "تننا" اصوات ہیں تار کے۔ ہندی و فارسی میں مشترک۔ "نبّیا" اور "امامن" کے لکھنے کو میں نے منع ہرگز نہیں کیا، شوق سے لکھو۔ یہ تم کو سمجھایا تھا کہ "نبیا" "مخفف" "نبی بخش" اور "امامن"، متعلق بہ "امام" ہے۔ مشتقات میں سے اِس کو تصور نہ کرو۔ قاعدہ دانانِ اشتقاق تم پر ہنسیں گے۔

"ایواے" کے جتنے شعر تم نے لکھے ہیں، سب مانع ہیں "ایوا" کے اور سند "ایواے" کی۔ موسوی خاں نے بہ حسبِ ضرورتِ شعر "ایوا" لکھا ہے۔ "تہمتن" بروزنِ "قلمزن" ہے۔ فردوسی نے سو جگہ "شاہنامے" میں "تہمتن" بہ سکون ہاے ہوز لکھا ہے، پس کیا اِس لغت کی دو صورتیں قرار پا گئیں؟ لَاحَولَ وَلَا قُوَّةَ! لغت وہی بہ حرکتِ ہاے ہوز ہے۔

میں نے کس قدر کلام کو طول دیا، صائبؔ کے شعر کی حقیقت شرح و بسط سے لکھی؛ تم نے ہرگز اعتنا نہ کیا۔ "ایوا" کو الگ سمجھے، "مصیبتاہ" کو جدا سمجھے، بھلا میرے قول کو گوزِ شتر سمجھتے ہو؟ نرا "مصیبتاہ" یا "حسرتاہ" "برہانِ قاطع" میں یا "بہارِ عجم" میں ہم کو دکھا دو۔ وہی "واے" ہے کہ جب اِس کے بعد "مصیبتا" یا "حسرتا" یا "ویلا" آتا ہے تو تحتانی کو حذف کر کے "وادیلا" وغیرہ لکھتے ہیں۔ چاہو "اے وادیلا" لکھو، چاہو "وادیلا" لکھو، چاہو آخر میں ہاے ہوز لکھو، جیسا کہ "وامصیبتاہ"، چاہو بے ہاے ہوز "وامصیبتا" اور یہی حال ہے "حسرت" و "درد" و "اسف" و "دریغ" کا۔ جہاں "اے" کے ساتھ "وامصیبتا" پاؤ، وہاں "اے" کو حرفِ ندا اور منادیٰ یعنی "ہم نشیں اور" ہمدم" کو مقدر سمجھو۔ فرہنگ لکھنے

والوں نے اشعارِ قدما میں ترکیبیں دیکھیں، "اپنا قیاس" دوڑا کر اُس کی حقیقت ٹھہرالی کہیں اُن کا قیاس غلط، کہیں صحیح۔ سو اُن میں یہ "دکنی" ایسا کج فہم ہے کہ اُس کا قیاس سو لغت میں شاید دس جگہ صحیح ہو۔ میں نے تو صاف لکھ دیا تھا کہ موسوی خاں کے شعر کی سند پر "ایوا" کو رہنے دو، مگر صائبؔ کے شعر میں "ایوا" کو الگ اور "مصبناہ" کو جُدا نہ سمجھو۔ تمھارے قیاس نے پھر تمھیں کہیں کا کہیں پھینکا اور تم نے بھی کہا کہ صائبؔ نے "ایوا" لکھا ہے۔

آخر مئی ۱۸۶۵ء

نجات کا طالب۔ غالب

(۱۱۳)

میرے مہربان، میری جان، مرزا تفتہ سخن دان!

تمھارا سکندر آباد اور میرے خط کا تمھارے پاس پہنچنا، تمھاری تحریر سے معلوم ہوا۔ زندہ رہو اور خوش رہو۔ میں نثر کی داد اور نظم کا صلہ مانگنے نہیں آیا، بھیک مانگنے آیا ہوں۔ روٹی اپنی گرہ سے نہیں کھاتا، سرکار سے ملتی ہے۔ وقتِ رخصت میری قسمت اور منعم کی ہمت۔ نواب صاحب ازروے صورت، روحِ مجسم اور بہ اعتبارِ اخلاق آیتِ رحمت ہیں، خزانۂ فیض کے تحویلدار ہیں۔ جو شخص دفترِ ازل سے جو کچھ لکھوا لایا ہے، اُس کے پٹنے میں دیر نہیں لگتی۔ ایک لاکھ کئی ہزار روپیے سال غلے کا محصول معاف کر دیا۔ ایک اہل کار پر ساٹھ ہزار کا محاسبہ معاف کیا اور بیس ہزار روپیہ نقد دیا۔ منشی نول کشور کی عرضی پیش ہوئی خلاصہ عرضی کا سُن لیا؛ واسطے منشی صاحب کے کچھ عطیہ بہ تقریبِ شادی صبیہ تجویز ہو رہا ہے، مقدار مجھ پر نہیں کھُلی۔

بھائی مصطفیٰ خاں صاحب بہ تقریبِ تہنیتِ مسند نشینی و شمولِ جشن آنے

والے ہیں، اِس وقت تک نہیں آئے۔ جشن یکم دسمبر سے شروع پانچ دسمبر کو خلعت کا آنا مسموع۔

دوشنبہ ۲۸ نومبر ۱۸۶۵ء وقتِ چاشت نجات کا طالب غالب

(۱۱۴)

لو صاحب!

کھچڑی کھائی، دن بہلائے
کپڑے پھاٹے گھر کو آئے

آٹھ جنوری ماہ و سالِ حال، دوشنبے کے دن غضبِ الٰہی کی طرح اپنے گھر پر نازل ہوا۔ تمھارا خط مضامینِ دردناک سے بھرا ہوا 'رام پور' میں نے پایا، جواب لکھنے کی فرصت نہ ملی۔ بعد روانگی کے مراد آباد میں پہنچ کر بیمار ہو گیا۔ پانچ دن صدر الصدور صاحب کے ہاں پڑا رہا۔ انھوں نے بیمار داری اور غم خواری بہت کی۔

کیوں ترکِ لباس کرتے ہو؟ پہننے کو تمھارے پاس ہے کیا جس کو اُتار کر پھینکو گے؟ ترکِ لباس سے قیدِ ہستی مٹ نہ جائے گی۔ بغیر کھائے پیے گزارا نہ ہو گا۔ سختی و سستی، رنج و آرام کو ہموار کر دو۔ جس طرح ہو، اُسی صورت سے، یہ ہر صورت گزرنے دو:

تاب لائے ہی بنے گی غالبؔ
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

جنوری ۱۸۶۶ء

اس خط کی رسید کا طالب
غالب

(۱۱۵)

مرزا تفتہ صاحب!

پرسوں تمھارا دوسرا خط پہنچا۔ تم سے پردہ کیا ہے، ایک فتوح کا منتظر ہوں، اُس میں میں نے اپنے ضمیر میں تم کو شریک کر رکھا ہے۔ زمانہ فتوح کے آنے کا قریب آگیا ہے، اِنشاءاللہ خط میرا مع حصہ فتوح جلد پہنچے گا۔ پنڈت بدری ناتھ یا بدری داس، ڈاک منشی کرنال، باآں کہ مجھ سے اُس سے ملاقاتِ ظاہری نہیں ہے، مگر میں جب جیتا تھا، تو وہ اپنا کلام میرے پاس اصلاح کے واسطے بھیجتا تھا۔ بعد اپنے مرنے کے، میں نے اُس کو لکھ بھیجا کہ اب تم اپنا کلام منشی ہرگوپال تفتہ کے پاس بھیج دیا کرو۔ اب تم کو بھی لکھتا ہوں کہ تم میرے اس لکھنے کی اُن کو اطلاع لکھو۔

میں زندہ ہوں۔ اوپر کے لمبر میں جو اپنے کو مردہ لکھا ہے، وہ بہ اعتبار ترکِ اصلاحِ نظم لکھا ہے؛ ورنہ زندہ ہوں، مردہ نہیں۔ بیمار بھی نہیں۔ بوڑھا، ناتواں، مفلس، قرض دار، کانوں کا بہرہ، قسمت کا بے بہرہ، زیست سے بیزار، مرگ کا اُمیدوار

؁۱۸۶۷ء

غالب

(۱۱۶)

لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ! کس ملعون نے بہ سببِ ذوقِ شعر اشعار کی اصلاح منظور رکھی؟ اگر میں شعر سے بیزار نہ ہوں، تو میرا خدا مجھ سے بیزار۔ میں نے تو بہ طریقِ قہرِ درویش بہ جانِ درویش لکھا تھا۔ جیسے اچھی جورو بُرے خاوند کے ساتھ مرنا بھرنا اختیار کرتی ہے، میرا تمھارا ساتھ وہ معاملہ ہے۔

(۱۱۷)

میاں!

تمھارے انتقالاتِ ذہن نے مارا۔ میں نے کب کہا تھا کہ تمھارا کلام اچھا نہیں؟ میں نے کب کہا تھا کہ دنیا میں کوئی سخن فہم و قدر دان نہ ہوگا؟ مگر بات یہ ہے کہ تم مشقِ سخن کر رہے ہو اور میں مشقِ فنا میں مستغرق ہوں۔ بوعلی سینا کے علم کو اور نظیری کے شعر کو ضائع اور بے فائدہ اور موہوم جانتا ہوں۔ زیست بسر کرنے کو کچھ تھوڑی سی راحت درکار ہے اور باقی حکمت اور سلطنت اور شاعری اور ساحری، سب خرافات ہے۔ ہندوؤں میں اگر کوئی اوتار ہوا تو کیا، اور مسلمانوں میں نبی بنا تو کیا! دنیا میں نام آور ہوئے تو کیا اور گم نام جیے تو کیا! کچھ وجہِ معاش ہو اور کچھ صحتِ جسمانی، باقی سب وہم ہے اے یارِ جانی۔ ہر چند وہ بھی وہم ہے مگر میں ابھی اسی پایے پر ہوں، شاید آگے بڑھ کر یہ پردہ بھی اُٹھ جائے اور وجہِ معیشت اور صحت و راحت سے بھی گزر جاؤں، عالمِ بے رنگی میں گزر پاؤں۔ جس سناٹے میں میں ہوں وہاں تمام عالم بلکہ دونوں عالم کا پتا نہیں۔ ہر کسی کا جواب مطابق سوال کے دیے جاتا ہوں اور جس سے جو معاملہ ہے، اُس کو ویسا ہی برت رہا ہوں لیکن سب کو وہم جانتا ہوں۔ یہ دریا نہیں ہے، سراب ہے۔ ہستی نہیں ہے، پندار ہے۔ ہم تم دونوں اچھے خاصے شاعر ہیں؛ مانا کہ سعدی و حافظ کے برابر مشہور رہیں گے، اُن کو شہرت سے کیا حاصل ہوا کہ ہم کو تم کو ہوگا؟

قطعاتِ تاریخ آگرے کیوں کر بھیجوں؟ پھر تمھارے پاس بھیجتا ہوں۔

"خالقِ معنی" بہ معنیِ "معنی آفریں" صحیح اور مسلّم اور جائز۔ لیکن جس طرح "اللہ" میں مشدّد لام کو دو لام کے قائم مقام قرار دیا ہے، "الٰہ" اور "الٰہی" میں الف ممدودہ کو دوسرا الف کیوں کر سمجھیں؟ قیاس کام نہیں آتا، اتفاقِ سلف شرط ہے۔ جب اور

کسی نے "الٰہی" میں دو الف نہیں مانے، تو ہم کیوں کر مانیں؟

"دویم" بروزنِ "جویم" غلط۔ "دُوم" ہے، بغیرِ تحتانی۔ بالفرض تحتانی بھی لکھیں، تو "دیّم" پڑھیں گے، اگرچہ لکھیں گے "دویم"۔ واؤ کا اعلان ٹکسال باہر ہے۔ ہاں "دومی" درست ہے مگر نہ بہ حذفِ تحتانی مثلِ "زلمی" نہ بہ حذفِ نون بلکہ بہ طریقِ قلبِ بعض "دویم" کا "دومی" ہوگیا۔ کُنوئیں کی تاریخ کو بے تامل بھیج دو اور تاریخ وفات کا اور مادہ سوچو، کس واسطے کہ جب "الٰہی" میں سے ایک الف لیا تو ایک عدد کم ہو جائے گا۔ والدعا۔

روزِ ورودِ نامہ بلکہ وقتِ ورودِ نامہ، بعد خواندن نوشتہ شد۔ یکشنبہ   از غالب

صاحب!

واقعی "سداب" کا ذکر کتبِ طبی میں بھی ہے اور عرفی کے ہاں بھی ہے۔ تمھارے ہاں اچھا نہیں بندھا تھا، اس واسطے کاٹ دیا۔ "قِراب" کون سا لفظ غریب ہے جس کو اس طرح پوچھتے ہو؟ خاقانی کے کلام میں اور اساتذہ کے کلام میں ہزار جگہ آیا ہے۔ "قِراب" اور "سداب" دونوں لغت عربی الاصل صحیح ہیں۔

غالب

(۱۱۹)

حضرت!

اس قصیدے کی جتنی تعریف کروں، کم ہے۔ کیا کیا شعر نکالے ہیں، لیکن افسوس کہ بے محل اور بے جا ہے۔ اس مدح اور اس ممدوح کا بعینہٖ وہ حال ہے کہ ایک مزبلے پر سیب کا یا بِہی کا درخت اُگ جائے۔ خدا تم کو سلامت

رکھے۔ دکانِ بے رونق کے خریدار ہو۔

(۱۲۰)

مرزا تفتہ!

کیا کہنا ہے! نہ ظہیر کا پتا نہ غالب کا۔ مداح شایستۂ صد ہزار آفریں اور ممدوح سزاوارِ صد نفریں۔

(۱۲۱)

میاں!

سنو، اِس قصیدے کا ممدوح شعر کے فن سے ایسا بیگانہ ہے، جیسے ہم تم اپنے اپنے مسائلِ دینی سے بلکہ ہم تم باوجود عدمِ واقفیت امورِ دین سے نفور نہیں اور وہ شخص اس فن سے بیزار ہے۔ علاوہ اِس کے وہ آتالیق کہاں، وہاں سے نکالے گئے، دلّی میں اپنے گھر بیٹھے ہوئے ہیں۔ جب سے آئے ہیں، ایک بار میرے پاس نہیں آئے، نہ میں اُن کے پاس گیا۔ یہ لوگ اس لائق بھی نہیں کہ ان کا نام لیجیے، چہ جائے آں کہ مدح کیجیے۔ ہائے انوریؔ:

اے دریغا! نیست ممدوحے سزادارِ مدیح
اے دریغا! نیست معشوقے سزاوارِ غزل

غالب

(۱۲۲)

دل بسے داغدار بود و نماند
درنظرہا بہار بود و نماند

اگر "بود" کے آگے کے واؤ کو موقوف اور محذوف کردو گے تو ہمارے نزدیک کلام سراسر بلیغ ہو جائے گا۔

میری جان! جو خجالت کہ مجھ کو تم سے ہے، شاید بہ سبب عبادت نہ کرنے کے، قیامت میں خدا سے بھی نہ ہوگی اور بہ سبب خلافِ شرع کرنے کے پیمبر سے بھی نہ ہوگی مگر خدا ہی جانتا ہے جو میرا حال ہے۔

مرگِ ناگاہ کا طالب غالب

(۱۲۳)

حضرت!

اِس غزل میں "پروانہ" و "پیمانہ" و "بُت خانہ" تین قافیے اصلی ہیں۔ "دیوانہ" چوں کہ علم قرار پاکر ایک لغت جداگانہ مشخص ہو گیا ہے، اُس کو بھی قافیۂ اصلی سمجھ لیجیے۔ باقی "غلامانہ" و "مستانہ" و "مردانہ" و "ترکانہ" و "دلیرانہ" و "شکرانہ"؛ سب ناجائز و نامستحسن۔ ایطا اور ایطا بھی قبیح۔ مجھے بہت تعجب ہے کہ انھیں قافیوں میں ایطا کا حال تم کو لکھ چکا ہوں اور پھر تم نے غزل مبنی انھیں قوافی پر رکھی۔ "کاشانہ" و "شانہ" و "افسانہ" و "جانانہ" و "فرزانہ" یہ قافیے کیوں ترک کیے؛ یاد رہے کہ ساری غزل میں "مردانہ" یا "مستانہ" یا ان کے نظائر میں سے ایک جگہ آوے، دوسری بیت میں زنہار نہ آوے۔ یہ غزل نظری ہو گئی اور غزل لکھ کر بھیجو تا اصلاح دی جائے۔

عفو کا طالب غالب

نواب علاء الدین احمد خاں علائی

(۱)

مرزا نسیمی کو دعا پہنچے۔ آنکھ کی گہاجنی جب خود پک کر پھوٹ گئی تھی اور پیپ نکل گئی تھی تو نشتر کیوں کھایا؟ مگر یہ کہ بہ طریقِ خوشامد طبیب سے رجوع کی۔ جب اُس نے نشتر تجویز کیا تو خواہی نہ خواہی امتثالِ امر کرنا پڑا اور شاید یوں نہ ہو، کچھ مادہ باقی ہو، بہ ہر حال، حق تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے شفا بخشے:

قطعہ

بسک فعّال ما یُرید ہے آج　　ہر سلحشور انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے　　زہرہ ہوتا ہے آب، انساں کا
چوک جس کو کہیں، وہ مقتل ہے　　گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دہلی کا ذرّہ ذرّۂ خاک　　تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک　　آدمی واں نہ جاسکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا　　وہی رونا تن و دل وجاں کا

گاہ جل کر کیا کیے شکوہ　　سوزشِ داغ ہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کیے باہم　　ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا
اس طرح کے وصال سے یارب　　کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا

۱۸۵۸ء[۱]

(۲)

آج بدھ کے دن، ۲۷ رمضان کو، پہر دن چڑھے، جس وقت کہ میں کھانا کھا کر باہر آیا تھا، ڈاک کا ہرکارہ تمھارا خط اور شہاب الدین خاں کا خط معاً لایا۔ مضمون دونوں کا ایک۔ واہ کیا مضمون، اِن دنوں میں کہ سب طرح کے رنج و عذاب فراہم ہیں؛ ایک داغِ جگر سوز یہ بھی ضرور تھا۔ سُبحانَ اللہ! میں نے اُس کی صورت بھی نہیں دیکھی یا ولادت کی تاریخ سنی یا اب رحلت کی تاریخ لکھنی پڑی۔ پروردگار تم کو جیتا رکھے اور نعم البدل عطا کرے۔

میاں! اس کو سب جانتے ہیں کہ میں مادۂ تاریخ نکالنے میں عاجز ہوں؛ لوگوں کے مادے دیے ہوئے نظم کر دیتا ہوں اور جو مادہ اپنی طبیعت سے پیدا کرتا ہوں، وہ بیشتر لچر ہوا کرتا ہے، چنانچہ اپنے بھائی[۲] کی رحلت کا مادہ "دریغ دلِوانہ" نکالا۔ پھر اُس میں سے "آہے" کے عدد گھٹائے۔ تمام دوپہر اسی فکر میں رہا، یہ نہ سمجھنا کہ مادہ ڈھونڈھا۔ تمھارے نکالے ہوئے دو لفظوں کو تاکا کیا کہ کسی طرح سات اِس پر بڑھاؤں، بارے ایک قطعہ درست ہوا، مگر تمھاری زبان سے، یعنی گویا تم نے کہا ہے۔ پانچ شعر میں تین شعر زائد، دو موضح مدعا؛ لیکن میں نہیں جانتا کہ تعمیہ اچھا ہے یا بُرا ہے۔ ہاں، اِغلاق تو البتہ ہے۔ تامل سے سمجھ میں آتا ہے اور شاید لوحِ مزار پر کھدوانے کے قابل نہ ہو:

قطعہ

درگریہ اگر دعویِ ہم چشمیِ ما کرد
بینی کہ شود ابرِ بہاری خجل از ما

ناچار بگریم شب و روز کہ ایں سیل
باشد کہ برد کالبدِ آب و گل از ما
گفتی کہ نگہداد دل از کشمکشِ غم
خود کرد بر آورد غمِ جاں گسل از ما
یحییٰ شدو از شعلۂ سوزِ غم ہجرش
چوں شمع دوَد دود بسر متصل از ما
غم دیدہ "نسیمیؔ" پے تاریخِ وفاتش
بنوشت کہ در داغِ پسر سوخت دل از ما

"ما" کے عدد "۴۱"، "دل" کے عدد "۳۴"۔ "ما" میں سے "دل" گیا۔ گویا "۴۱" میں سے "۳۴" گئے۔ باقی رہے سات، وہ "داغِ پسر" پر بڑھائے، ۱۲۷۴ ہاتھ آئے۔

بدھ ۱۱ مئی ۱۸۵۸ء[1]
۲۷ رمضان ۱۲۷۴ھ

(۳)

خاکِ نمناکم و تو بادِ بہار
نہ توانی مرا زجا بردار[2]
ہاں، نسیمی، زمن چہ می خواہی
زحمت خویشتن چہ می خواہی

خوشی مجھ میں تم میں مشترک ہے۔ تم نے مجھے تہنیت دی، تو مبارک، اور میں نے تمھیں تہنیت دی، تو مناسب۔ لِلّٰہِ الحمدُ، لِلّٰہِ الشُّکرُ۔ بھائی سچ تو یوں ہے کہ اِن دنوں میں میرے پاس ٹکٹ نہیں اگر بیرنگ بھیجوں تو کہار ماندہ، اٹھ نہیں سکتا۔ ڈاک گھر تک جائے کون؟ اپنا مقصود تمھارے والد ماجد[3] سے اور تمھاری جدۂ ماجدہ اور تمھارے عمِ عالی مقدار[4] سے

کہ چکا ہوں۔ خلاصہ یہ کہ میری بی بی اور بچوں کو کہ یہ تمھاری قوم کے ہیں، مجھ سے لے لو کہ میں اب اس بوجھ کا متحمل ہو نہیں سکتا۔ انھوں نے بھی بہ شرط ان لوگوں کے لوہارو جانے کے، اس خواہش کو قبول کیا۔ میرا قصد سیاحت کا ہے۔ پنسن اگر کھل جائے گا تو وہ اپنے صرف میں لایا کروں گا۔ جہاں جی لگا، وہاں رہ گیا۔ جہاں سے دل اکھڑا، چل دیا:

تا در میانہ خواستۂ کردگار چیست

دوشنبہ ۱۳ محرم ۱۲۷۵ھ
مطابق ۲۳ اگست ۱۸۵۸ء

غالب

(۴)

سبحان اللہ، ہزار برس تک نہ پیام بھیجنا، نہ خط لکھنا اور پھر لکھنا تو سراسر غلط لکھنا۔ مجھ سے کتاب مستعار مانگتے ہو۔ یاد کرو کہ تم کو لکھ چکا ہوں کہ "دساتیر" اور "برہانِ قاطع" کے سوا کوئی کتاب میرے پاس نہیں۔ ازآں جملہ "برہانِ قاطع" تم کو دے چکا ہوں۔ "دساتیر" میرا ایمان و حرزِ جان ہے۔ اشعارِ تازہ مانگتے ہو، کہاں سے لاؤں؟ عاشقانہ اشعار سے مجھ کو وہ بُعد ہے جو ایمان سے کفر کو۔ گورمنٹ کا بھاٹ تھا، بھٹئی کرتا تھا، خلعت پاتا تھا۔ خلعت موقوف، بھٹئی متروک۔ نہ غزل، نہ مدح۔ ہزل و ہجو میرا آئین نہیں، پھر کہو، کیا لکھوں؟ بوڑھے پہلوان کے سے پیچ بتانے کو رہ گیا ہوں۔ اکثر اطراف و جوانب سے اشعار آجاتے ہیں، اصلاح پا جاتے ہیں، باور کرنا اور مطابق واقع سمجھنا۔ تمھارے دیکھنے کو دل بہت چاہتا ہے اور دیکھنا تمھارا موقوف اس پر ہے کہ تم یہاں آؤ۔ کاش اپنے والد ماجد کے ساتھ چلے آتے اور مجھ کو دیکھ جاتے۔ اُردو کا دیوان رام پور سے لایا ہوں اور وہ آگرے گیا ہے، وہاں منطبع ہوگا۔ ایک نسخہ تمھارے پاس بھی پہنچ جائے گا:

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

مرقومۂ روز دوشنبہ ۲ جولائی ۱۸۶۰ء

(۵)

صاحب!

میری داستان سنیے۔ پنشن بے کم و کاست جاری ہوا۔ زرِ مجتمعۂ سہ سالہ یک مشت مل گیا۔ بعد ادائے حقوق چار سو روپیہ دینے باقی رہے اور ستاسی روپیے گیارہ آنے مجھے بچے۔ مئی کا مہینا بہ دستور ملا۔ آخر جون میں حکم آگیا کہ پنشن دار علی العموم ششماہی پایا کریں، ماہ بہ ماہ پنشن تقسیم نہ ہوا کرے۔

میں دس بارہ برس سے حکیم محمد حسن خاں کی حویلی میں رہتا ہوں اب وہ حویلی غلام اللہ خاں نے مول لے لی۔ آخر جون میں مجھ سے کہا کہ حویلی خالی کر دو۔ اب مجھے فکر پڑی کہ کہیں دو حویلیاں قریب ہم دگر ایسی ملیں کہ ایک محل سرا اور ایک دیوان خانہ ہو، نہ ملیں۔ ناچار یہ چاہا کہ بلی ماروں میں ایک مکان ایسا ملے کہ جس میں جا رہوں، نہ ملا۔ تمھاری چھوٹی پھوپی نے بے کس نوازی کی۔ کروڑا والی حویلی مجھ کو رہنے کو دی۔ ہر چند وہ رعایتِ مرعی نہ رہی کہ محل سرا سے قریب ہو مگر خیر بہت دور بھی نہیں۔ کل یا پرسوں وہاں جا رہوں گا۔ ایک پاؤں زمین پر ہے، ایک پاؤں رکاب میں۔ توشے کا وہ حال۔ گوشے کی یہ صورت۔

کل شنبہ، اٹھارہ ذی الحجہ کی اور سات جولائی کی، پہر دن چڑھے تمھارا خط پہنچا۔ دو گھڑی کے بعد سنا گیا کہ امین الدین خاں صاحب نے اپنی کوٹھی میں نزولِ اجلال کیا۔ پہر دن رہے ازراہِ مہربانی ناگاہ میرے ہاں تشریف لائے۔ میں نے ان کو دبلا و افسردہ پایا، دل کڑھا۔ علی حسین خاں بھی آیا، اُس سے بھی میں ملا۔ میں نے تمھیں پوچھا کہ وہ کیوں نہیں آئے؟ بھائی صاحب بولے کہ جب میں یہاں آیا تو کوئی وہاں بھی تو رہے اور اس سے علاوہ وہ اپنے بیٹے کو بہت چاہتے ہیں۔ میں نے کہا اُتنا ہی جتنا تم اُس کو چاہتے تھے، ہنسنے لگے۔ غرض کہ میں نے بہ ظاہر اُن کو تم سے اچھا پایا۔ آگے تم لوگوں

کے دلوں کا مالک اللہ ہے۔

نگاشتہ و رواں داشتہ یک شنبہ بین الظہر والعصر

۸ جولائی ۱۸۶۰ء[1]   راقم غالب

۱۹ ذی الحجہ ۱۲۷۶ھ

(۶)

مولانا نسیمی کیوں خفا ہوتے ہو۔ ہمیشہ سے اسلاف و اخلاف ہوتے چلے آئے ہیں۔ اگر نیرِ خلیفۂ اول ہے، تم خلیفۂ ثانی ہو۔ اُس کو عمر میں تم پر تقدّم زمانی ہے، جانشیں[2] دونوں مگر ایک اول ہے اور ایک ثانی ہے۔ شیر اپنے بچوں کو شکار کا گوشت کھلاتا ہے طریقِ صیدِ[3] افگنی سکھاتا ہے۔ جب وہ جوان ہو جاتے ہیں۔ آپ شکار کر کھاتے ہیں۔ تم سخنور ہو گئے، حسنِ طبع خداداد رکھتے ہو۔ ولادتِ فرزند کی تاریخ کیوں نہ کہو۔ اسمِ تاریخی کیوں نہ نکال لو کہ مجھ پیرِ غم زدہ، دل مردہ کو تکلیف دو؟ علاء الدین خاں تیری جان کی قسم میں نے پہلے لڑکے کا اسمِ تاریخی نظم کر دیا تھا اور وہ لڑکا نہ جیا۔ مجھ کو اس وہم نے گھیرا ہے کہ میری نحوستِ طالع کی تاثیر تھی۔ میرا ممدوح جیتا نہیں۔ نصیر الدین حیدر اور امجد علی شاہ ایک ایک قصیدے میں چل دیے۔ واجد علی شاہ تین قصیدوں کے متحمل ہوئے، پھر نہ سنبھل سکے۔ جس کی مدح میں دس بیس قصیدے کہے گئے، وہ عدم سے بھی پرے پہنچا۔[4] نہ صاحب دوہائی خدا کی میں نہ تاریخِ ولادت کہوں گا نہ نام تاریخی ڈھونڈوں گا۔ حق تعالیٰ تم کو اور تمھاری اولاد کو سلامت رکھے اور عمرِ[5] و دولت و اقبال عطا کرے۔

سنو صاحب! حسن پرستوں کا ایک قاعدہ ہے کہ وہ امرد کو دو چار برس گھٹا[6] کر دیکھتے ہیں۔ جانتے ہیں کہ جوان ہے لیکن بچہ سمجھتے ہیں۔ یہ حال تمھاری قوم کا ہے۔ قسم شرعی کھا کر کہتا ہوں کہ ایک شخص ہے کہ اُس کی عزت اور نام آوری جمہور کے نزدیک ثابت اور متحقق ہے اور تم صاحب بھی جانتے ہو مگر جب تک اُس سے قطع نظر نہ کرو

اور اُس مسخرے کو گمنام و ذلیل نہ سمجھو تو تم کو چین نہ آئے گا۔ پچاس برس سے دلّی میں رہتا ہوں، ہزارہا خط اطراف و جوانب سے آتے ہیں بہت لوگ ایسے ہیں کہ محلہ نہیں لکھتے، بہت لوگ ایسے ہیں کہ محلۂ سابق کا نام لکھ دیتے ہیں۔ حکام کے خطوط فارسی اور انگریزی یہاں تک کہ ولایت کے آئے ہوئے صرف شہر کا نام اور میرا نام، یہ سب مراتب تم جانتے ہو اور اُن خطوط کو تم دیکھ چکے ہو اور پھر مجھ سے پوچھتے ہو کہ اپنا مسکن بتا۔ اگر میں تمھارے نزدیک امیر نہیں، نہ سہی، اہلِ حرفہ میں سے بھی نہیں ہوں کہ جب تک محلہ اور تھانہ نہ لکھا جائے، ہرکارہ میرا پتا نہ پائے۔ آپ صرف دہلی لکھ کر میرا نام لکھ دیا کیجیے، خط کے پہنچنے کا میں ضامن۔

پنجشنبہ ۴ ماہِ اپریل ۱۸۶۱ء

(۷)

میری جان!

تخلص تمھارا بہت پاکیزہ اور میرے پسند ہے۔ "پشمی" کو بہ تکلف اس کا مصحف کیوں ٹھہراؤ؟ یہ میدان تو بہت فراخ ہے۔ خدا کی "خے" کو جیم فارسی سے بدل دو۔ نبی کو بہ تقدیم موحدہ علی النون لکھو۔ یہ وساوس دل سے دور کرو۔ "رہرو" ایک اچھا تخلص ہے، "رہڑو" اُس کی تجنیس موجود ہے۔ "شیون" ایک اچھا تخلص ہے، "ستون" اُس کی تصحیف ہے۔ تمھارے واسطے بہ مناسبتِ اسم "عالی" تخلص خوب تھا مگر اس تخلص کا ایک شاعر بہت بڑا نامی گزر چکا ہے۔ ہاں "نامی" "سامی" یہ دو تخلص بھی اچھے ہیں۔ مولانا فائق کی پیروی کرو، مولانا "لائق" کہلاؤ۔ اگر کہو گے کہ اس ترکیب سے لفظ "نالائق" پیدا ہوتا ہے، مولانا "شائق" بن جاؤ۔ ہنسی کی باتیں ہو چکیں۔ اب حقیقتِ واجبی سنو، "نسیمی" تخلص "خماسی" بروزنِ ظہوری و نظیری اچھا ہے، اگر بدلنا ہی منظور ہے تو "نامی" "سامی" "رہرو" "شیون" یہ چار تخلص رباعی بروزن عرفی و غالب اچھے ہیں۔ اِن میں سے ایک تخلص قرار دو، میرے نزدیک سب سے بہتر تمھارے

واسطے خاص "فخری" تخلص ہے، کہو گے کہ آزاد پور کے باغ میں ایک آم کا نام "فخری" ہے، حاصلِ کلام دو دن کی فکر میں جو تخلص میرے خیال میں آئے، وہ آج لکھ بھیجتا ہوں، بھائی "موبد" تخلص نیا ہے اگر یہ پسند آئے تو یہ رکھو۔ والدعا۔

صبح یکشنبہ ۱۲ مئی ۱۸۶۱ء نجات کا طالب غالب

(۸)

میری جان، علائی ہمہ دان!

اس دفعِ دخلِ مقدر کا کیا کہنا ہے! "فرہنگ لغات دساتیر" تمھارے پاس ہے، میں چاہتا تھا کہ اُس کی نقل تم سے منگاؤں۔ تم نے "دساتیر" مجھ سے مانگی۔ اُسی صحیفۂ مقدس کی قسم کہ وہ میرے پاس نہیں ہے۔ جی میں کہو گے کہ اگر "دساتیر" نہیں تو فرہنگ کی خواہش کیوں ہے؟ حق یوں ہے کہ بعض لغات کے اعراب یاد نہیں، اس واسطے فرہنگ کی خواہش ہے۔ اگر اُس فرہنگ کی نقل بھیج دو گے تو مجھ پر احسان کرو گے۔ "دساتیر" میرے پاس ہوتی تو آج اس خط کے ساتھ اُس کا بھی پارسل بھیج دیتا۔ ہاں صاحب، اگر "دساتیر" ہوتی اور میں بھیج دیتا تو البتہ بھائی صاحب کا مشکور ہوتا، دین و دنیا میں کیوں ماجور ہوتا؟ ارسالِ اہدا پر حصولِ اجر کیوں مترتب ہو گیا؟ بھائی وہ مذہب اختیار کیا چاہتے ہیں اور تم اُس مذہب کو حق جانتے ہو کہ میں جو واسطہ اس کے اعلان و شیوع کا ہوتا تو عنداللہ مجھ کو استحقاق اجر پانے کا پیدا ہوتا۔ اپنے باپ کو سمجھاؤ اور ایک شعر میرا اور ایک شعر حافظ کا اور ایک شعر مولوی روم کا سناؤ:

غالب

دولت بہ غلط نبود از سعی پشیماں شو
کافر نہ توانی شد، ناچار مسلماں شو

حافظ جنگِ ہفتاد و دو ملّت ہمہ را عذر بنہ
چوں ندیدند حقیقت، رہِ افسانہ زدند

مولانا   مذہب عاشق ز مذہب ہا جدا است
عاشقاں را مذہب و ملّت خدا است

رات کو خوب مینہہ برسا ہے، صبح کو تھم گیا ہے، ہوا سرد چل رہی ہے، ابر تنک چھا رہا ہے۔

یقین ہے کہ تمھاری جدہ ماجدہ مع اپنی بہو اور پوتے کے روانۂ لوہارو ہوں، کل آج کی روانگی کی خبر تھی۔ یہ لڑکا سعیدِ ازلی ہے۔ ابر کا محیط ہونا اور ہوا کا سرد ہو جانا خاص اس کی آسایش کے واسطے ہے۔ میرا منظر سرِ راہ ہے؛ وہاں بیٹھا ہوا یہ خط لکھ رہا ہوں۔ محمد علی بیگ ادھر سے نکلا۔

بھئی محمد علی بیگ، لوہارو کی سواریاں روانہ ہو گئیں۔؟

حضرت ابھی نہیں۔

کیا آج نہ جائیں گی؟

آج ضرور جائیں گی، تیاری ہو رہی ہے۔

مرقومۂ شنبہ یکم جون وقتِ صبح چھے بجے سات کے عمل میں ۱۸۶۱ء[۲]   غالب

(۹)

جانِ غالب!

یاد آتا ہے کہ تمھارے عمِ نامدار سے سنا ہے کہ "لغاتِ دساتیر" کی فرہنگ وہاں ہے، اگر ہوتی تو کیوں نہ تم بھیج دیتے، خیر:

آنچہ ما در کار داریم، اکثرے درکار نیست

تم ثمرِ نورس ہو اُس نہال کے کہ جس نے میری آنکھوں کے سامنے نشو و نما پائی ہے اور میں ہوا خواہ و سایہ نشیں اُس نہال کا رہا ہوں کیوں کر تم مجھ کو عزیز نہ ہو گے۔ رہی دید وادید، اُس کی دو صورتیں، تم دلی میں آؤ یا میں لوہارو آؤں۔ تم مجبور، میں معذور۔ خود

کہتا ہوں کہ میرا عذر زنہار مسموع نہ ہو، جب تک نہ سمجھ لو کہ میں کون ہوں اور ماجرا کیا ہے۔ سنو عالم دو ہیں: ایک عالمِ ارواح اور ایک عالمِ آب و گِل۔ حاکم ان دونوں عالموں کا وہ ایک ہے جو خود فرماتا ہے لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ اور پھر آپ جواب دیتا ہے لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ہرچند قاعدۂ عام یہ ہے کہ عالمِ آب و گِل کے مجرم عالمِ ارواح میں سزا پاتے ہیں لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالمِ ارواح کے گنہگار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ میں آٹھویں رجب ١٢١٢ھ میں روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا[٣]۔ ١٣ برس حوالات میں رہا۔ ٧ رجب[٤] ١٢٢٥ھ کو میرے واسطے حکمِ دوام حبس صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلی شہر کو زنداں مقرر کیا اور مجھے اس زنداں میں ڈال دیا۔ فکر[٥] نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا۔ برسوں کے بعد میں جیل[٦] خانے سے بھاگا۔ تین برس بلادِ شرقیہ میں پھرتا رہا۔ پایانِ کار مجھے کلکتے سے پکڑ لائے اور پھر اسی محبس میں بٹھا دیا۔ جب دیکھا کہ یہ قیدی گریزپا ہے، دو ہتھکڑیاں اور بڑھا دیں۔ پاؤں بیڑی سے فگار، ہاتھ ہتھکڑیوں سے زخم دار، مشقتِ مقرری اور مشکل ہو گئی، طاقت یک قلم زائل ہو گئی۔ بے حیا ہوں، سالِ گذشتہ بیڑی کو زاویۂ زنداں میں چھوڑ مع دونوں ہتھکڑیوں کے بھاگا۔ میرٹھ، مرادآباد ہوتا ہوا رام پور پہنچا، کچھ دن کم دو مہینے وہاں رہا تھا کہ پھر پکڑا آیا۔ اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگوں گا بھاگوں کیا۔ بھاگنے کی طاقت بھی تو نہ رہی۔ حکمِ رہائی دیکھیے کب صادر ہو۔ ایک ضعیف سا احتمال ہے کہ اسی ماہ ذی الحجہ ١٢٧٧ھ[٩] میں چھوٹ جاؤں۔ بہ ہر تقدیر، بعد رہائی کے تو آدمی سوائے اپنے گھر کے اور کہیں نہیں جاتا۔ میں بھی بعد نجات سیدھا عالمِ ارواح کو چلا جاؤں گا:

فرخ آں روز کہ از خانۂ زنداں بروم
سوے شہرِ خود ازیں وادیِ ویراں بروم

گانے میں غزل کے سات شعر کافی ہوتے ہیں۔ دو فارسی غزلیں دو اُردو غزلیں اپنے

حافظے کی تحویل میں سے بھیجتا ہوں بھائی صاحب کی نذر:

غزل

از جسم بہ جاں نقاب تا کے
ایں گنج دریں خراب تا کے
ایں گوہر پُر فروغ، یارب
آلودۂ خاک و آب تا کے
ایں راہروِ مسالک قدس
واماندۂ خورد و خواب تا کے
بیتابیِ برق جز دمے نیست
ما و یں ہمہ اضطراب تا کے
جان در طلبِ نجات تا چند
دل در تعبِ عتاب تا کے
پرسش زِ تو بے حساب باید
غم ہاے مرا حساب تا کے
غالب بہ چنیں کشاکش اندر
یا حضرتِ بوتراب تا کے

دوش کز گردشِ بختم گلہ بر روے تو بود
چشمم سوے فلک و روے سخن سوے تو بود
آنچہ شب شمع گماں کردی و رفتی بہ عتاب
نفسم پردہ کشاے اثرِ خوے تو بود

چہ عجب صانع اگر نقشِ دہانت گم کرد
کوئے خود از حیرتیانِ رخِ نیکوے تو بود
بہ کفِ باد مباد ایں ہمہ رسوائیِ دل
کاخر از پردگیانِ شکنِ موے تو بود
مردن و جان بہ تمناے شہادت دادن
ہم زِ اندیشۂ آزردنِ بازوے تو بود
دوست دارم گرہے را کہ بکارم زدہ اند
کایں ہمانست کہ پیوستہ در ابروے تو بود
لالہ و گل دمد از طرف مزارش پسِ مرگ
تا چہا در دل غالب ہوس روے تو بود

ہے بس کہ ہر اک اُن کے اشارے میں نشاں اور
کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور
لوگوں کو ہے خُورشیدِ جہاں تاب کا دھوکا
ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغِ نہاں اور
ہے خونِ جگر جوش میں، دل کھول کے روتا
ہوتے جو کئی دیدۂ خوننابہ فشاں اور
یارب! نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے میری بات
دے اور دل اُن کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور
تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم، جب اٹھیں گے
لے آئیں گے بازار سے جاکر دل و جاں اور

مرتا ہوں اِس آواز پہ ہر چند سر اڑ جائے
جلّاد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ ہاں اور
ہیں اور بھی دُنیا میں سخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور

اُس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے
بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کیے
ضد کی ہے اور بات، مگر خُوبری نہیں
بھُولے سے اُس نے سینکڑوں وعدے وفا کیے
صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خُو
دینے لگا ہے بوسے بغیر التجا کیے
رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجادہ رہنِ مے
مدت ہوئی ہے دعوتِ آب و ہوا کیے
کس روز تہمتیں نہ تراشا کیے عدو
کِس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کیے
غالبؔ تمھیں کہو کہ ملے گا جواب کیا
مانا کہ تم کہا کیے اور وہ سُنا کیے

ماہ ذی الحجہ ۱۲۷۷ھ
جون ۱۸۶۱ء

(۱۰)

علائیؑ مولائیؑ!

اِس وقت تمھارا خط پہنچا۔ اِدھر پڑھا، اُدھر جواب لکھا۔ واہ، کیا کہنا ہے، رام پور کے علاقے کو گاؤ شنگ اور مجھ کو بیل یا اُس پیوند کے طعنے کو تازیانہ اور مجھ کو گھوڑا بنایا۔ وہ علاقہ اور وہ پیوند لوہارو کے سفر کا مانع و مزاحم کیوں ہو؟ رئیس[2] کی طرف سے بہ طریقِ وکیل محکمۂ کمشنری میں معین نہیں ہوں۔ جس طرح امرا واسطے فقرا کے وجہِ معاش مقرر کر دیتے ہیں۔ اسی طرح اُس سرکار سے میرے واسطے مقرر ہے۔ ہاں فقیر سے دعاے خیر اور مجھ سے اصلاحِ نظم مطلوب ہے۔ چاہوں دلّی رہوں، چاہوں اکبر آباد، چاہوں لاہور، چاہوں لوہارو۔

ایک گاڑی کپڑوں کے واسطے کرایہ کروں، کپڑوں کے صندوق میں آدھی درجن شراب دھروں، آٹھ کہار ٹھیکے کے لوں۔ چار آدمی رکھتا ہوں، دو یہاں چھوڑوں، دو ساتھ لوں، چل دوں۔ رام پور سے جو لفافہ آیا کرے گا، لڑکوں کا حافظ لوہارو بھجوایا کرے گا۔ گاڑی ہو سکتی ہے، شراب مل سکتی ہے، کہار بہم پہنچ سکتے ہیں۔ طاقت کہاں سے لاؤں؟ روٹی کھانے کو، باہر کے مکان میں سے محل سرا میں کہ وہ بہت قریب ہے، جب جاتا ہوں تو ہندوستانی گھڑی بھر میں دم ٹھہرتا ہے اور یہی حال دیوان خانے میں آکر ہوتا ہے۔ والیِ رام پور نے بھی تو مرشد[3] زادے کی شادی میں بلایا تھا۔ یہی لکھا گیا کہ میں اب معدومِ محض ہوں، تمھارا اقبال تمھارے کلام کو اصلاح دیتا ہے۔ اس سے بڑھ کر مجھ سے خدمت نہ چاہو۔

بھائی کے اور تمھارے دیکھنے کو جی بہت چاہتا ہے پر کیا کروں، عقرب و قوس کے آفتاب یعنی نومبر دسمبر میں قصد تو کروں گا، کاش لوہارو کی جگہ گوڑگانوہ ہوتا یا بادشاہ پور ہوتا۔ کہو گے کہ رام پور کیا نزدیک ہے؟ وہاں گئے کو دو برس ہو گئے۔ یہاں انحطاط و اضمحلال روز افزوں، نہ تم یہاں آ سکتے ہو نہ مجھ میں وہاں آنے کا دم۔ بس اگر نومبر دسمبر میں میرا اخیر[4] حملہ چل گیا بہتر، ورنہ:

اے وائے ز محرومیِ دیدار دگر ہیچ

چار شنبہ ۲۵ ستمبر ۱۸۶۱ء ۵

غالب

من الغالب الی العلائی

صاحب آگ برستی ہے کیونکر آگ میں گر پڑوں مہینا ڈیڑھ مہینا اور صبر کرو شہریور و مہر گذرنے دو بہتر ہے آبان و آذر میں بشرط حیات قصد کرونگا یہ چند ورق یوسف مرزا نے از روے دہلی اردو اخبار کاتب سے لکھوا رکھے تھے اور میرے پاس بھیجے ہوئے تھے ناقہ کو دیتا ہوں وہ کسی آدمی کے ہات تمکو بھیجدیگا اور تم میری طرف سے میری بجائے اپنے والد ماجد کو دینا جب وہ تمہارا دیکھا کرینگے تو کچھ منت کے دل لگی کو یہ اشعار مکتفی ہو جائینگے یہ سطریں جواب میں نہیں تمہارے اس خط کے کہ جو آج اسوقت ڈاک سے میں نے پایا ہے نیمروز دوشنبہ ۲۴ ربیع الاول سنہ ۱۲۷۸ مطابق ۳۰ ستمبر سنہ ۱۸۶۱ غ

(۱۱)

(من الغالب الی العلائی)

صاحب!

آگ برستی ہے، کیوں کر آگ میں گر پڑوں؟ مہینا ڈیڑھ مہینا اور چپکے رہو، دے و بہمن بہت دور ہے۔ آبان و آذر میں بہ شرطِ حیات قصد کروں گا۔

یہ چند ورق یوسف مرزا نے از روے "دہلی اردو اخبار" کاتب سے لکھوا رکھے تھے اور میرے پاس پڑے ہوئے تھے۔ ثاقب کو دیے تاکہ وہ کسی آدمی کے ہاتھ تم کو بھیج دے اور تم میری طرف سے میرے بھائی اور اپنے والد ماجد کو دو۔ جب اٹھا کر دیکھا کریں گے تو کئی منٹ کی دل لگی کو یہ اشعار مکتفی ہو جائیں گے۔ یہ سطریں جواب میں ہیں تمھارے اُس خط کے، کہ جو آج اِس وقت ڈاک سے میں نے پایا ہے۔

نیم روز دو شنبہ ۲۴ ربیع الاول ۱۲۷۸ھ

مطابق ۳۰ ستمبر ۱۸۶۱ء

(۱۲)

میری جان!

کیا کہتے ہو؟ کیا چاہتے ہو؟ ہوا ٹھنڈی ہو گئی، پانی ٹھنڈا ہو گیا، فصل اچھی ہو گئی، اناج بہت پیدا ہو گیا۔ توقیعِ جانشینی مجھ سے تم کو پہنچا، خرقہ پایا۔ سبحہ و سجادہ کا یہاں پتا نہیں ورنہ وہ بھی عزیز نہ رکھتا، اس سے بڑھ کر یہ کہ بھائی نے شفا پائی، استاد میر جان پہنچ گئے۔ آخر اکتوبر میں یا آغاز نومبر میں نیرِ رخشاں کو بھی وہیں لو۔ پھر عقرب و قوس کے آفتاب کا کیا ذکر، آبان ماہ و آذر ماہ سے کیا غرض:

بسے تیر و دے ماہ و اُردی بہشت
برآید کہ ما خاک باشیم و خشت

اُستاد میر جان کو اس راہ سے کہ میری پھوپھی اُن کی چچی تھیں اور یہ مجھ سے عمر میں

چھوٹے ہیں دعا، اور اِس رُو سے کہ دوست ہیں اور دوستی میں کم و بیشی سن و سال کی رعایت نہیں کرتے سلام اور اس سبب سے کہ استاد کہلاتے ہیں بندگی اور اِس نظر سے کہ یہ سیّد ہیں درود اور موافق مضمون اِس مصرع کے:

"سوے اللہ واللہ ما فی الوجود"۔ سجود

حضرت، وہ "شرف نامہ" نہیں ہے، کسی احمق نے "شرف نامہ" میں سے کچھ لغات، اکثر غلط، کم تر صحیح، چُن کر جمع کیے ہیں۔ نہ دیباچہ ہے کہ اُس سے جامع کا حال معلوم ہو نہ خاتمہ ہے کہ عہد و عصر کا حال کھلے۔ باں ہمہ میاں ضیاء الدین کے پاس ہے۔ اگر وہ آجائیں گے تو اُن سے کہہ دوں گا۔ اگر وہ لا دیں گے تو ان کو قیمت دے کر علائی مولائی کو بھیج دوں گا۔

خصّی بکروں کے گوشت کے قلیے، دوپیازے، پلاؤ، کباب، جو کچھ تم کھا رہے ہو، مجھ کو خدا کی قسم اگر اُس کا کچھ خیال بھی آتا ہو، خدا کرے بیکانیر کی مصری کا کوئی ٹکڑا تم کو میسّر نہ آیا ہو، کبھی یہ تصور کرتا ہوں کہ میر جان صاحب اُس مصری کے ٹکڑے چبا رہے ہوں گے تو یہاں میں رشک سے اپنا کلیجا چبانے لگتا ہوں۔

سہ شنبہ ۱۵ ماہ اکتوبر ۱۸۶۱ء نجات کا طالب۔ غالب

(۱۳)

آج جس وقت کہ میں روٹی کھانے کو گھر جاتا تھا، شہاب الدین خاں تمھارا خط اور مصری کی تھلیا لے کر آئے، میں اُس کو لوا کر گھر گیا۔ اپنے سامنے مصری تُلوائی، آدھ پا[1] اوپر دو سیر نکلی۔ خانۂ دولت آباد۔ یہی کافی و وافی ہے اور اب حاجت نہیں۔ روٹی کھا کر باہر[2] آیا تمھارے ابن عم کا آدمی جوابِ خط کا متقاضی ہوا کہ شتر سوار جانے والا ہے۔ میں کھانا کھا کر لیٹنے کا عادی ہوں لیٹے لیٹے مصری کی رسید لکھ دی۔ مطالبِ مندرجۂ خط کا جواب بہ شرطِ حیات کل بھیجوں گا۔

چاشتگاہ سہ شنبہ دوازدہم نومبر ۱۸۶۱ء غالب

(۱۴)

مرزا علائی!

پہلے اُستاد میر جان صاحب کے قہر و غضب سے مجھ کو بچاؤ تاکہ میرے حواس جو منتشر ہو گئے ہیں، جمع ہو جائیں۔ میں اپنے کو کسی طرح کے قصور کا مورد نہیں جانتا۔ جھگڑا اُن کی طرف سے ہے۔ تم اُس کو یوں چکاؤ، یعنی اگر اُن کو صرف آشنائی و ملاقات منظور ہے تو وہ میرے دوست ہیں، شفیق ہیں، میرا سلام قبول فرمائیں اور اگر قرابت و رشتہ داری ملحوظ ہے تو وہ میرے بھائی ہیں مگر عمر میں چھوٹے، میری دعا قبول فرمائیں۔

صاحبیںؔ کی رائے کا اختلاف مشہور ہے، مجھ سے کچھ نہیں ہو سکتا مگر یہ کہ ہر ایک قول جدا جدا لکھوں۔ آج نہ لکھا نہ سہی، دو چار دن کے بعد لکھوں گا۔ تم سمجھ تو گئے ہو گے کہ صاحبین مرزا قربان علی بیگ اور مرزا شمشاد علی بیگ ہیں۔

بھائی صاحب کی رضا جوئی مجھ کو منظور اور یہ غزل معروض ہے۔ میری طرف سے سلام کہو:

از من غزلے گیر و بہ فرمائے کہ مطرب
در نے دمد از روئے نوازش دو سہ دم را

غزل

جز دفعِ غم ز باده[۲] نہ بوده[۳] است کامِ ما
گوئی چراغ روز سیاہست جامِ ما

در خلوتش گزر نہ بود باد را مگر
صرصر بہ خاک راہ رساند پیامِ ما

اے بادِ صبح عطرے ازاں پیرہن بیار
تسکیں ز بوئے گل نہ پزیرد مشامِ ما

ہر بار دانہ بہر ہما افگنیم و مور
آید بدام و دانہ رباید ز دامِ ما

گفتی، چو حالِ دل شنود، مہرباں شود
مشکل کہ پیش دوست تواں برد نامِ ما
از ما بہ ما پیام وہم از ما بہ ما سلام
رنجِ دلی مباد پیام و سلام ما
مقصود ما ز دہر ہر آئینہ نیستی ست
یارب کہ ہیچ دوست مبادا بکام ما
غالب بقولِ حضرتِ حافظ ز فیضِ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

جنوری، فروری ۱۸۶۲ء[۱]

(۱۵)

صاحب!

صبح جمعے کو میں نے تم کو خط لکھا، اُسی وقت بھیج دیا۔

پہر دن چڑھے سُنا کہ شب کو پھر دورہ ہوا، گیا[۲]۔ خود اُن سے حال پوچھا۔ علی محمد بیگ کی زبانی یہ معلوم ہوا کہ بہ نسبت دورہ ہاے سابق خفیف تھا اور افاقہ جلد ہو گیا۔

کل مرزا شمشاد علی بیگ ناقل تھے کہ مجھ سے علی حسین خاں کہتے تھے کہ نواب صاحب فرماتے ہیں کہ لوہارو چلو گے اور ہماری دال روٹی قبول کرو گے؟ میں نے کہا کہ میں دال روٹی چاہتا ہوں، مگر پیٹ بھر کے۔ غالب کہتا ہے کہ اس بیان سے یہ معلوم ہوا کہ سالک سے سلوک منظور نہیں، تنہا ہواے شمشاد در سر است[۳]:

رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند
گداے گوشہ نشینی، تو حافظا مخروش

یکشنبہ ۹ فروری ۱۸۶۲ء[۴]

غالب

(١٦)

نیرِ اصغر سپہرِ سخن سرائی، مولانا علائی کے خاطر نشاں و دل نشیں ہو کہ آج صبح کو پانچ یا چھے گھڑی دن چڑھے، دونوں بھائی صاحب تشریف لائے، میں گیا اور ملا۔ علی حسین خاں کو بھی دیکھا، تھوڑی دیر کے بعد بھائی صاحب، والدہ صاحبہ کے پاس گئے۔ میں گھر آیا، کھانا کھایا۔ دوپہر کو تمھارا خط پایا۔ دو گھڑی لوٹ پوٹ کر جواب لکھا اور ڈاک میں بھجوایا۔ یہ مرض جو بھائی کو ہے، اِس راہ سے کہ ضدِ صحت ہے، مکروہِ طبع ہے ورنہ ہرگز موجبِ خوف و خطر نہیں۔ میں تو بھول گیا تھا اب بھائی کے بیان سے یاد آ گیا کہ بارہ تیرہ برس پہلے ایک دن ناگاہ یہ حالت طاری ہو گئی تھی۔ وہ موسم جوانی کا تھا اور حضرت عادی بہ افیون نہ تھے۔ تنقیہ بہ قے فوراً اور بہ اسہال بعد چند روز عمل میں آیا۔ اب سِنِ کہولت، استعمالِ افیون مزید علیہ، دورہ جلد جلد متواتر ہوا۔ اضطراب ازراہِ محبت ہے، ازروے حکمت اضطراب کی کوئی وجہ نہیں۔ نظری ہیں یکتا حکیم امام الدین خاں، وہ ٹونک۔ عملی میں چالاک حکیم احسن اللہ خاں، وہ کرولی رہے۔ حکیم محمود خاں وہ ہمسایۂ دیوار بہ دیوار، حکیم غلام نجف خاں، وہ دوستِ قدیم، صادق الولا؛ حکیم بقا کے خاندان میں دو صاحب موجود، تیسرے حکیم منجھلے، وہ بھی شریک ہو جائیں گے۔ اب آپ فرمائیے، حکیم کون ہے؟ ہاں دو ایک ڈاکٹر، بہ اعتبارِ ہم قومی حکام نامور، یا کوئی ایک آدھ بید، سو منزوی اور گمنام۔ بہ ہر حال، خاطر جمع رکھو، خدا کے فضل پر نظر رکھو۔ سُبحَانَ اللّٰہ! تم مجھ سے سپارش(۳) کرو امین الدین خاں کی، کیا میرے پہلو میں دل یا میرے دل میں ایمان، جس کو محبت بھی کہتے ہیں، بہ قدر پریشہ و سرمو بھی نہیں؟ معالجہ حکما کی راہ پر رہے گا۔ ندیمی اور غم خواری میں اگر قصور کروں، تو گناہگار۔ میاں ایسے موقع میں رائے اطبا میں خلاف کم واقع ہوتا ہے۔ مرض مشخص، دوا معین۔ سوءِ مزاج سازج نہیں، مادی ہے اور مادہ بارد ہے۔ کوئی طبیب سواے تنقیے کے کچھ تدبیر نہ سوچے گا۔ تنقیے میں سواے مخرجاتِ بلغم اور کچھ تجویز نہ کرے گا۔ تجویز ہے کہ دو دن کے بعد تنقیۂ خاص

ہو اور ایارج کا مسہل دیا جائے۔ اسما و آیات شفا بخش مقرر ہیں۔ ردِ سحر و دفعِ بلا ان کے ذریعے سے متصور ہے۔ لیکن ان ملاؤں اور عزائم خوانوں نے تِنّہ توڑ دی ہے کچھ نہیں جانتے اور باتیں بکھانتے ہیں۔ تمھارے باپ پر کوئی سحر کیوں کرے گا، بے چارہ الگ ایک ایسے گوشے میں رہتا ہے کہ جب تک خاص وہاں کا قصد نہ کرے، کبھی کوئی وہاں نہ جائے۔ یہ خیال عبث، ہاں خیرات و مساکین سے طلبِ دعا اور اہلِ اللہ سے استمداد۔ شہر میں مساکین شمار سے باہر، اہل اللہ میں ایک حافظ عبدالعزیز۔ ما بہ خیر، شما بہ سلامت۔

وقت نماز ظہر شنبہ ۱۵ شعبان ۱۲۷۸ھ

۱۵ فروری ۱۸۶۲ء[۱]

نجات کا طالب۔ غالب

دن اور تاریخ اوپر لکھ آیا ہوں

(۱۷)

صاحب!

کل تمھارے خط کا جواب بھیج چکا ہوں، پہنچا ہوگا۔ آج صبح کو بھائی صاحب کے پاس گیا۔ بھائی ضیاء الدین خاں اور میاں شہاب الدین خاں بھی وہیں تھے۔ مولوی صدرالدین میرے سامنے آئے۔ حکیم محمود خاں کے طور پر معالجہ قرار پایا ہے۔ یعنی انھوں نے نسخہ لکھ دیا ہے، سو اُس کے موافق حبوب بن گئی ہیں۔ نقوع کی دوائیں آج آ کر بھیگیں گی۔ کل حبوب کے اوپر وہ نقوع پیا جائے گا مگر انداز و ادا سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی حضرت مریض کی اور اُن کے ہوا خواہوں کی رائے میں قصدِ اس استعلاج کا مذبذب ہے۔ نسخے کی حقیقت کو میزانِ نظر میں تول رہے ہیں۔ استاد میر جان بھی تھے، نیم نامعقول مرزا اسد بیگ بھی تھے۔ سب طرح خیریت ہے۔

کل تمھارے خط میں دو بار یہ کلمہ مرقوم دیکھا کہ دلّی بڑا شہر ہے، ہر قسم کے آدمی وہاں بہت ہوں گے۔ اے میری جان! یہ وہ دلّی نہیں ہے، جس میں تم پیدا ہوئے ہو، وہ دلّی نہیں

ہے جس میں تم نے علم تحصیل کیا ہے، وہ دلی نہیں ہے جس میں تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آتے تھے، وہ دلی نہیں ہے جس میں سات برس کی عمر سے آتا جاتا ہوں، وہ دلی نہیں ہے جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں، ایک کنپ ہے۔ مسلمان اہلِ حرفہ یا حکام کے شاگرد پیشہ، باقی سراسر ہنود۔ معزول بادشاہ کے ذکور جو بقیۃ السیف ہیں، وہ پانچ پانچ روپیہ مہینا پاتے ہیں۔ اناث میں سے جو پیرزن ہیں، وہ کٹنیاں اور جوانیں کسبیاں۔ امرائے اسلام میں سے اموات گنو۔ حسن علی خاں بہت بڑے باپ کا بیٹا، سو روپیے روز کا پنشن دار، سو روپیے ہیہے ہ روزینہ دار بن کر نامرادانہ مرگیا۔ میر ناصر الدین باپ کی طرف سے پیرزادہ، نانا اور نانی کی طرف سے امیرزادہ، مظلوم مارا گیا۔ آغا سلطان، بخشی محمد علی خاں کا بیٹا، جو خود بھی بخشی ہو چکا تھا۔ بیمار پڑا، نہ دوا نہ غذا، انجام کار مرگیا۔ تمھارے چچا کی سرکار سے تجہیز و تکفین ہوئی۔ احیا کو پوچھو، ناظر حسین مرزا، جس کا بڑا بھائی مقتولوں میں آیا، اُس کے پاس ایک پیسا نہیں، ٹکے کی آمد نہیں، مکان اگرچہ رہنے کو مل گیا ہے، مگر دیکھیے، چھٹا رہے یا ضبط ہو جائے۔ بڈھے صاحب ساری املاک بیچ کر، نوش جان کر کے، بہ یک بینی و دو گوش بھرت پور چلے گئے۔ ضیاء الدولہ کی پانسو روپیے کرایے کی املاک واگذاشت ہو کر پھر قرق ہو گئی، تباہ خراب لاہور گیا، وہاں پڑا ہوا ہے، دیکھیے کیا ہوتا ہے، قصہ کوتاہ، قلعہ اور جھجر اور بہادر گڑھ اور بلب گڑھ اور فرخ نگر، کم و بیش تیس لاکھ روپیے کی ریاستیں مٹ گئیں، شہر کی عمارتیں خاک میں مل گئیں۔ ہنرمند آدمی یہاں کیوں پایا جائے۔ جو حکما کا حال کل لکھا ہے وہ بیانِ واقع ہے۔ صلحا اور زہاد کے باب میں جو حرفِ مختصر میں نے لکھا ہے، اُس کو بھی سچ جانو۔

اپنے والد ماجد کی طرف سے خاطر جمع رکھو۔ سحر آسیب کا گمان ہرگز نہ کرو۔ خدا چاہے تو استعمالِ ایارجات کے بعد بالکل اچھے ہو جائیں گے اور اب بھی خدا کے فضل سے اچھے ہیں۔

ہنگام نیم روز یکشنبہ ۱۶ فروری ۱۸۶۲ء عافیت کا طالب۔ غالب

(۱۸)

صاحب!

پرسوں تمھارا خط آیا۔ کل جمعے کے دن نواب کا مسہل تھا گیارہ بجے وہاں سے آیا، چونکہ

حبوب میں مجرّب دوائیں تھیں۔ بہت بے چین رہے آٹھ دس دست آئے۔ آخر روز مزاج بحال ہوگیا تنقیہ اچھا ہوا۔ اب بہ فضلِ الٰہی اچھے ہیں اور یقین ہے کہ مرض عود نہ کرے۔ دلّی کی اقامت کی مدت اپنے والد کی رائے پر رہنے دو۔ بہ قدر مناسب، وقتِ عزم خیر خواہانہ کچھ کہوں گا ضرور، لیکن نہ بہ ابرام میں تم سے زیادہ اُن کا مزاج داں ہوں۔ یہ خود پسند اور معہذا سپارش کا دشمن ہے۔ مغل بچوں کے مقدمے کو طبیعتِ امکان پر چھوڑ دو۔ میں دخل نہ کروں گا۔ ہاں اگر خود مجھ سے پوچھیں گے یا میرے سامنے ذکر آجائے گا تو میں اچھی کہوں گا:

بریدہ باد زبانے کہ ناسزا گوید

برا نہ ماننا۔ اگر یہ دونوں بھائی یا ان میں سے ایک رفیق ہوگیا، یوں تمام عمر بہ خوشی گزر جائے، لیکن تم کے برس، کے مہینے، کے ہفتے کا گرمنٹ لکھتے ہو۔

صبح شنبہ یکم مارچ ۱۸۶۲ء[۲] غالب

(۱۹)

صاحب!

میرا برادرِ عالی قدر اور تمھارا والد ماجد اب اچھا ہے۔ از روئے عقل اعادۂ مرض کا احتمال باقی نہیں ہے۔ رہا وہم، اُس کی دوا لقمان کے پاس بھی نہیں۔

مرزا قربان علی بیگ اور مرزا شمشاد علی بیگ کے باب میں جو کچھ تم نے لکھا ہے اور آئندہ جو کچھ لکھوگے، میری طرف سے جواب وہی ہوگا، جو آگے لکھ چکا ہوں: یعنی میں تماشائیِ محض رہوں گا۔ اگر بھائی صاحب مجھ سے کچھ ذکر کریں گے تو بھلی کہوں گا۔

آپ کے عمِ عالی مقدار جو فرماتے ہیں کہ غالب کو بیٹھے ہوئے ہزار ہا تسویلات و خیالات دکھائی دیتے ہیں یہ حضرت نے اپنی ذات پر میری طبیعت کو طرح کیا ہے اور وہ یہ سمجھے ہیں کہ جس طرح میں مبتلائے وساوس و اوہام ہوں اور لوگ بھی اسی طرح بخاراتِ مراقی میں گرفتار ہوں گے۔ قیاس مع الفارق ہے نہ تخیل صادق۔ یہاں لَا مَوْجُوْدَ

اِلّا اللہ کے بادۂ ناب کا رطلِ گراں چڑھاتے ہوئے اور کفر و اسلام و نور و نار کو مٹائے ہوئے بیٹھے ہیں :

کجا غیر و کو غیر و کو نقشِ غیر
سوائے اللہ، واللہ، ما فی الوجود

" ضمیران " بروزن " دُرگران " لغت عربی ہے نہ معرب ۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ پھول ہندوستان میں ہوتا ہے یا نہیں ۔ اس کی تحقیقات از روئے " الفاظ الادویہ " ممکن ہے ۔

" آج اُس نے جُلّاب لیا، دس دست آئے، مُواد خوب اخراج ہوا " ۔ فارسی غیر فصیح " امروز فلانے مسہل گرفت، دہ دست آمدند، مواد خوب بر آمد " ۔ فارسی فصیح " امروز فلانے پگاہ داروے مسہل آشامید ۔ تا شام دہ بار نشست یا دہ بار بہ مستراح رفت، یا دہ بار بہ بیت الخلا رفت ۔ مادۂ فاسد چنانکہ باید، اخراج یافت " ۔

معلوم رہے کہ لوطیوں کے منطق میں خصوصاً اور اہلِ پارس کے روزمرہ میں عموماً " نشستن " استعارہ ہے " ریدن " کا، چنانچہ ایک تذکرے میں مرقوم ہے کہ اصفہان میں ایک امیر نے شعرا کی دعوت اپنے باغ میں کی ۔ مرزا صائبؔ اور اُس عصر کے کئی شعرا جمع ہوئے ۔ ایک شاعر کہ تذکرے میں اُس کا نام مندرج ہے اور مَیں بھول گیا ہوں ۔ اکول تھا مگر معدہ اُس کا ضعیف تھا، حرص و شرہ کے سبب سے بہت کھا جاتا تھا ۔ ہضم نہ کر سکتا تھا ۔ کھانا کھا کر، شراب پی پی کر، دروازہ باغ کا مقفل کر کے سب سو رہے ۔ اس مردِ اکولِ فضول نے رات بھر میں سارا باغ ہگ بھرا ۔ نہ ایک جگہ بلکہ کبھی اُس کیاری میں ، کبھی اُس روش پر، کبھی اُس درخت کے تلے، کبھی اُس دیوار کی جڑ میں ۔ قصہ مختصر غایت شرم و حیا سے دو چار گھڑی رات رہے، دیوار سے کود کر چلا گیا ۔ صبح کو جب سب جاگے، اُس کو اِدھر اُدھر ڈھونڈا، کہیں نہ پایا ۔ مگر حضرت کا فضلہ کئی جگہ نظر آیا ۔ مرزا صائبؔ نے ہنس کر فرمایا : " یاراں شمارا چہ افتادہ است کہ مے گوئید، فلانے در باغ نیست ۔ می بینم کہ مخدوم ہم دریں باغ چند جا نشستہ است " ۔

صبح جمعہ ۵ رمضان ۱۲۷۸ھ ۷ مارچ ۱۸۶۲ء سالِ رستخیز ۲

رُباعی خط میں لکھنا بھُول گیا۔ یہ میں نے بھائی کو تہنیت میں بھیجی تھی :

اے کردہ بہ مہر زر فشانی تعلیم
پیدا ز کلاہِ تو شکوہ دیہیم
بادا بتو فرخندہ، زیزدانِ کریم
پروانگی جدید اقطاع قدیم

(۲۰)

یار بھتیجے، گویا بھائی، مولانا علائی!

خدا کی دہائی، نہ میں ویسا ہوں گا، جیسا تیّر سمجھا ہے اور تم مجھ کو لکھ چکے ہو یعنی خفقانی اور خیال تراش، نہ میں ویسا ہوں گا جیسا مرزا علی حسین خاں بہادر سمجھے ہوں گے :

اے کاش کسے ہر آنچہ ہستم، داند

دو جانے میں میرا انتظار اور میرے آنے کا تقریب شادی پر مدار، یہ بھی شعبہ ہے انھی ظنوں کا، جس سے تمھارے چچا کو گمان ہے مجھ پر جنون کا۔ جاگیردار میں نہ تھا کہ ایک جاگیردار مجھ کو بُلاتا۔ گویا میں نہ تھا کہ اپنا ساز و سامان لے کر چلا جاتا، دو جاتے جا کر شادی کماؤں اور پھر اُس فصل میں کہ دنیا کُرۂ نار ہو۔ لوہارو بھائی کے دیکھنے کو نہ جاؤں اور پھر اُس موسم میں کہ جاڑے کی گرمیِ بازار ہو۔

کل اُستاد میر جان صاحب نے تمھارا خط مجھ کو دکھایا ہے۔ میں نے اُن کو جانے نہ جانے میں متردّد پایا ہے، جائیں نہ جائیں۔ میں اپنی طرف سے ترغیب کرتا رہتا ہوں اور کہتا رہوں گا۔ غلام حسن خاں اگر کسی وقت آ جائیں گے تو اُن کو تمھاری تحریر کا خلاصہ خاطرنشاں کروں گا۔ حق سُبحانہ تعالیٰ ان دونوں صاحبوں کو یا ایک کو اِن میں سے توفیق دے یا مجھ کو طاقت یا تم کو انصاف کہ میرے نہ آنے کو دلّی کی دل بستگی پر محمول نہ کرو۔ مجھ کو رشک ہے جزیرہ نشینوں کے حال پر عموماً اور رئیسِ فرخ آباد پر خصوصاً کہ جہاز سے اُتار کر سرزمینِ عرب میں

چھوڑ دیا۔ اہا ہا ہا:

پڑیے گر بیمار، تو کوئی نہ ہو بیمار دار
اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

کلیات کے انطباع کا اختتام اپنی زیست میں مجھ کو نظر نہیں آتا۔ "قاطعِ بُرہان" کا چھاپا تمام ہو گیا۔ حق التصنیف کی ایک جلد میرے پاس آگئی۔ وہ تمھارے عمِ نامدار کی نذر ہوئی۔ باقی جلدیں جن کا میں خریدار ہوا ہوں اور درخواست میری مطبع میں داخل ہے، جب تک قیمت نہ بھیج دوں، کیوں کر آئیں؟ روپیے کی تدبیر میں ہوں اگر بہم پہنچ جائے تو بھیج دوں۔

تمھارے پاس جو "قاطعِ برہان" پہنچی ہے، اگر چھاپے کی ہے تو صحیح ہے۔ جہاں تردد ہو غلط نامۂ ملحقہ میں دیکھ لو۔ زیادہ انکشاف منظور ہو، مجھ سے پُوچھ لو اور اگر قلمی ہے، تو درجۂ اعتبار سے ساقط ہے۔ اُس کو میری تالیف نہ سمجھو بلکہ مجھ کو مول لے لو اور اُس کو پھاڑ ڈالو۔

آج یوم الخمیس ۱۹ جون المبارک، بارہ پر تین بجے تمھارا خط آیا۔ اِدھر پڑھا اُدھر جواب لکھنے بیٹھا۔ یہاں تک لکھ چکا تھا کہ شیخ شہاب الدین سہروردیؔ آئے۔ تمھارا خط اُن کو دیا۔ وہ پڑھ رہے ہیں۔ ہم لکھ رہے ہیں۔ ابر آیا ہوا ہے۔ ہوا سرد چل رہی ہے۔

یوم الخمیس ۱۹ جون ۱۸۶۲ء سنہ ؟

(۲۱)

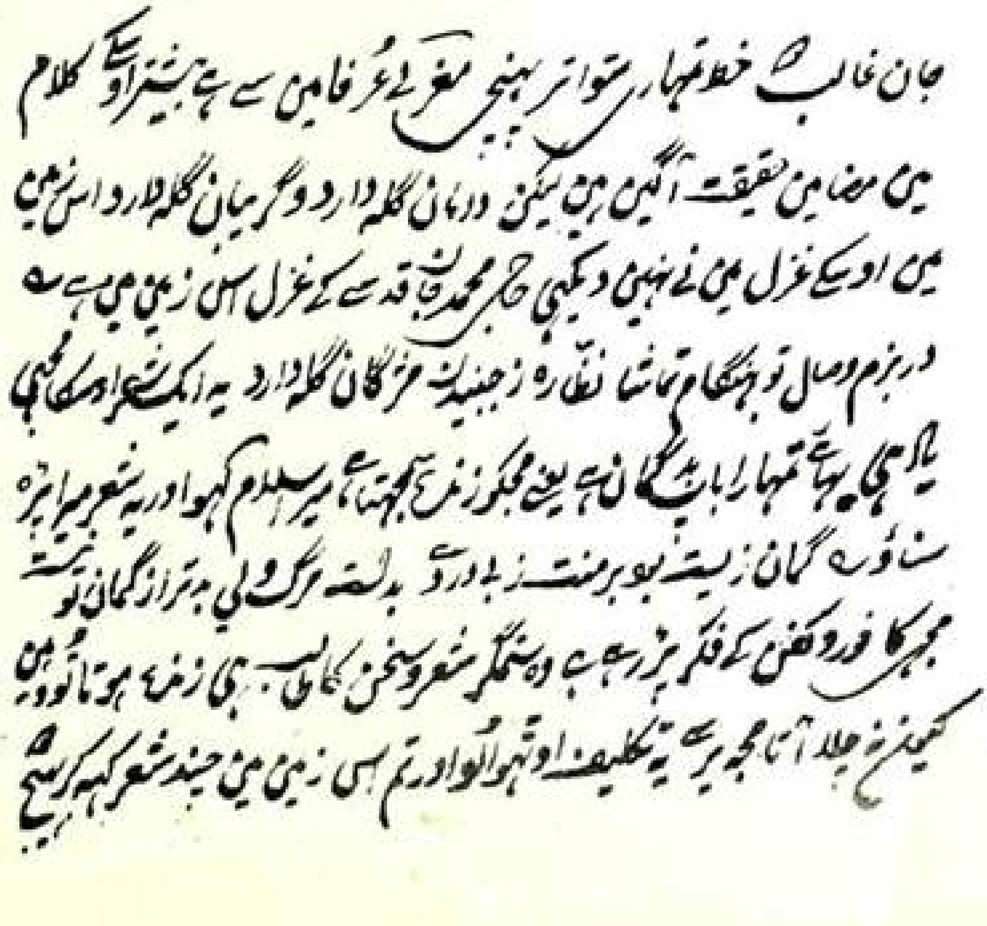

جانِ غالب کے خط تمہارے متواتر پہنچے مغز کے عرق فامیں سے ہے بیشتر اوسکے کلام
میں مضامین حقیقت آگیں ہیں لیکن درہاں گلہ دارد و گریبان گلہ دارد اس زمین
میں اوسکے غزل میں نے نہیں دیکھی حاجی محمد جان قدسی کی غزل اس زمین میں ہے ع
در بزم وصال تو بہنگام تماشا نظارہ ز جنبیدن مژگان گلہ دارد یہ ایک شعر اوسکا مجھے
یاد تھا یہ تمہارا بیت گمان ہے یعنی مجھکو زمین آج معلوم ہوا میرا سلام کہو اور یہ شعر میرا پڑھ
سنا دو ع گمان زیست بود بر منت ز بیدردی بد است مرگ ولی بدتر از گمان تو نیست
مجھکو فرو فکر کے فکر میں رہتا ہے وہ شغل شعر و سخن کا نہیں جی زمانہ ہوتا تو وہ میں
کیفیت نہ چلا آتا مجھ پر یہ تکلیف اوٹھاؤ اور تم اس زمین میں چند شعر کہہ کر بھیجو

مع اصلاح دیگر بھیجونگا عصائے پیری ہے بہر و اللہ میرا کلام ہندی یا فارسی کچھ
میرے پاس نہیں ہے آگے جو کچھ قطعہ میں موجود تھا وہ لکھ بھیجا اب جو کچھ یاد آ گیا
وہ لکھتا ہوں نسخے سے باہر ہے ما عاشقیم سخن از ننگ و نام چیست در امر خاص حجت دستور
عام چیست مستیم ز خون دل ما چشم ازان پرست گوئی مخور شراب و نہ بینی کہ جام
چیست

[illegible]

یہ شعر نہ یاد آتے تھے یاد آ گئے لکھ دیے گانے کو یہ بھی کافی و مکتفی ہیں

[illegible] غزل

[illegible] نتوان گفت [illegible] نتوان داد [illegible] نتوان گفت

پیوستہ دم از بادہ و ساغر نتوان خواند ہموارہ ترا شد سبب و آرزو نتوان گفت

[illegible] نتوان گفت

کوئی امید بر نہیں آتی آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی موت کا ایک دن معین ہے
کوئی صورت نظر نہیں آتی اب کسی بات پر نہیں آتی نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی
جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی
داغ دل گر نظر نہیں آتا
بو بھی اے چارہ گر نہیں آتی

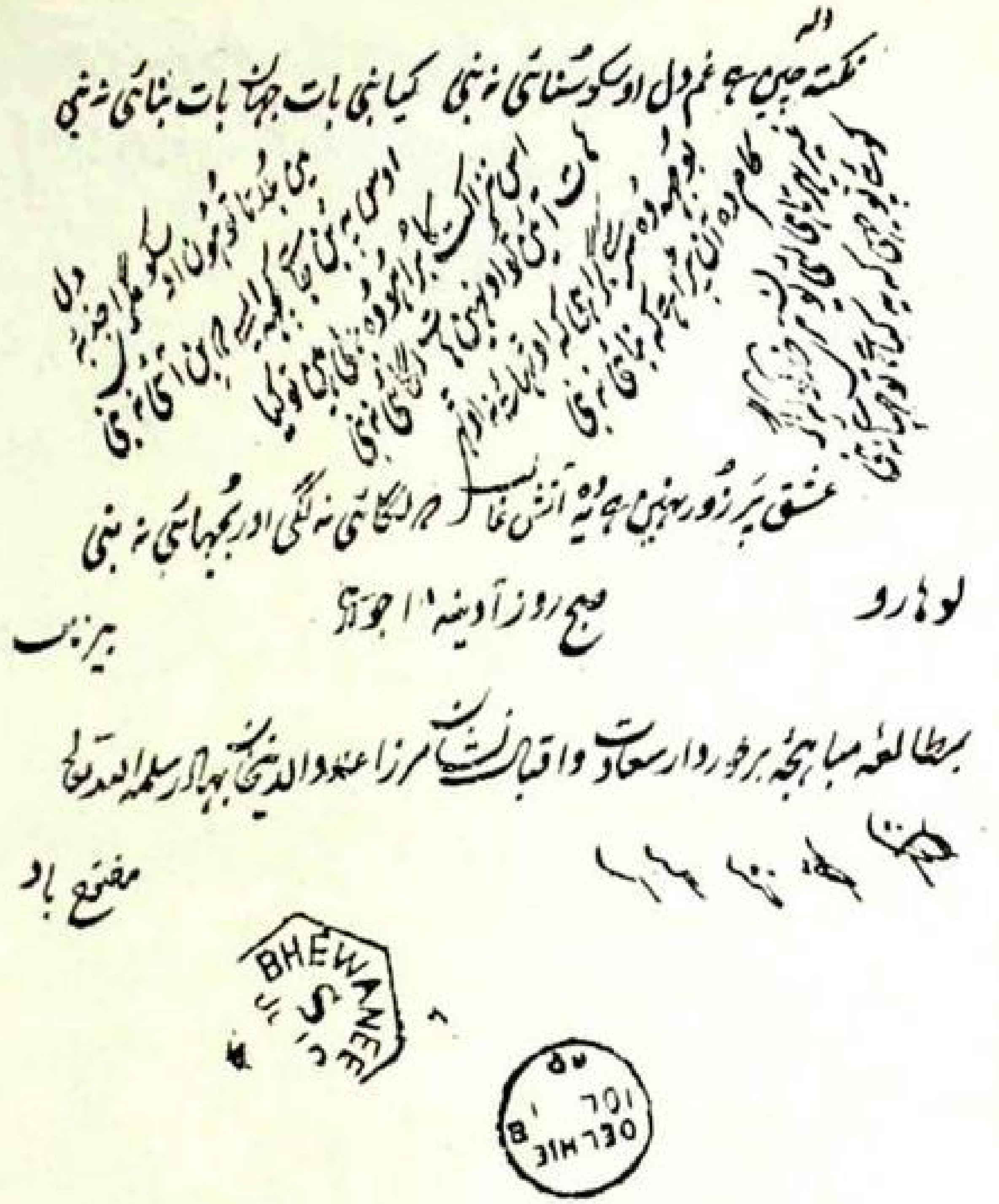

ولہ

نکتہ چیں ہے غم دل اوسکو سنائے نہ بنی کیا بنی بات جہاں بات بنائے نہ بنی

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنی

لوہارو

صبح روز آدینہ ۱۰ جولائی

بیرنگ

بمطالعہ مباہجہ برخوردار سعادت و اقبال نشان مرزا علاؤالدین خان بہادر سلمہ اللہ تعالیٰ

مفتوح باد

BHEWANEE

(اصل لفافے کی عکسی تحریر جس میں یہ خط ملفوف کر کے بھیجا گیا)

جانِ غالب!

دو خط تمھارے متواتر پہنچے۔ مغربی عرفا میں سے ہے۔ بیشتر اُس کے کلام میں مضامینِ حقیقت آگیں ہیں، لیکن "داماں گلہ دارد" و "گریباں گلہ دارد" اِس زمین میں، اُس کی غزل میں نے نہیں دیکھی۔ حاجی محمد جان قدسی کی غزل اس زمین میں ہے:

در بزمِ وصالِ تو بہ ہنگامِ تماشا
نظارہ ز جنبیدنِ مژگاں گلہ دارد

یہ ایک شعر اُس کا مجھے یاد ہے۔

بھائی! تمھارا باپ بدگمان ہے، یعنی مجھ کو زندہ سمجھتا ہے۔ میرا سلام کہو اور یہ شعر میرا پڑھ سناؤ:

گمانِ زیست بود بر منت ز بے دردی
بد است مرگ ولے بدتر از گمانِ تو نیست

مجھے کافور و کفن کی فکر پڑ رہی ہے، وہ ستم گر شعر و سخن کا طالب ہے۔ زندہ ہوتا تو وہیں کیوں نہ چلا آتا؟ مجھ پر سے یہ تکلیف اُٹھوا لو اور تم اس زمین میں چند شعر کہہ کر بھیج دو۔ میں اصلاح دے کر بھیج دوں گا۔ عصائے پیر بجائے پیر۔ واللہ میرا کلام ہندی یا فارسی کچھ میرے پاس نہیں ہے۔ آگے جو کچھ حافظے میں موجود تھا، وہ لکھ بھیجا۔ اب جو کچھ یاد آ گیا، وہ لکھتا ہوں:

بامن کہ عاشقم سخن از ننگ و نام چیست
در امرِ خاص حجّتِ دستورِ عام چیست
مستم ز خونِ دل کہ دو چشم ازاں پُر است
گوئی مخور شراب و نہ بینی بجام چیست
با دوست ہر کہ بادہ بخلوت خورد مدام
داند کہ حُور و کوثر و دار السّلام چیست
ماخستۂ غمیم و بود مے دواے ما
با خستگاں حدیثِ حلال و حرام چیست
از کاسۂ کرام نصیب ست خاک را
تا از فلک نصیبۂ کاسِ کرام چیست
غالبؔ اگر نہ خرقہ و مصحف بہم فروخت
پرسد چرا کہ نرخِ مےِ لعل فام چیست!

سات شعر نہ یاد آئے، چھے یاد آ گئے۔ خیر، گانے کو یہ بھی کافی و مکتفی ہیں:

دل بردو حق آنست کہ دلبر نتواں گفت
بیداد تواں دید و ستمگر نتواں گفت

دررزمگہش ناچخ و خنجر نتواں برد
دربزمگہش بادہ و ساغر نتواں گفت
رخشندگیِ ساعد و گردن نتواں جست
زیبندگیِ یارہ و پرگر نتواں گفت
پیوستہ دہد بادہ و ساقی نتواں خواند
ہموارہ تراشد بت و آذر نتواں گفت
در گرم روی سایہ و سرچشمہ نہ جوئیم
با ما سخن از طوبیٰ و کوثر نتواں گفت
ہنگامہ سرآمد، چہ زنی دم ز تظلم
گر خود ستمی رفت بہ محشر نتواں گفت
آں راز کہ در سینہ نہاں ست، نہ وعظ است
بردار تواں گفت و بہ منبر نتواں گفت
کارے عجب افتاد بدیں شیفتہ ما را
مومن نہ بود غالبؔ و کافر نتواں گفت

یارہ، کڑا ۔ پرگر، ہنسلی

کوئی اُمید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

داغِ دل گر نظر نہیں آتا
بُو بھی اے چارہ گر نہیں آتی

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

کعبے کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ
شرم تم کو مگر نہیں آتی

ولہ

نکتہ چیں ہے غمِ دل، اُس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات، جہاں بات بنائے نہ بنے
میں بُلاتا تو ہوں اُس کو مگر اے جذبۂ دل
اُس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے
اس نزاکت کا بُرا ہو، وہ بھلے ہیں تو کیا
ہاتھ آئیں، تو اُنھیں ہاتھ لگائے نہ بنے
بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اُٹھائے نہ اُٹھے
کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے
غیر پھرتا ہے لیے یُوں ترے خط کو کہ اگر
کوئی پُوچھے کہ یہ کیا ہے تو چُھپائے نہ بنے
عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے اور بُجھائے نہ بنے

صبح روز آدینہ ۱۸ جولائی ۱۸۶۲ء ا

(۲۲)

لو صاحب، پرسوں تمھارا خط آیا اور کل دوپہر کو اُستاد میر جان آئے۔ جب اُن سے کہا گیا تو یہ جواب پایا کہ میں مدت سے آمادۂ سفر لوہارو بیٹھا ہوں۔ حکیم صاحب کی گاڑی کی روانگی کے وقت میں نے اپنی گھوڑی بھیجی تھی، وہ پھری آئی۔ اس مراد سے کہ گاڑی میں جگہ نہ گھوڑی کی، نہ سواری کی۔ ناچار چپ ہو رہا۔ اب وہ گھوڑی ویسی ہی بندھی ہوئی رکھی ہے۔ جب میاں خاں اور وزیر خاں روانہ ہوں گے اور منشی امداد حسین مجھ کو اطلاع دیں گے تو میں فوراً

چل دوں گا۔ پا بہ رکاب ہوں۔ کل ہی آخر روز غلام حسن خاں آئے۔ کل اُنھوں نے چوتھے دن کھانا کھایا تھا۔ ہیضہ ہو گیا تھا۔ قے متواتر، دست پے بہ پے، غرض بچ گئے۔ کہتے تھے کہ آج جولائی کی ۱۷ تاریخ ہے۔ تیرہ دن یہ اور پانچ دن اگست کے، اور نہیں جا سکتا۔ تنخواہ لے کر بانٹ بونٹ کر ایک دن نہ ٹھہروں گا۔ لوہارو کی راہ لوں گا۔ مرزا شمشاد علی بیگ سے تمھارا پیام کہا گیا۔ کیا بعید ہے جو غلام حسن خاں کے ہم سفر ہو جائیں۔

بھائی کی طرف سے منشی امداد حسین خاں کو لکھوا بھیجو کہ میاں خاںؑ وغیرہ کے ساتھ اُستاد کو ضرور بھیجنا اور تم اپنی طرف سے اپنے ابن عم غلام حسن خاں کو بہ حوالہ میری تحریر کے عیادت اور اوائل اگست میں روانگی کی تاکید لکھ بھیجو:

در بزم وصالِ تو بہ ہنگامِ تماشا
نظارہ ز جنبیدنِ مژگاں گلہ دارد[۲]

یہ زمین قدسی علیہ الرحمۃ کے حصے میں آ گئی ہے، میں اِس میں کیوں کر تخم ریزی کروں؟ اور اگر بے حیائی سے کچھ ہاتھ پاؤں ہلاؤں تو اِس شعر کا جواب کہاں سے لاؤں؟:

ہرگز نتواں گفت دریں قافیہ اشعار
بیجاست برادر، اگر از من گلہ دارد

التوائے شربِ شراب ۲۲ جون۔ شروعِ شراب ۱۰ جولائی
المنۃ للہ کہ درِ میکدہ باز است

۱۸ جولائی ۱۸۶۲ء[۳]

(۲۳)

میری جان!

سُن، پنجشنبہ، پنجشنبہ آٹھ، جمعہ نو، ہفتہ دس، اتوار گیارہ۔ ایک مژہ بر ہم زدن مینہ نہیں تھما۔ اِس وقت شدت سے برس رہا ہے۔ انگیٹھی میں کوئلے دہکا کر پاس رکھ

لیے ہیں۔ دو سطریں لکھیں اور کاغذ کو آگ سے سینک لیا۔ کیا کروں؛ تمھارے خط کا جواب ضرور لو سنتے جاؤ، مرزا شمشاد علی بیگ کو تمھارا خط پڑھوا دیا۔ انھوں نے کہا کہ غلام حسن خاں کی معیت پر کیا موقوف ہے، مجھے آج سواری مل جائے، کل چل نکلوں۔ اب میں کہتا ہوں کہ اونٹ ٹٹوؔ کا موسم نہیں، گاڑی کی تدبیر ہو جائے، بس۔

یہ پچاس برس کی بات ہے کہ الٰہی بخش خاں مرحوم نے ایک زمین نئی نکالی۔ میں نے حسب الحکم غزل لکھی۔ بیت الغزل یہ:

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا، نہ دے، شراب تو دے

مقطع یہ:

اسدؔ خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اُس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

اب میں دیکھتا ہوں کہ مطلع اور چار شعر کسی نے لکھ کر اس مقطع اور اُس بیت الغزل کو شامل اُن اشعار کے کر کے، غزل بنالی ہے اور اس کو لوگ گاتے پھرتے ہیں۔ مقطع اور ایک شعر میرا اور پانچ شعر کسی الّو کے۔

جب شاعر کی زندگی میں گانے والے، شاعر کے کلام کو مسخ کر دیں تو کیا بعید ہے کہ دو شاعر متوفی کے کلام میں مطربوں نے خلط کر دیا ہو۔ مقطع بے شک مولانا مغربی کا ہے اور وہ شعر جو میں نے تم کو لکھا ہے اور یہ شعر جواب لکھتا ہوں:

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسن تو بسیار
گلچینِ بہار تو ز داماں گلہ دارد

یہ دونوں شعر قدسیؔ کے ہیں۔ مغربیؔ قدما میں اور عرفا میں ہے جیسا عراقیؔ، اُن کا کلام دقائق و حقائقِ تصوف سے لبریز، قدسیؔ شاہجہانی شعرا میں صائبؔ و کلیمؔ کا ہمعصر اور ہم چشم، اُن کا کلام شور انگیز

ان بزرگوں کی طرز و روش میں زمین آسمان کا فرق۔

بھائی کو سلام کہنا اور کہنا کہ صاحب وہ زمانہ نہیں، اِدھر متھرا داس سے قرض لیا اُدھر درباری مل کو مارا۔ اُدھر خوب چند چین سکھ کی کوٹھی جا لُوٹی۔ ہر ایک پاس تمسک مہری موجود، شہد لگاؤ، چاٹو، نہ مول نہ سود، اس سے بڑھ کر یہ بات کہ روٹی کا خرچ بالکل پھوپھی کے سر۔ با ایں ہمہ کبھی خانؔ نے کچھ دے دیا، کبھی الور سے کچھ دلوا دیا، کبھی ماں نے کچھ آگرے سے بھیج دیا۔ اب میں اور باسٹھ روپیے آٹھ آنے کلکٹری کے، سو روپیے رام پور کے، قرض دینے والا ایک میرا مختار کار۔ وہ سود ماہ بہ ماہ لیا چاہے۔ مول میں قسط اس کو دینی پڑے۔ انکم ٹیکس جدا، چوکیدار جُدا، سود جُدا، مول جُدا، بی بی جدا، بچے جدا، شاگرد پیشہ جدا۔ آمد وہی ایک سو باسٹھ۔ تنگ آگیا۔ گزارا مشکل ہو گیا۔ روزمرہ کا کام بند رہنے لگا۔ سونچا کہ کیا کروں؟ کہاں سے گنجائش نکالوں؟ قہرِ درویش بجانِ درویش۔ صبح کی تبرید متروک، چاشت کا گوشت آدھا، رات کی شراب و گلاب موقوف، بیس بائیس روپیہ مہینا بچا۔ روزمرّہ کا خرچ چلا۔ یاروں نے پوچھا، تبرید و شراب کب تک نہ پیو گے؟ کہا گیا کہ جب تک وہ نہ پلائیں گے۔ پوچھا کہ نہ پیو گے تو کس طرح جیو گے؟ جواب دیا کہ جس طرح وہ جلائیں گے۔ بارے مہینا پورا نہیں گزرا تھا کہ رام پور سے علاوہ وجہِ مقرری اور روپیہ آگیا۔ قرض مقسط ادا ہو گیا۔ متفرق رہا، خیر رہو۔ صبح کی تبرید، رات کی شراب جاری ہو گئی۔ گوشت پورا آنے لگا۔

چوں کہ بھائی نے وجہِ موقوفی اور بحالی پوچھی تھی۔ اُن کو یہ عبارت پڑھا دینا اور حمزہ[۲] خاں کو بعد سلام کہنا:

اے بے خبر ز لذّتِ شربِ مدام ما

دیکھا ہم کو یوں پلاتے ہیں۔

دریبے کے بنیوں کے لونڈوں کو پڑھا کر مولوی مشہور ہونا اور رسائل ابو حنیفہ کو دیکھنا اور مسائلِ حیض و نفاس میں غوطہ مارنا اور ہے اور عرفا کے کلام سے حقیقت حقّہ

وحدتِ وجود کو اپنے دل نشین کرنا اور ہے۔ مشرک وہ ہیں جو وجود کو واجب و ممکن میں مشترک جانتے ہیں، مشرک وہ ہیں جو مسیلمہ کو نبوت میں خاتم المرسلین کا شریک گردانتے ہیں، مشرک وہ ہیں جو نو مسلموں کو ابو الائمہ کا ہمسر مانتے ہیں۔ دوزخ ان لوگوں کے واسطے ہے موحدِ خالص اور مومنِ کامل ہوں۔ زبان سے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کہتا ہوں اور دل میں لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللہ، لَا مؤثرَ فِی الْوُجُوْدِ اِلَّا اللہ سمجھے ہوا ہوں۔ انبیا سب واجب التعظیم اور اپنے اپنے وقت میں سب مفترض الطاعت تھے۔ محمد علیہ السّلام پر نبوت ختم ہوئی۔ یہ خاتم المرسلین اور رحمۃ اللعالمین ہیں۔ مقطعِ نبوت کا مطلع امامت اور امامت نہ اجماعی بلکہ مِنَ اللہ ہے اور امام مِنَ اللہ علی علیہ السّلام ہے۔ ثم حسن، ثم حسین۔ اسی طرح تا مہدی موعود علیہ السّلام:

بریں زیستم، ہم بریں بگذرم

ہاں اتنی بات اور ہے کہ اباحت اور زندقہ کو مردود اور شراب کو حرام اور اپنے کو عاصی سمجھتا ہوں۔ اگر مجھ کو دوزخ میں ڈالیں گے تو میرا جلانا مقصود نہ ہوگا بلکہ میں دوزخ کا ایندھن ہوں گا اور دوزخ کی آنچ کو تیز کروں گا تاکہ مشرکین اور منکرینِ نبوتِ مصطفوی و امامتِ مرتضوی اُس میں جلیں۔

سنو، مولوی صاحب، اگر ہٹ دھرمی نہ کروگے اور کتمانِ حق کو گناہ جانوگے تو البتہ تم کو یاد ہوگا اور کہوگے کہ ہاں یاد ہے۔ جن روزوں میں تم علاء الدین خاں کو "گلستاں" اور "بوستاں" پڑھاتے ہو اور تم نے ایک دن غریب کو دو تین تپانچے مارے ہیں۔ نواب امین الدین خاں اُن دنوں میں لوہارو ہیں۔ علاءالدین خاں کی والدہ نے تم کو ڈیوڑھی پر سے اُٹھا دیا۔ تم باچشمِ پُرآب میرے پاس آئے۔ میں نے تم سے کہا کہ بھائی شریف زادوں کو اور سردار زادوں کو چشم نمائی سے پڑھاتے ہیں، مارتے نہیں، تم نے بے جا کیا، آیندہ یہ حرکت نہ کرنا۔ تم نادم ہوئے۔ اب وہ مکتب نشیں طفل سے گزر کر پیر ہفتاد سالہ کے واعظ بنے۔ تم نے کئی فاقوں میں ایک شعر حافظ کا حفظ کیا ہے: "چوں پیر شدی حافظ" الخ

اور پھر پڑھتے ہو اُس کے سامنے کہ اُس کی نظم کا دفتر حافظ کے دیوان سے دوچند، سہ چند ہے۔ مجموعۂ نثر جداگانہ اور یہ بھی لحاظ نہیں کرتے کہ ایک شعر حافظ کا یہ ہے اور ہزار شعر اس کے مخالف ہیں۔

صوفی بیا کہ آئینہ صاف ست جام را
تا بنگری صفاے مے لعل فام را

شرابِ ناب خور و روے مے جبیناں بیں
خلافِ مذہبِ آناں جمالِ ایناں بیں

ترسم کہ صرفۂ نبرد روزِ باز خواست
نانِ حلالِ شیخ ز آبِ حرامِ ما

ساقی مگر وظیفۂ حافظ زیادہ داد
کاشفتہ گشت طرۂ دستارِ مولوی

میاں میں بڑی مصیبت میں ہوں۔ محل سرا کی دیواریں گر گئی ہیں۔ پاخانہ ڈھ گیا۔ چھتیں ٹپک رہی ہیں۔ تمھاری پھوپھی کہتی ہیں: ہاے دبی، ہاے مری، دیوان خانے کا حال محل سرا سے بدتر ہے۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا۔ فقدانِ راحت سے گھبرا گیا ہوں۔ چھت چھلنی ہے۔ ابر دو گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی ہے۔ مالک اگر چاہے کہ مرمت کرے، تو کیوں کر کرے؟ مینہ کھلے تو سب کچھ ہو اور پھر اثناے مرمت میں، میں بیٹھا کس طرح رہوں؟ اگر تم سے ہو سکے تو برسات تک بھائی سے مجھ کو وہ حویلی، جس میں میر حسن رہتے تھے، اپنی پھوپھی کے رہنے کو اور کوٹھی میں سے وہ بالا خانہ مع دالانِ زیریں،

جو الٰہی بخش خاں مرحوم کا مسکن تھا، میرے رہنے کو دلوا دو۔ برسات گزر جائے گی، مرمت ہو جائے گی، پھر صاحب اور میم اور بابا لوگ اپنے قدیم مسکن میں آ رہیں گے۔ تمھارے والد کے ایثار و عطا کے جہاں مجھ پر احسان ہیں، ایک یہ مروت کا احسان میرے پایانِ عمر میں اور بھی سہی۔

صبح یک شنبہ ۲۷ جولائی ۱۸۶۲ء ۔ غالب

(۲۴)

مولانا علائی!

نہ مجھے خوفِ مرگ، نہ دعویٔ صبر ہے۔ میرا مذہب، بہ خلافِ عقیدۂ قدریہ، جبر ہے۔ تم نے میانجی گری کی، بھائی نے برادر پروری کی، تم جیتے رہو، وہ سلامت رہیں۔ ہم اسی حویلی میں تا قیامت رہیں۔

اس ایہام کی توضیح اور اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ مینہہ کی شدت سے چھوٹا لڑکا ڈرنے لگا۔ اُس کی دادی بھی گھبرائی۔ مجھ کو خلوت خانے کا دروازہ غرب رویہ اور اُس کے آگے ایک چھوٹا سا سہ دَرہ یاد تھا۔ جب تمھارے پاؤں میں چوٹ لگی ہے تو میں اُسی دروازے سے تم کو دیکھنے آیا تھا۔ یہ سمجھ کر خلوت خانے کو محل سرا بنایا چاہتا تھا کہ گاڑی، ڈولی، لونڈی، اصیل، کاچھن، تیلن، تنبولن، کہاری، پنہاری، ان فرقوں کا ممر وہ دروازہ رہے گا۔ میرے اور میرے بچوں کی آمد و رفت دیوان خانے میں سے رہے گی۔ عیاذاً باللہ! وہ لوگ دیوان خانے میں سے آئیں جائیں۔ اپنے بیگانے کو ہر وقت پچھل پائیاں نظر آئیں۔

بی وفادار، جن کو تم کچھ اور بھائی خوب جانتے ہیں۔ اب تمھاری پھوپھی نے انھیں وفادار بیگ بنا دیا ہے۔ باہر نکلتی ہیں، سودا تو کیا لائیں گی مگر خلیق اور ملنسار ہیں۔ رستہ چلتوں سے باتیں کرتی پھرتی ہیں۔ جب وہ محل سے نکلیں گی، ممکن نہیں کہ اطرافِ نہر کی سیر نہ کریں گی۔ ممکن نہیں کہ دروازے کے سپاہیوں سے باتیں نہ کریں گی۔ ممکن نہیں کہ پھول نہ توڑیں اور بی بی کو لے جا کر نہ دکھائیں اور نہ کہیں کہ "یہ پھول تائی چچا کے بیٹے کی کائی کے ایں"۔ شرح تمھارے

بچا کے بیٹے کی کیاری کے ہیں) ہے ہے، ایسے عالی شان دیوان خانے کی یہ قسمت اور مجھ سے نازک مزاج دیوانے کی یہ شامت۔ معہذا اُس سہ دری کو اپنے آدمیوں کے اور لڑکوں کے مکتب کے لیے ہرگز کافی نہ جانا۔ مور اور کبوتر اور دُنبہ اور بکری باہر گھوڑوں کے پاس رہ سکتے تھے۔ عَرَفْتُ رَبِّی بِفَسْخِ الْعَزَائِم پڑھا اور چُپ ہو رہا۔ مگر تمھاری خاطر عاطر جمع رہے کہ اسبابِ وحشت و خوف و خطراب نہ رہے۔ مینہ کھُل گیا ہے۔ مکان کے مالکوں کی طرف سے مدد شروع ہو گئی ہے۔ نہ لڑکا ڈرتا ہے، نہ بی بی گھبراتی ہے۔ نہ میں بے آرام ہوں۔ کھُلا ہوا کوٹھا۔ چاندنی رات، ہوا سرد، تمام رات فلک پر مرّیخ پیشِ نظر۔ دو گھڑی کے تڑکے زہرہ جلوہ گر۔ ادھر چاند مغرب میں ڈوبا، اُدھر مشرق سے زہرہ نکلی۔ صبوحی کا وہ لطف، روشنی کا وہ عالم۔

۶ ماہ اگست ۱۸۶۲ء غالب

(۲۵)

جانِ غالب، مگر جسم سے نکلی ہوئی جان!

قیامت کو دوبارہ ملنے کی توقع ہے، خدا کا احسان۔ مرزا قربان علی بیگ تمھاری کشش کے مجذوب کیوں بنتے؟ وہ تو خود سالک ہیں مگر ہاں یہ صاحبزدہ سعادت مند رضواں، سو اُس کے آپ مالک ہیں۔ نواب صاحب کا ہم مطبخ اور آپ کا ہم مائدہ ہونا بہتر ہوا، کاش تم یہ لکھتے کہ مشاہرہ کیا مقرر ہوا؟ اثنا عشری ایک تم ہو؟ سو تمھیں کیا اختیار ہے؟ البتہ عشرہ مبشرہ کی اولویت[۵] پر مدار ہے۔ باپ تمھارا خلافِ قاعدہ اہلِ سنّت جماعت عشرہ میں سے ثلثہ کو کم کرتا تھا۔ رضواں نے نہ مانا، کیوں کر مانتا؟ وہ تو ثلثہ کا دم بھرتا تھا۔

تہور خاں صاحب کے باب میں بندہ جویا اس خبر کا ہے کہ اب لوہارو سے اُن کا ارادہ کدھر کا ہے؟

رضواں کو دعا پہنچے۔ نواب صاحب کی عنایت اور مولانا علائی کی صحبت مبارک ہو۔ میرجی سے جب پوچھتا ہوں کہ تم خوب شخص ہو اور وہ کہتے ہیں، "کیا کہنا ہے؟" اور میں پوچھتا ہوں،

کس کا؟ تو وہ فرماتے ہیں، مرزا شمشاد علی بیگ کا۔ "ایں" اور کسی کا نام تم کیوں نہیں لیتے؟ دیکھو یوسف علی خاں بیٹھے ہیں، ہیرا سنگھ موجود ہے، واہ صاحب، میں کیا خوشامدی ہوں جو منہ دیکھی کہوں، میرا شیوہ حفظ الغیب ہے۔ غائب کی تعریف کرنی کیا عیب ہے؟ ہاں صاحب آپ ایسے ہی وضع دار ہیں، اِس میں کیا ریب ہے؟

صبح سہ شنبہ نہم ستمبر ۱۸۶۲ء — غالب

(۲۶)

میاں!

تم میرے ساتھ وہ معاملے کرتے ہو جو احیا سے مرسوم و معمول ہیں خیر تمھارا حکم۔ بجا لایا، غزل بعد اصلاح کے پہنچتی ہے۔ جناب لفٹنٹ گورنر بہادر نے دربار کیا۔ میری تعظیم و توقیر اور میرے حال پر لطف و عنایت میری ارزش و استحقاق سے زیادہ بلکہ میری خواہش اور تصور سے سوا مبذول کی۔ اس ہجومِ امراضِ جسمانی اور آلامِ رُوحانی کو ان باتوں سے کیا ہوتا ہے؟ ہر دم دمِ نزع ہے۔ دل وہ غم سے خونریز ہو گیا ہے کہ کسی بات سے خوش نہیں ہو سکتا۔ مرگ کو نجات سمجھے ہوئے ہوں اور نجات کا طالب ہوں۔ کئی دن سے کوئی تحریر دل پذیر تمھاری نظر نہیں آئی۔ نہ مجھے تم نے یاد کیا، نہ اپنے بھائی کو کچھ لکھا۔ اب اس خط کا جواب جلد لکھو۔

پہلے اپنے بچوں کا حال، پھر وہاں کے اوضاع، جیسا تمھارا قاعدہ ہے، منقح اور مفصّل لکھو۔ فقط۔

اوائل مارچ ۱۸۶۳ء — نجات کا طالب۔ غالب

(۲۷)

اقبال نشانا!

بخیر و عافیت و فتح و نصرت لوہارو پہنچنا مبارک ہو۔ مقصود ان سطور کی تحریر سے یہ ہے کہ مطبع اکمل المطابع میں چند احباب میرے مسودات اُردو کے جمع کرنے پر اور اُس کے

چھپوانے پر آمادہ ہوئے ہیں۔ مجھ سے مسودات مانگے ہیں اور اطراف و جوانب سے بھی فراہم کیے ہیں۔ میں مسودہ نہیں رکھتا۔ جو لکھا وہ جہاں بھیجنا ہو، وہاں بھیج دیا۔ یقین ہے کہ خط میرے تمھارے پاس بہت ہوں گے، اگر اُن کا ایک پارسل بنا کر بہ سبیلِ ڈاک بھیج دو گے یا آج کل میں کوئی اِدھر آنے والا ہو، اُس کو دے دو گے تو موجب میری خوشی کا ہوگا اور میں ایسا جانتا ہوں کہ اُس کے چھاپے جانے سے تم بھی خوش ہوگے۔ بچوں کو دعا۔

اپریل۔ مئی ۱۸۶۳ء[۱]　　　　غالب

(۲۸)

ولی عہدی میں شاہی ہو مبارک
عنایاتِ الٰہی ہو مبارک

اس امرِ فرخ[۲] و ہمایوں کی شہرت میں کوشش بے حوصلگی ہے اور اِس کے اخفا میں مبالغہ خفقانیت۔ تم اپنی زبان پر نہ لاؤ۔ اگر کوئی اور کہے، مانع نہ آؤ۔ نہ اشتہار، نہ استتار۔

دورہ ہوا مگر مدتِ معینہ کے بعد اور پھر جھاگ کا نہ آنا اور تمھارے پکارنے سے متنبہ ہو جانا، مادے کی کمی کی علامتیں ہیں۔ شدّت میں جس قدر خفّت ہو غنیمت ہے۔

میرے خطوط اردو کے ارسال کے باب میں جو کچھ تم نے لکھا، تمھارے حسنِ طبع پر تم سے بعید تھا۔ میں سخت بے مزہ ہوا، اگر بے مزگی کے وجوہ لکھوں تو شاید ایک تختہ کاغذ سیاہ کرنا پڑے۔ اب ایک بات موجز و مختصر لکھتا ہوں۔ سنو بھائی! اگر اُن خطوط کا تم کو اخفا منظور ہو اور شہرت تمھارے منافیِ طبع ہے تو ہرگز نہ بھیجو، قصہ تمام ہوا؛ اور اگر اُن کے تلف ہونے کا اندیشہ ہے تو میرے دستخطی خطوط اپنے پاس رہنے دو اور کسی متصدی سے نقل اُتروا کر چاہو، کسی کے ہاتھ چاہو بہ سبیلِ پارسل ارسال کرو لیکن جلد۔ خدا کے واسطے کہیں غصّے میں آکر ”عطائے تو بہ لقائے تو“، کہہ کر اصل خطوط نہ بھیج دینا کہ یہ امر میرے مخالفِ مقصود ہے۔ بھلا صاحب، ڈرتا ہوں میں تم سے۔ اِدھر خط پڑھا اُدھر جواب لکھ کر ڈاک میں بھیجا۔ تمھارا خط رہنے دیا

ہے۔ جب آکا شمشاد علی بیگ آئیں گے، پڑھ لیں گے۔

اپریل مئی ۱۸۶۳ء ۱ غالب

(۲۹)

لاموجودَ الا اللہ اُس خدا کی قسم جس کو میں نے ایسا مانا ہے اور اُس کے سوا کسی کو موجود نہیں جانا ہے کہ خطوط کے ارسال کو مکرر نہ لکھنا ازراہِ ملال نہ تھا۔ طالب کے ذوق کو سست پا کر میں متوقف ہو گیا۔ متوسط ایک جلیل القدر آدمی اور طالب کتب کا سوداگر ہے، اپنا نفع نقصان سوچے گا۔ لاگت بچت کو جانچے گا۔ میں متوسط کو مہتمم سمجھا تھا اور یہ خیال کیا تھا کہ یہ چھپوائے گا۔ تیس رقعے ایک جگہ سے لے کر اُن کو بھیجے، اُس کی رسید میں تقریباً انھوں نے طلبِ رقعات بہ تکلیف سوداگر لکھی اور اُس سوداگر کو مفقود الخبر لکھا۔ ظاہرا کتابیں لے کر کہیں گیا ہوگا یا کتابیں لینے گیا ہوگا۔ یہ تیئیس لفافے اور چونتیس خط بہ دستور میرے بکس میں موجود و محفوظ رہیں گے، اگر متوسط بہ تقاضا طلب کرے گا، اُن خطوط کی نقلیں اُس کو اور اصل تم کو بھیج دوں گا۔ ورنہ تمھارے بھیجے ہوئے کاغذ تم کو پہنچ جائیں گے۔

میاں! ان خطوں کے ارسال میں تم نے مجھ سے وہ کیا جو میں نے تم سے دو جانے میں کیا تھا۔ بھلا میں تو پیرِ خرِف ہوں اور سنِ خرافت کو نسیاں لازم ہے، تم نے کیا سمجھ کے کپڑا لیپٹ کر اور مختم کر کے بھیجا؟ خطوں پر ایک قلیل العرض کاغذ لیپٹ کر ارسال کیا ہوتا، اگر منشی بہاری لال میرا اور شہاب الدین کا دوست نہ ہوتا تو پچاس روپیے کا مجھ کو دھپا لگتا:

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت

صبح شنبہ ۳۰ مئی ۱۸۶۳ء غالب

(۳۰)

بد است مرگ، ولے بدتر از گمانِ تو نیست

مکرر لکھ چکا ہوں کہ قصیدے کا مسودہ میں نے نہیں رکھا، مکرر لکھ چکا ہوں کہ مجھے

یاد نہیں کون سی رُباعیاں مانگتے ہو، پھر لکھتے ہو کہ رباعیاں نہ بھیج، قصیدہ بھیج۔ معنی اس کے یہ کہ تو جھوٹا ہے، اب کے تو مقرر بھیجے گا۔ بھائی "قرآن" کی قسم، "انجیل" کی قسم، "توریت" کی قسم، "زبور" کی قسم، ہنود کے "چار بید" کی قسم، "دساتیر" کی قسم، "ژند" کی قسم، "پاژند" کی قسم، "اُستا" کی قسم، "گرو کے گرنتھ" کی قسم، نہ میرے پاس وہ قصیدہ، نہ مجھے وہ رباعیاں یاد۔

کلیات کے باب میں جو عرض کر چکا ہوں :

برہمانیم کہ ہستیم و ہماں خواہد بود

جب میں دس پندرہ جلدیں منگالوں گا، ایک بھائی کو اور ایک تم کو ارمغاں بھیجوں گا اور اگر بھائی کو جلدی ہے تو لکھنؤ میں "اودھ اخبار" کا مطبع، مالک اُس کا منشی نول کشور مشہور، جتنی جلدیں چاہیں، لکھنؤ سے منگالیں۔ میں بہ ہر حال، دو جلدیں جس وقت موقع ہوگا، بھیج دوں گا۔

۱۱ جون ۱۸۶۳ء نجات کا طالب۔ غالب

(۳۱)

میری جان !

مرزا علی حسین خاں آئے اور مجھ سے ملے۔ میں نے خطوط مرسلہ تمھارے یک مشت اُن کو دیے۔ اب تمھارے پاس بھیجنے کا اُن کو اختیار ہے۔ رسید کا البتہ مجھے انتظار ہے۔ علی حسین خاں سے آنے کی حقیقت اور یہاں اقامت کی مدت پوچھی گئی۔ جواب پایا کہ ایک مہینا دس دن کی رخصت لے کر آیا ہوں۔ بی بی بیمار ہے۔ اُس کا استعلاج منظور ہے۔ میری جان علی حسین خاں کے کام آئے تو دریغ نہ کروں۔ بھلا یہ مبالغہ سہی، بلکہ بے شک تبلیغ و غلو ہے، لیکن قریب قریب اس کے، یعنی جو چیز امکاں سے باہر نہ ہو، اُس میں قصور کیوں کر کیا جائے گا؟ بلکہ شاید تمھاری سپارش کی بھی حاجت نہ ہو، مگر سوچو کہ آئینِ غم خواری و اندوہ گساری کیا ہوگا[۲]۔ مرزا بدوضع و بدروش نہیں کہ پند و بند کا محتاج ہو، کوئی اس کا مقدمہ کسی محکمے میں دائر نہیں کہ مصلحت و مشورت کی احتیاج ہو۔ رہے امورِ خانگی یعنی بی بی اور اُس کے آبا اور اخوان کے معاملے، اُس میں نہ تم کو

دخل، نہ مجھ کو مداخلت، تم علی حسین خاں کو اس پیوند پر کیا کیا چھیڑتے ہو۔ اور یہ نہیں سمجھتے کہ اُس کا دادا کتنا بڑا آدمی تھا اور اب اُس کے دادا کی اور اُس کی سسرال ایک ہے۔ یہ ذریعۂ فخر ہے۔ اُس کو اور اُس کے طفیل سے تم کو، بلکہ تھوڑی سی نازش اگر مجھ ننگِ اقربا کے حصے میں بھی آجائے تو کچھ بعید نہیں۔

ہر چند تمھارا ہر کلمہ ایک بذلہ ہے، لیکن اِس "خسر" "وخسرانی" نے مار ڈالا۔ کیا کہوں جو مجھ کو مزا ملا ہے؟ کہاں "خسر" "وخسراں" لغات عربی الاصل اور کہاں روزمرہ مشہور کہ "خسر" سسرے کو کہتے ہیں۔ صنعت اشتقاق و طباق کو کس سینہ زوری سے برتا ہے۔ اچھا میرا میاں یہ "خسر" بہ معنی "پدرِ زن" کیا لفظ ہے؟ حروف بین الفارسی والعربی مشترک ہیں لیکن ان معنوں میں نہ فارسی ہے نہ عربی ہے۔ فارسی میں "پدرزن" بہ فک اِضافت کہتے ہیں۔ عربی جس طرح بہ معنی نقصان، لغت منصرف ہے، شاید سسرے کا اسم جامد بھی ہو یا فی الحقیقت سسرے کی تفریس و تعریب ہو۔ یہ پرسش نہ بہ سبیلِ استہزا ہے بلکہ بہ طریقِ استفسار و استعلام ہے، جو تمھیں معلوم ہو بلکہ اگر تم پر مجہول ہو تو معلوم کر کے مجھے لکھ بھیجو۔

یوسف علی خاں عزیز مانند اُس دہقان کے کہ جو دانہ ڈال کے مینہ کا منتظر ہو اور ابر آئے اور نہ برسے، مضطر و حیران ہے۔ علی حسین خاں آتے ہیں۔ علی حسین خاں آتے ہیں، آئے، وہ آئے تو کیا لائے؟

یکشنبہ ۳ محرم سنہ ۱۲۸۰ھ[۲]
مطابق ۲۱ جون سنہ ۱۸۶۳ء
غالب

(۳۲)

صاحب!

میں از کار رفتہ و درماندہ ہوں۔ آج تمھارے خط کا جواب لکھتا ہوں۔ لفظ "خسر" کے باب میں اتنی توضیح کیا ضرور تھی۔ میرا علم لغاتِ عربیہ کا محیط نہیں ہے اور یہ بہ طریق حق الیقیں جانتا ہوں کہ

"خسر" لغت۔ فارسی نہیں بسرے کی تفریس سے "خسر" پیدا ہوا ہو تو کیا عجب ہے، تم سے اس کی تحقیق چاہی تھی کہ یہ لغت عربی الاصل نہ ہو، وہ معلوم ہوا کہ عربی نہیں لغتِ ہندی ہے مفرس، اور یہی تھا میرا عقیدہ۔

علی حسین خاں آئے۔ دو تین بار مجھ سے مل گئے۔ اب نہ وہ آ سکتے ہیں نہ میں جا سکتا ہوں۔ نصیبِ دشمناں وہ لنگڑے، میں لولا، ان کے پاؤں کا حال مفصّل تم کو معلوم ہو گا۔ جونکیں لگیں، کیا ہوا، کہاں تک نوبت پہنچی۔ میری حقیقت سنو۔ مہینا بھر سے زیادہ کا عرصہ ہوا، بائیں پاؤں میں ورم، کفِ پا سے پشتِ پا کو گھیرتا ہوا پنڈلی تک آماس۔ کھڑا ہوتا ہوں تو پنڈلی کی رگیں پھٹنے لگتی ہیں۔ خیر، نہ اُٹھا۔ روٹی کھانے محل سرا نہ گیا، کھانا یہیں منگا لیا۔ پیشاب کو کیوں کر نہ اُٹھوں؟ حاجتی رکھ لی۔ بغیر اکڑو بیٹھے بات نہیں بنتی، پاخانے کو اگرچہ دوسرے تیسرے دن جاؤں، مگر جاؤں تو سہی۔ یہ سب موقع خیال میں لا کر سوچ لو کہ کیا گزرتی ہو گی؟

آغاز فتق مزید علیہ یا مستزاد:

به پیری و صد عیب چنیں گفتہ اند

اپنا یہ مصرع بار بار چپکے چپکے پڑھتا ہوں:

اے مرگِ ناگہاں، تجھے کیا انتظار ہے۔

مرگ، اب ناگہانی کہاں رہی؟ اسباب و آثار سب فراہم ہیں۔ ہائے الٰہی بخش خاں مغفور کا کیا مصرع ہے:

آہ جی جاؤں، نکل جائے اگر جان کہیں

زائدہ بے فائدہ

جمعہ ۳ جولائی ۱۸۶۳ء
مرگ کا طالب۔ غالب

(۳۳)

جانا عالی شانا!

پہلے خط اور پھر بہ توسط برخوردار علی حسین خاں، مجلّد "کلیاتِ فارسی" پہنچے۔ حیرت ہے کہ

چار روپیے قیمت کتاب اور چار آنے محصول ڈاک، قالبِ انطباع میں آکر پانچ روپیے قیمت اور پانچ آنے محصول قرار پاوے، خیر، جہاں سو وہاں سوا سے۔ میرا حال تمھیں اور تمھارا حال مجھے معلوم ہے:

ایں ہم اندر عاشقی بالائے غم ہائے دگر

اب کے چھٹے میں شاید نہ دے سکوں۔ نومبر سنہ حال میں پچاس تمھارے پاس پہنچ جائیں گے۔ اِنشاءَ اللہ العلیّ العظیم۔

میں بے حیا تھا نہ مرا۔ اچھا ہونے لگا۔ عوارض میں تخفیف ہے۔ طاقت آتی چلی ہے مختصر مفید:

در نامہ جز ایں مصرعۂ شاعر چہ نویسم
اے واے ز محرومیِ دیدار، دگر ہیچ

صبح یکشنبہ ۲۰ ستمبر ۱۸۶۳ء[۲]
نجات کا طالب۔ غالب

(۳۴)

اقبال نشان مرزا علاء الدین خاں بہادر کو غالبِ گوشہ نشین کی دعا پہنچے۔ برخوردار علی حسین خاں آیا، مجھ سے ملا۔ بھائی کا حال اُس کی زبانی معلوم ہوا۔ حق تعالیٰ اپنا فضل کرے۔ اَلوَلَدُ سِرٌّ لِاَبِیہٖ، تم اس کے مصداق کیوں بنے؟ خفقان و مراق اگرچہ تمھارا خانہ زاد موروثی ہے لیکن آج تک تمھاری خدمت میں حاضر نہ ہوا تھا، اب کیوں آیا؟ اگر آیا تو ہرگز اس کو ٹھہرنے نہ دو، ہانک دو، خبردار، اُس کو اپنے پاس رہنے نہ دینا۔

شفیقِ مکرم و لطفِ مجسم نول کشور صاحب بہ سبیلِ ڈاک یہاں آئے۔ مجھ سے اور تمھارے چچا اور تمھارے بھائی شہاب الدین خاں سے ملے، خالق نے اُن کو زہرہ کی صورت اور مشتری کی سیرت عطا کی ہے۔ گویا بہ جائے خود قران السعدین ہیں۔ تم سے میں نے کچھ نہ کہا تھا اور کلیات کے دس مجلد کی قیمت پچاس مان لیے تھے، اب اُن سے جو ذکر آیا تو انھوں نے پہلی قیمت مشتہرہ اخبار لینی قبول کی۔ یعنی تین روپیے چار آنے فی جلد۔ اس صورت میں دس مجلد کے بتیس روپیے

آٹھ آنے میں دوں۔ اور بتیس روپے آٹھ آنے تم دو۔ ہمگی بینسٹھ، مطبع اودھ اخبار میں پہنچانے چاہیں۔ میں دسمبر ماہِ حال کی دسویں گیارہوں کو طالب ہوں گا۔ کہو، بتیس روپے آٹھ آنے علی حسین خاں کو دے دوں، کہو لکھنو بھیج دوں۔ اس نگارش کا جواب جلد بھیجو۔

بھائی صاحب کی خدمت میں میرا اسلام کہنا اور استاد میر جان کے میری طرف سے قدم لینا۔

پنجشنبہ ۲۱ جمادی الثانی سال غفر
مطابق ۳ دسمبر سال ۱۸۶۳ء[1]
نجات کا طالب۔ غالب

(۳۵)

مولانا علائی!

واللہ، علی حسین خاں کا بیان بہ مقتضائے محبت تھا۔ ہر بار کہتا تھا اور یہ کہتا تھا کہ حق بہ جانب اُن کے ہے، نہ کوئی ہم سخن، نہ کوئی ہم نفس، نہ سیر، نہ شکار، نہ مجلس، نہ دربار، تنہائی و بے شغلی اور بس۔ جی نہ کیوں کر گھبرائے، خفقان کیوں کر نہ ہو جائے؟

نہ دن یاد، نہ تاریخ، آج چوتھا یا بھی شاید بھول گیا ہوں، پانچواں دن ہے کہ منشی نول کشور بہ سواریِ ڈاک رہ گرائے لکھنؤ ہوئے۔ کل پہنچ گئے ہوں یا آج پہنچ جائیں۔

آج روز یکشنبہ تیرہ دسمبر کی ہے۔ ایک دن منشی صاحب میرے پاس بیٹھے تھے اور برخوردار شہاب الدین خاں بھی تھا۔ میں نے ثاقب کو مخاطب کر کے کہا کہ اگر میں دنیا دار ہوتا تو اس کو نوکری کہتا مگر چونکہ فقیرِ تکیہ دار ہوں تو یہ کہہ سکتا ہوں کہ تین جگہ کا روزینہ دار ہوں۔ ساڑھے باسٹھ روپے یعنی سات سو پچاس روپے سال سرکارِ انگریزی سے پاتا ہوں۔ بارہ سو سال رام پور سے اور چوبیس روپے سال اِن مہاراج سے۔ توضیح یہ کہ دو برس سے ہر مہینے میں چار بار اخبار مجھ کو بھیجتے ہیں، قیمت نہیں لیتے مگر ہاں اڑتالیس ٹکٹ میں مطبع میں پہنچا دیا کرتا ہوں۔ بتیس روپے آٹھ آنے جو میں نے پوچھے تھے کہ علی حسین خاں کے حوالے کروں، مقصود اس سے یہ تھا کہ ارسال بہ سبیلِ ہنڈوی دشوار ہے، خیر، اب جس طرح ہو گا حصار

---

[1] سال: کیا غضب! ہے ہے ۱۸۶۳ء۔ یہ گویا تاریخِ وفات جناب نواب گورنر جنرل لارڈ الگن صاحب بہادر کی ہے۔

پر ہنڈوی لکھوا کر تم کو بھیج دوں گا۔ تم حصار پہنچ کر روپیہ منگوا لیجیو۔ خدا چاہے تو دسمبر میں روپیہ تمھارے پاس پہنچ جائے۔

استاد میر جان صاحب کو قدم بوس کہہ کر مجھ کو فرعون بننا پڑا۔ دہائی خدا کی، اب ایسا نہ کروں گا۔ میرا سلام بلکہ دعا اُن کو کہہ دینا۔

پرسوں مولوی صدرالدین خاں صاحب کو فالج ہو گیا۔ سیدھا ہاتھ رہ گیا ہے۔ زبان موٹی ہو گئی ہے۔ بات مشکل سے کرتے ہیں اور کم سمجھ میں آتی ہے۔ میں اپاہج ہوں جا نہیں سکا۔ جو اُن کو دیکھ آتا ہے، اُس سے اُن کا حال پوچھا جاتا ہے۔ دن تاریخ صدر میں لکھ آیا ہوں۔ کاتب کا نام غالب ہے کہ دستخط سے پہچان جاؤ۔

یک شنبہ ۱۳ دسمبر ۱۸۶۳ء[1]

(۳۶)

علائی مولائی کو غالبِ طالب کی دعا۔ بے چارے مرزا کا معاملہ علی حسین خاں کی معرفت طے ہو گیا۔ یہاں پندرہ کا سوال، وہاں دس میں سے تین کم کرنے کا خیال، متوسط دوسرا جو علی حسین خاں بہادر کے بعد درمیان آئے، وہ کیا کرے اور کیا کہے؟ مرزا قانع و متوکل ہیں، نہ پندرہ مانگتے ہیں نہ دس، اللہ بس ماسوا ہوس۔

جنابِ ترولین صاحب، بھائی کے دوستِ دلی، دلّی آئے۔ لاٹ صاحب کہلاتے ہیں۔ سنتا ہوں کہ کل اکبرآباد جاتے ہیں۔ بھائی علی بخش خاں مدت سے بیمار تھے۔ رات کو بارہ پر دو بجے مر گئے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔

تمھارے عم نامدار آج دن کو بارہ بجے سلطان جی گئے ہیں۔ میں نہ جا سکا۔ تجہیز و تکفین اُن کی طرف سے عمل میں آئے گی۔ بارہ پر تین بجے یہ خط میں نے تمھیں لکھا ہے۔ کل شنبہ دو جنوری صبح کو ڈاک گھر بھیج دوں گا۔ مشفقی شفیقی میر جان صاحب کو سلام مع الاکرام۔

یکم جنوری ۱۸۶۴ء[2]

نجات کا طالب۔ غالب

(۳۷)

میری جان !

غالبِ کثیر المطالب کی کہانی سن: میں اگلے زمانے کا آدمی ہوں۔ جہاں ایک امر کی ابتدا دیکھی، یہ جان لیا کہ اب یہ امر مطابق اس بدایت کے نہایت پذیر ہوگا۔ یہاں اختلافِ طبائع کا وہ حال کہ آغاز مغشوش، انجام مخدوش، مبتدا خبر سے بیگانہ، شرط جزا سے محروم، سنا اور متواتر سنا کہ قصہ طے ہوگیا۔ اب علاء الدین خاں مع قبائل آئیں گے۔ دل خوش ہوا کہ اپنے محبوب کی شکل مع اُس کے نتائج کے دیکھوں گا۔ پرسوں آخر روز بھائی پاس گیا۔ اثنائے اختلاط و انبساط میں میں نے پوچھا کہ کہو بھائی علاء الدین خاں کب آئیں گے؟ جواب کچھ نہیں۔ اجی وہ قصہ تو طے ہوگیا؟ ہاں، وہ تو روپیہ میں نے دے بھی دیا۔ میں نے کہا تو اب چاہیے کہ وہ آئیں۔ فرمایا کہ شاید ابھی نہ آئے:

معلوم ہوا کہ خیر، ٹھینگا باجا

ناچار ارادہ کیا کہ جو کچھ کہنا تھا، اب وہ لکھ کر بھیجوں۔ پرسوں تو شام ہوگئی تھی۔ کل بغل گیر ہونے والوں نے دم نہ لینے دیا۔ اُس پر طرہ یہ کہ ثاقبؔ نے کہا کہ بھائی تم سے شاکی ہیں۔ اب ضرور آپڑا کہ گذارشِ مدعا سے پہلے تمہارے رقعِ ملال میں کلام کروں۔

بھائی تم میرے فرزند بلکہ بہ از فرزند ہو۔ اگر میرا صلبی بیٹا اس دید و دانست و تحریر و تقریر کا ہوتا تو میں اس کو اپنا یارِ وفادار، ذریعۂ افتخار جانتا۔ میرے خطوط کے نہ پہنچنے کا گلہ غلط، تمہارا کون سا خط آیا کہ اس کا جواب یہاں سے نہ لکھا گیا؟ میرے پاس جو مقاصدِ ضروری فراہم تھے، وہ میں نے اس نظر سے نہ لکھے کہ اب تم آتے ہو، زبانی گفت و شنید ہو جائے گی۔ ثاقبؔ نے چلتی گاڑی میں روڑا اٹکا دیا۔ تب مجھے توطیہ و تمہید میں ایک ورق لکھنا پڑا۔ ورنہ آغازِ نگارش یہاں سے ہوتا۔

یا اسداللہ غالب :

با من از جہل معارض شدہ نا منفعلے
کہ گرش ہجو کنم ایں بودش مدح عظیم

یہ رسالہ موسوم بہ "محرقِ قاطعِ برہان" جو ثاقب نے تم کو بھیجا ہے میرے کہنے سے بھیجا ہے اور اس ارسال سے میرا مدعا یہ ہے کہ اس کے معائنے کے وقت اُس کتاب کی بے ربطیِ عبارت پر اور میری اپنی قرابت اور نسبت ہائے عدیدہ پر نظر نہ کرو۔ بیگانہ وار دیکھو اور ازروے انصاف حکم بنو، بے حیف و میل۔

اُس نے جو مجھے گالیاں دی ہیں، اُس پر غصہ نہ کرو۔ غلطیاں عبارت کی، شدتِ اطنابِ ممل کی صورت، سوال دیگر، جواب دیگر۔ ان باتوں کو مطمحِ نظر کرو، بلکہ اگر فرصت مساعدت کرے تو اُن مراتب کو الگ ایک کاغذ پر لکھو اور بعد اتمام میرے پاس بھیج دو۔ میرا ایک دوستِ روحانی کہ وہ منجملہ رجال الغیب ہے۔ ان ہفوات کا خاکہ اڑا رہا ہے۔ نیر رخشاں نے اس کو مدد دی ہے۔ تم بھی بھائی مدد دو، اور وہ امرِ مبہم کہ جو تمھارے والد کی تقریر سے دل نشیں نہیں ہوا یعنی قصہ ٹپک جانا اور دلی آنا، اُس کا ماجرا مفصل و مشرح لکھ۔

دن تاریخ، اپنا نام، آغاز کتابت میں لکھ آیا ہوں، اب ارسالِ جواب کی تاکید کے سوا اور کیا لکھوں۔ فقط۔

صبح کا وقت، چہار شنبہ ۱۸ مئی ۱۸۶۴ء بقول عوام باسی عید کا دن

(۳۸)

اے میری جان!

مثنوی "ابرِ گہربار" کون سی فکرِ تازہ تھی کہ میں تجھ کو بھیجتا؟ کلیات میں موجود ہے۔ معہذا شہاب الدین خاں نے بھیج دی۔ میں مکرر کیا بھیجتا؟

تبِ محرق" کے دیکھنے سے انکار کیوں کرتے ہو؟ اگر منافیِ طبع تحریر کو بہ سببِ انزجار نہ دیکھا کرتے تو فریقین کی کتبِ مبسوط کہاں سے موجود ہوتیں؟ "افسوس" کو میں نے عربی جانا، عربی نہیں ہے، اب مانا، یہ ایک سہوِ طبیعت تھا۔ میرا اعتراض تو خلطِ مبحث پر ہے۔ "افسوس" و

"فسوس" ایک کیوں ہو جائے۔

یہاں کے اطوار مجھ سے باوجودِ قُرب مخفی اور تم پر بہ ایں ہمہ بُعد، آشکار۔ دورانِ باخبر درحضور، و نزدیکانِ بے صبر دور۔ روپیہ آگیا۔ دل سے نکلا۔ مخزن سے نکلا۔ ہاتھ سے نہیں نکلا۔ جب ہاتھ سے نکل جائے گا اور جنس مول لی جائے گی اور یہ گند کٹ جائے گا، تب ترساں ترساں پیش گاہ نادری میں تمھارے یہاں آنے کے باب میں کچھ عرض کیا جائے گا۔ میں ان دنوں مردود بھی ہوں۔ والسلام:

صبحدم با ابوالبشر گفتم
پارۂ زر بدہ، کہ زر داری
حیف باشد کہ از چہ من پسرے
خاک رنگیں عزیز تر داری
گفت حیف است از تو خواہشِ زر
کہ تو گنجینۂ گہر داری
گنجدانِ سخن حوالۂ تست
خود بہ بیں تا چہ، اے پسر، داری
پیشِ من زر کجاست جانِ پدر
ببری ہرچہ در نظر داری
گفتم اینک بہ بند پیمانے
زر بہ من می دہی، اگر داری
سر زنبیلِ آں عمر عیّار
کز عیاریش خبر داری
بکشا زود و زر بریز و بگوے
کہ ہمیں مدعا مگر داری

گفت، بابا فسانۂ بودہ ست
چہ فرو ریزم و چہ برداری

دوشنبہ ۲۳ ذی الحجہ سنہ ۱۲۸۰ھ
۳۰ مئی سنہ ۱۸۶۴ء

(۳۹)

علائی مولائی !

غالب کو اپنا دعاگو اور خیر خواہ تصور کریں۔ مادہ ہائے تاریخ کو نہ آپ قالبِ نظم میں لائیں اور نہ اور کو اس امرِ منکر کی تکلیف دیں۔

بھائی ! سمجھو، یزید پر لعن، من جملۂ عبادت سہی، لیکن تقریباً کہہ دیتے ہیں کہ: "بر یزید لعنت" کسی مومن نے اس کی ہجو میں قصیدہ نہیں لکھا۔

ابداعِ مادہ ہائے تاریخ تمھارے حسنات میں لکھا گیا۔ مثاب تم ہو چکے۔ اجر پاؤ گے انشاءاللہ۔ اب اپنے کو بدنام اور کسی کو ملول اور عداوت کو ظاہر اور اگر ظاہر ہے تو محکم نہ کرو۔

علی بخش خاں مرحوم مجھ سے چار برس چھوٹا تھا۔ میں سنہ ۱۲۱۲ھ میں پیدا ہوا ہوں۔ اب کے رجب کے مہینے سے انہتّرواں برس شروع ہوا ہے۔ اُس نے چھیاسٹھ برس کی عمر پائی۔ نئی تقریر و تحریر کا آدمی تھا۔ اکبر آباد میں میور صاحب سے ملے۔ اثنائے مکالمت میں کہنے لگے کہ میں چچا جان کے ساتھ لارڈ لیک صاحب کے لشکر میں موجود تھا اور ہولکر سے جو محاربات ہوئے ہیں اُس میں شامل رہا ہوں۔ بے ادبی ہوتی ہے ورنہ اگر قبا و پیرہن اتار کر دکھلاؤں تو سارا بدن ٹکڑے ٹکڑے ہے۔ جابجا تلوار اور برچھی کے زخم ہیں۔ وہ ایک بیدار مغز و دیدہ ور آدمی، اُن کو دیکھ دیکھ کر کہنے لگا کہ: "نواب صاحب ہم ایسا جانتے ہیں کہ تم جرنیل صاحب کے وقت میں چار یا پانچ برس کے ہو گے۔" یہ سن کر آپ نے کہا کہ: "درست، بجا ارشاد ہوتا ہے۔"

خدایش بیامرزاد و بدیں دروغ ہائے بے نمک مگیراد

شنبہ ۱۰ جولائی سنہ ۱۸۶۴ء

غالب

(۴۰)

اجی مولانا علائی!

نواب صاحب دو مہینے تک کی اجازت دے چکے اور یہ میں خبر تراشی نہیں کرتا، مرزا علی محمد بیگ کی زبانی ہے کہ نواب صاحب علاء الدین خاں سے کہہ چکے ہیں کہ قصہ مٹ گیا ہے، اب تم شوق سے دلّی جاؤ دو ہفتے سے لے کر دو مہینے تک کی تم کو رخصت ہے، پھر تم کیوں نہ آئے۔ خدا نے دعا، خداوند نے استدعا قبول کی۔ تمھاری طرف سے سست قدمی اور دل سردی کی کیا وجہ؟ اگر حاکی کی حکایت جھوٹ ہے تو تم سچ لکھو کہ ماجرا کیا ہے؟

مرزا یوسف علی خاں عزیز تمھارے بلائے ہوئے اور مہدی حسین، بھائی صاحب کے مطلوب، مرزا عبدالقادر بیگ کے قبائل کے ساتھ کل روانہ لوہارو ہوئے ہیں۔

شنبہ ۱۷ ستمبر ۱۸۶۴ء نجات کا طالب۔ غالب

(۴۱)

مرزا علائی مولائی!

نہ لاہور سے خط لکھا، نہ لوہارو سے۔ بہ قدر بادۂ حمق محوِ انتظار بلکہ امیدوار رہا، اب جو کسی طرح کی توقع نہ رہی تو شکوہ طرازی کا موقع ہاتھ آیا۔ اگرچہ جانتا ہوں کہ ایک شکوے کے دفع میں "طوطی نامہ" برابر ایک رسالہ لکھو گے اور ہزار وجہیں موجہ بیان کرو گے۔ میں اس تصور کا مزہ اٹھا رہا ہوں کہ دیکھوں کیا لکھتے ہو؟

دادی صاحبہ سے لکھوانا، پھوپھی صاحبہ سے لکھوانا، غالب سے لکھوانا بعد حصولِ اجازت نہ آنا، اس کے بھی کچھ معنی ہیں یا نہیں؟ اچھا میرا میاں، کچھ اس باب میں لکھ: چپڑی اور دو دو، ایک مندیل اور ایک سیلا یا کوئی اور چیز مبارک۔

بچوں کو میری دعا کہنا اور اُن کی خیر و عافیت لکھنا۔ استاد میر جان صاحب کو سلام۔ مزہ تو جب ملے گا کہ تم دلّی آؤ اور اپنی زبان سے لاہور کے ہنگامۂ انجمن کا حال بیان کرو۔

چہار شنبہ ۳ نومبر ۱۸۶۴ء نجات کا طالب، غالب

(۴۲)

میری جان!

تمہارا خط بھی آیا اور علی حسین خاں نجم الدین بھی تشریف لایا۔ اگر سرنوشت آسمانی میں بھی اواخر رجب یا اوائل شعبان میں ہمارا تمہارا مل بیٹھنا مندرج ہے تو زبانی کہہ سن لیں گے۔ قلم کو ان اسرار کی محرمیت نہیں ہے جو شخص اپنے ملک و مال و جان و تن و ننگ و نام کے امور میں آشفتہ و سرگرداں بلکہ عاجز و حیراں ہو، دوسرے کو اُس سے کیا گلہ۔ ہائے نظیری:

با ما جفا و ناخوشی، با خود غرور و سرکشی
از ما نہ ز خود نہ آخر از آں کیستی

محلِ عقل و ہوش دماغ سو تباہ، افیون کا مختصر ہو جانا علاوہ۔ اللہ جو چاہے سو کرے۔ ایسا پیارا باغ و بہار بھائی یوں بگڑ جائے۔

جمعہ ۹ دسمبر ۱۸۶۴ء [۲]

۹ رجب ۱۲۸۱ھ نجات کا طالب۔ غالب

(۴۳)

لو صاحب، وہ مرزا رجب بیگ مرے، اُن کی تعزیت آپ نے نہ کی۔ شعبان بیگ پیدا ہو گئے، کل اُن کی چھٹی ہو گئی، آپ شریک نہ ہوئے:

اے واے ز محرومیِ دید از[۳] دگر ہیچ

میاں خدا جانے کس طرح یہ چار سطریں تجھ کو لکھی ہیں۔ شہاب الدین خاں کی بیماری نے میری زیست کا مزہ کھو دیا۔ میں کہتا ہوں کہ اس کے عوض میں مر جاؤں۔ اللہ اس کو جیتا رکھے، اس کا داغ مجھ کو نہ دکھائے، یارب اُس کو صحت دے[۴]۔ یارب اس کی عمر بڑھا دے۔

تین بچے[۵]، ایک اب پیدا ہونے والا ہے۔ یارب اُس کو اولاد کے سر پر سلامت رکھ۔

۵ جنوری ۱۸۶۴ء [۶]

۷ شعبان ۱۲۸۱ھ نجات کا طالب۔ غالب

(۴۴)

میری جان!

ناسازیِ روزگار و بے ربطیِ اطوار و بہ طریقِ داغ بالائے داغ، آرزوئے دیدار۔ وہ دو آتشِ شرارہ بار اور یہ ایک دریائے ناپیدا کنار وَقِنَا رَبَّنَا عَذَابَ النَّار۔

خدا نے بھائی ضیاء الدین خاں کے بڑھاپے پہ اور میری بے کسی پر رحم فرمایا۔ میرا شہاب الدین خاں بچ گیا۔ امراضِ مختلفہ میں گھر گیا تھا۔ بواسیر خونی، زحیر، تپ، صداع۔ بارے اب مِن کُلِّ الوُجوہ صحت حاصل ہے۔ ضعف جاتے ہی جائے گا۔ آگے کون سے قوی تھے کہ اب اُن کو ضعیف کہا جائے؟ ایک بڈھا کسی گلی میں جاتے جاتے ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ کہنے لگا: "ہائے بڑھاپا" اِدھر اُدھر دیکھا۔ جب جانا کہ کوئی نہیں ہے کہتا ہوا بڑھا کہ "جوانی میں کیا پتھر پڑتے تھے"، والسلام

جنوری ۱۸۶۵ء ۲

غالبِ مستہام

(۴۵)

میری جان!

نئے مہمان کا قدم تم پر مبارک ہو، اللہ تعالی تمھاری اور اُس کی اور اُس کے بھائیوں کی عمر و دولت میں برکت دے۔ تمھاری طرزِ تحریر سے صاف نہیں معلوم ہوتا کہ سعید ہے یا سعیدہ ہے۔ ثاقب اُس کو عزیز اور غالب عزیزہ جانتا ہے۔ واضح لکھو تا احتمال رفع ہو۔

خط ثاقب کے نام کا، توبہ توبہ خط کا ہے کو ایک تختہ کاغذ کا، میں نے سراسر پڑھا، لطیفہ و بذلہ و شوخی و شوخ چشمی کا بیان جب کرتا کہ فحوائے عبارت سے جگر خون نہ ہو جاتا۔ بھائی کا غم جدا۔ ایسا سخن گزار، ایسا زباں آور، ایسا عیارِ طرار۔ یوں عاجز و درماندہ و از کار رفتہ ہو جائے۔ تمھارا غم جدا، ساغر اول و دُرد، کیا دل لے کر آئے، کیا زبان لے کر آئے، کیا علم لے کر آئے کیا عقل لے کر آئے اور پھر کسی روش کو برت نہ سکے۔ کسی شیوے کی داد نہ پائی۔ گویا نظیری تمھاری

زبان سے کہتا ہے :

جوہرِ بینشِ من در تہِ زنگار بماند
آنکہ آئینۂ من ساخت نہ پرداخت، دریغ

بھائی اِس معرض میں، میں بھی تیرا ہم طالع اور ہم درد ہوں۔ اگرچہ یک فنہ ہوں مگر مجھے اپنے ایمان کی قسم، میں نے اپنی نظم و نثر کی داد بہ اندازۂ بایست پائی نہیں۔ آپ ہی کہا، آپ ہی سمجھا۔ قلندری و آزادگی و ایثار و کرم کے جو دواعی میرے خالق نے مجھ میں بھر دیے ہیں، بہ قدر ہزار ایک ظہور میں نہ آئے۔ نہ وہ طاقتِ جسمانی کہ ایک لاٹھی ہاتھ میں لوں اور اُس میں شطرنجی اور ایک ٹین کا لوٹا مع سوت کی رسی کے لٹکالوں اور پیادہ پا چل دوں۔ کبھی شیراز جا نکلا، کبھی مصر میں جا ٹھہرا، کبھی نجف جا پہنچا۔ نہ وہ دستگاہ کہ ایک عالم کا میزبان بن جاؤں اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے نہ سہی، جس شہر میں رہوں اُس شہر میں تو بھوکا ننگا نظر نہ آؤں :

نہ بستاں سرائے ، نہ میخانۂ
نہ دستاں سرائے ، نہ جانانۂ
نہ رقصِ پری پیکراں بر بساط
نہ غوغاے رامشگراں در رباط

خدا کا مقہور، خلق کا مردود، بوڑھا، ناتواں، بیمار، فقیر، نکبت میں گرفتار، تمھارے حال میں غور کی اور چاہا کہ اس کا نظیر بہم پہنچاؤں۔ واقعہ کربلا سے نسبت نہیں دے سکتا لیکن واللہ تمھارا حال اُس ریگستان میں بعینہٖ ایسا ہے جیسا مسلم ابن عقیل کا حال کوفے میں تھا۔ تمھارا خالق تمھاری اور تمھارے بچوں کی جان و آبرو کا نگہبان۔ میرے اور معاملات کلام و کمال سے قطع نظر کرو، وہ جو کسی کو بھیک مانگتے نہ دیکھ سکے اور خود در بہ در بھیک مانگے، وہ میں ہوں۔

صبح دوشنبہ، شانزدہم ازو صیام ۱۲۸۱ھ ۲
۱۳ فروری ۱۸۶۵ء

(۴۶)

صاحب!

کل تمھارا خط پہنچا۔ آج اُس کا جواب لکھ کر روانہ کرتا ہوں۔ رجب بیگ، شعبان بیگ، رمضان بیگ یہ نامور مہینے ہیں، سو خالی گئے۔ شوال بیگ آدمی کا نام نہیں سنا۔ ہاں عیدی بیگ ہوسکتا ہے۔ پس جب عید ہے اور روزِ سعید ہے تو کیا بعید ہے کہ بہ خلاف شہورِ ثلثۂ ماضیہ اس مہینے میں تم آسکو؟ ہے ہے، میں تو کہتا ہوں، نہ آسکو۔ اس ماہِ مبارک میں امضاے حکم سرکار کا وہ ہنگامہ گرم ہو کہ پارسیوں کی "عیدِ کوسہ برنشیں" کا گماں گزرے، دور کیوں جاؤ۔ ہولی کی ڈھلینڈی کا سماں لوہارو میں بندھ جائے۔ ایک خرسوار کی سواری بڑی دھوم سے نکلے۔ حسنِ اتفاق یہ کہ یہ وہی موسم ہے۔ ہولی اور "عیدِ کوسہ نشین" کا زمانہ باہم ہے، حوت کے آفتاب میں یہ دونوں تہوار ہوتے ہیں۔ کل آفتاب حوت میں آیا ہے۔ کوسہ برنشین اور ہولی کا مژدہ لایا ہے۔ خیر، میں چند روز اور ستم کشِ فراق اور تیرے دیدار کا مشتاق رہوں تو کوسہ برنشیں اور ہولی کی رنگ رلیاں منالے اور خرسوار کو ضربِ تازیانہ دوڑالے۔

علاءالدین خاں، واللہ تو میرا فرزندِ روحانیِ معنوی ہے۔ فرق اسی قدر ہے کہ میں جاہل ہوں اور تو مولوی ہے، ارے ظالم، اس "کوسہ برنشین" کی داد دے۔ عقل کرامت ہے، الہام ہے، لطفِ طبع ہے، کیا ہے؟ یہ اسم کس قدر مناسبِ مقام ہے۔

صبیہ کا مقدم تم پر مبارک ہو۔ ثاقب مجھ سے لڑتا تھا کہ بھتیجا ہے، میں کہتا تھا کہ پوتی ہے۔ بارے میں جیتا اور ثاقب ہارا۔ عریضہ جداگانہ استاد میر جان صاحب کے نام پہنچتا ہے۔

پنجشنبہ ۲۶ رمضان ۱۲۸۱ھ
۲۲ فروری ۱۸۶۵ء
غالب

(۴۷)

شکر ایزد کہ ترا با پدرت صلح فتاد
حوریاں رقص کناں ساغر شکرانہ زدند

قدسیاں بہرِ دعاے تو و والا پدرت
قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

میاں، تم جانتے ہو کہ میں عازمِ رام پور تھا۔ اسباب مساعد ہو گئے۔ بہ شرطِ حیات جمعے کو روانہ ہوں گا۔ لڑکے بالوں کی خیر و عافیت علی حسین خاں کی تحریر سے معلوم ہوتی رہتی ہے۔ میرا لکھنا زائد ہے۔ ایک بار میں صاحب کمشنر کی عیادت کو گیا تھا۔ فرخ مرزا بھی میرے ساتھ گیا تھا مزاج کی خبر پوچھ آیا۔ بھائی صاحب کو میرا سلام کہنا۔

یک شنبہ یکم اکتوبر ۱۸۶۵ء
راقم۔ غالب علی شاہ

(۴۸)

جانا علی شانا!

خط پہنچا، حظ اُٹھا۔ تمھاری آشفتہ حالی میں ہرگز شک نہیں۔ تم کہیں، قبائل کہیں، والیِ شہر ناسازگار، انجامِ کار ناپائدار، ایک دل اور سو آزار۔ اللہ تمھارا یاور۔ علی تمھارا مددگار۔ میں پا در رکاب، بلکہ نعل در آتش، کب جاؤں اور فرخ سیر کو دیکھوں۔ ایک خط میں نے علی حسین خاں کو لکھا۔ وہاں سے اُس کا جواب آگیا۔ روہیلا پھوڑے پھنسی میں مبتلا ہے۔ خدا اُس کو صحت دے۔ شمشاد علی بیگ کہاں الور پہنچا اور اس طرح گیا کہ شہاب الدین خاں سے بھی مل کر نہ گیا۔ خیر:

رموزِ مصلحتِ خویش خسرواں دانند

یہاں جشن کے وہ سامان ہو رہے ہیں کہ جمشید اگر دیکھتا تو حیران رہ جاتا۔ شہر سے دو کوس پر آغاز پور نامی ایک بستی ہے۔ آٹھ دس دن سے وہاں خیام برپا تھے۔ پرسوں صاحب کمشنرِ بہادر بریلی مع چند صاحبوں اور میموں کے آئے اور خیموں میں اُترے۔ کچھ کم سو صاحب اور میم جمع ہوتے۔ سب سرکارِ رام پور کے مہمان، کل سہ شنبہ، پانچ دسمبر حضورِ پر نور بڑے تجمل سے آغاز پور تشریف لے گئے۔

بارہ پر دو بجے گئے اور شام کو پانچ بجے خلعت پہن کر آئے۔ وزیر علی خاں خانساماں خواصی

میں سے روپیہ پھینکتا ہوا آتا تھا۔ دو کوس کے عرصے میں دو ہزار روپیے سے کم نہ نثار ہوا ہو گا۔ آج صاحبانِ عالی شان کی دعوت ہے۔ ٹِپن، شام کا کھانا یہیں کھائیں گے۔ روشنی، آتش بازی کی وہ افراط کہ رات، دن کا سامنا کرے گی۔ طوائف کا وہ ہجوم، حکام کا وہ مجمع کہ اس مجلس کو طوائف الملوک کہا چاہیے۔ کوئی کہتا ہے کہ صاحب کمشنر بہادر، مع صاحبانِ عالی شان کے کل جائیں گے۔ کوئی کہتا ہے پرسوں۔ رئیس کی تصویر کھینچتا ہوں: قد، رنگ، شکل، شمائل بعینہٖ بھائی ضیاء الدین خاں، عمر کا فرق اور کچھ کچھ چہرہ اور لحیہ متفاوت۔ حلیم و خلیق، باذل کریم متواضع، متشرع متورع، شعر فہم، سینکڑوں شعر یاد۔ نظم کی طرف توجہ نہیں۔ نثر لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں۔ جلا لائے طباطبائی کی طرز برتتے ہیں۔ شگفتہ جبیں ایسے کہ اُن کے دیکھنے سے غم کوسوں بھاگ جائے۔ فصیح بیان ایسے کہ اُن کی تقریر سن کر ایک اور نئی روح قالب میں آئے۔ اَللّٰھُمَّ اقْبَالَہٗ وَزَادَ اَجلَالَہٗ

بعد اختتام محافل طالبِ رخصت ہوں گا۔ بعد حصولِ رخصت دلّی جاؤں گا۔ بھائی صاحب کی خدمت میں بہ شرطِ رسائی و تابِ گویائی سلام کہنا اور بچوں کی خیر و عافیت جو تم کو معلوم ہوئی ہے، وہ مجھ کو لکھنا۔ چھٹے دسمبر ۱۸۶۵ء کی، بدھ کا دن، صبح کے آٹھ بجا چاہتے ہیں۔

۶ دسمبر ۱۸۶۵ء ‏کاتب کا نام ہے غالب ہے کہ تم جانتے ہو گے

(۴۹)

مرزا!

روبرو بہ، از پہلو، آؤ میرے سامنے بیٹھو۔ آج صبح کے سات بجے باقر علی خاں اور حسین علی بہ چودہ مرغ، چھ بڑے اور آٹھ چھوٹے، [۳]لے کے دلّی کو روانہ ہوئے۔ دو آدمی میرے اُن کے ساتھ گئے۔ کلو اور لڑکا نیاز علی یعنی ڈیڑھ آدمی میرے پاس ہیں۔ نواب صاحب نے وقتِ رخصت ایک ایک دوشالہ مرحمت کیا۔ مرزا نعیم بیگ ابن مرزا کریم بیگ دو ہفتے سے یہاں وارد اور اپنی بہن کے ہاں ساکن ہیں۔ کہتے ہیں کہ تیرے ساتھ دلّی چلوں گا اور وہاں سے لوہارو جاؤں گا۔ میرے چلنے کا حال یہ ہے کہ اِنشاءَ اللہ تعالیٰ اِسی ہفتے میں چلوں گا۔

آپ چال چوکے۔ اردو لکھتے لکھتے جو خط کہ مشتمل ایک مطلب پر تھا، اُس کو تم نے فارسی میں لکھا اور فارسی بھی متصدیانہ کہ امیر کو اور اپنے بزرگ کو کبھی بہ صیغۂ مفرد نہ لکھیں، یہ وہی چھوٹی "ہے"، بڑی "حے" کا قصہ ہے۔ خیر، خط نہ دکھاؤں گا۔ ما کتب فیہ کہہ کر کام نکال لوں گا۔ میں نے تو چلتے وقت فرخ سیر کے اتالیق کی زبانی بھائی کو کہلا بھیجا تھا کہ تم اگر کوئی اپنا مدعا کہو تو میں اُس کی درستی کرتا لاؤں۔ جواب آیا کہ اور کچھ مدعا نہیں، صرف مکان کا مقدمہ ہے۔ سو اُس مقدمے میں میرے اور میرے شرکا کا وکیل وہاں موجود ہے۔ اگر وہ اُس امر کا ذکر کرتے تو میں اُن سے اُن کے خالو علی اصغر خاں کے نام عرضی یا خط لکھوا لاتا۔ بہ ہر حال، اب بھی قاصر نہ رہوں گا۔ تاریخ اوپر لکھ آیا۔ نام اپنا بدل کر مغلوب رکھ لیا ہے۔ فقط۔

جمعہ ۲۲ دسمبر ۱۸۶۵ء بارہ پر دو بجے تین کا عمل[۲]

(۵۰)

صاحب!

تمھارا خط پہنچا۔ مطالب دل نشیں ہوئے۔ غوغائے خلق سے مجھ کو غرض نہیں۔ کیا اچھی رباعی ہے کسی کی:

مومن بہ خیال خویش مستم داند
کافر بگماں، خدا پرستم داند
مُردم ز غلط فہمیِ مردم، مُردم
اے کاش کسے، ہر آنچہ ہستم، داند

بھائیوں سے پھر نہیں ملا، بازار میں نکلتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ جواہر، خبردار میرا سلام اخوین کو اور اُن کا سلام مجھ کو پہنچا دیتا ہے، اِسی کو غنیمت جانتا ہوں:

تاب لائے ہی بنے گی غالبؔ
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان، لیکن پھر بھی کم نکلے

یہ مقطع اور مطلع مندرجۂ دیوان ہے، مگر اس وقت یہ دونوں شعر حسبِ حال نظر آئے اس واسطے لکھ دیے گئے۔ تم نے اشعارِ جدید مانگے، خاطر تمھاری عزیز۔ ایک مطلع صرف دو مصرعے آگے کے کہے ہوئے یاد آگئے کہ وہ داخلِ دیوان بھی نہیں۔ اُن پر فکر کر کے ایک مطلع اور پانچ شعر لکھ کر سات بیت کی ایک غزل تم کو بھیجتا ہوں۔ بھائی! کیا کہوں کہ کس مصیبت سے یہ چھے بیتیں ہاتھ آئی ہیں اور وہ بھی بلند رتبہ نہیں:

بہت سہی غمِ گیتی، شراب کم کیا ہے
غلامِ ساقیِ کوثر ہوں، مجھ کو غم کیا ہے

مطلعِ ثانی :

رقیب پر ہے اگر لطف، تو ستم کیا ہے
تمھاری طرز و روش جانتے ہیں ہم، کیا ہے
کٹے تو شب کہیں، کاٹے تو سانپ کہلاوے
کوئی بتاؤ کہ وہ زلفِ خم بہ خم کیا ہے
لکھا کرے کوئی احکامِ طالعِ مولود
کسے خبر ہے کہ واں جنبشِ قلم کیا ہے
نہ حشر و نشر کا قائل نہ کیش و ملت کا
خدا کے واسطے، ایسے کی پھر قسم کیا ہے
وہ داد و دید گرانمایہ شرط ہے ہم دم
وگرنہ مہرِ سلیماں و جامِ جم کیا ہے
سخن میں خامۂ غالب کی آتش فشانی
یقیں ہے ہم کو بھی لیکن اب اُس میں دم کیا ہے

لو صاحب، تمھارا فرمان قضا توامان بجالایا مگر اس غزل کا مسودہ میرے پاس نہیں ہے۔ اگر بہ احتیاط رکھو گے اور اردو کے دیوان کے حاشیے پر چڑھادو گے تو اچھا کرو گے۔ عمر فراواں و دولت فزوں باد۔ فقط۔

۲۲ دسمبر۔ ۲۶ دسمبر ۱۸۶۵ء [۱]

(۵۱)

جانا جانا !

ایک خط میرا، تمھارے دو خطوں کے جواب میں تم کو پہنچا ہوگا۔ آج میں علی اصغر خاں بہادر کے گھر گیا۔ اُن سے میں نے تذکرہ کیا۔ فرمایا کہ فرخ سیر کی ماں کو لکھ بھیجو کہ سال بھر کی تنخواہ کی رسید بھیج دیں۔ یہاں سے روپیہ بھیج دیا جائے گا۔

آج منگل ہے، سات شعبان کی اور چھبیس دسمبر کی، دونوں بھتیجے تمھارے جمعے کے دن بائیس دسمبر کو روانۂ دہلی ہوئے۔ میں پرسوں یوم الخمیس[۲] کو مرحلہ پیما ہوں گا۔

اولِ ما آخرِ ہر منتہی؛ در اکرام و عزت
آخرِ ما جیب تمنّا تہی؛ از مال و دولت

تو کمان کر[۳] وہ کہا کر، فارسی بھگا کر، مجھ سے ہندی کی چندی سن۔ ایک غلیل حضور نے دینی کی ہے۔ ایک علی اصغر خاں سے اینٹھی[۴]، دونوں کل آئیں گی۔ مرزا نعیم بیگ ابن مرزا کریم بیگ دو تین ہفتے سے یہاں وارد اور اپنی بہن کے ہاں ساکن ہیں۔ زاد کی خدا نے چھٹی فقیر پر کی، راحلہ وہ جانیں۔ فقط۔

۷ شعبان ۱۲۸۲ھ
۲۶ دسمبر ۱۸۶۵ء غالب

(۵۲)

میاں !

چلتے وقت تمھارے چچا نے غلیل کی فرمائش کی تھی۔ رام پور پہنچ کر وہ بے سعی و تلاش

ہاتھ آگئی، بنوا رکھی۔ لڑکوں نے، ملازموں نے، سب نے مجھ سے سن لیا کہ یہ نواب ضیاء الدین خاں کے واسطے ہے۔ اب چلنے سے ایک ہفتے پہلے تم نے غلیل مانگی، بھائی کیا بتاؤں کہ کتنی جستجو کی، کہیں بہم نہ پہنچی۔ دس روپے تک مول کو نہ ملی۔ نواب صاحب سے مانگی، توشہ خانے میں بھی نہ تھی۔ ایک امیر کے ہاں پتا لگا، دوڑا ہوا گیا۔ کھپچی موجود پائی۔ لیکن کیا کھپچی؟ جیسے نجف خاں کے عہد کے تورانیوں میں ہماری تمہاری ہڈی۔ بنوانے کی فرصت کہاں؟ آج لی، کل چل دیا۔ اس بانس کی قدر کرنا اور اس کو اچھی طرح بنوا لینا[2]۔ بادشاہ فرخ سیر اور اُس کے اخوان خوش و خرم ہیں۔ فرخ سیر کی ماں نے باجرے کا حلوہ سوہن[3] کھلایا۔

شنبہ ۲۵ شعبان ۱۲۸۲ھ

۱۴ جنوری ۱۸۶۶ء[4]

نجات کا طالب۔ غالب

(۵۳)

میاں!

مدعا اصلی ان سطور کی تحریر سے یہ ہے کہ اگر کل کمیٹی میں گئے ہو تو میرے سوال کے پڑھے جانے کا حال لکھو۔

ضمناً ذکر ایک مدبر کا لکھا جاتا ہے جو تم نے اس مدبر کے صفات لکھے، سب سچ ہیں۔ احمق، خبیث النفس، حاسد، طبیعت بری، سمجھ بری، قسمت بُری، ایک بار میں نے دکنی کی دُشمنی میں گالیاں کھائیں۔ ایک بار بنارسی کی دوستی میں گالیاں کھاؤں گا۔ میں نے جو تمھیں اس کے باب میں لکھا تھا، وجہ اُس کی یہ تھی کہ میں نے سنا تھا کہ تم نے اپنے سائیسوں سے کہہ دیا ہے یا کہا چاہتے ہو کہ اس کو بازار میں بے حرمت کریں۔ یہ خلاف شیوۂ مومنین ہے۔ خلاصہ یہ کہ یہ قصد نہ کرنا۔ یہ موید اُس قول کا ہے جو میں نے تم سے پہلے کہا تھا کہ تم یوں تصور کرو کہ اس نام کا آدمی اس محلے میں بلکہ اس شہر میں کوئی نہیں۔

۲۸ جولائی ۱۸۶۵ء کے بعد[5]

غالب

(۵۴)

خوشی ہے یہ آنے کی برسات کے
پئیں بادۂ ناب اور آم کھائیں
سر آغازِ موسم میں، اندھے ہیں ہم
کہ دلّی کو چھوڑیں، لوہارو کو جائیں
سوا ناج کے جو ہے مقلوبِ جاں
نہ واں آم پائیں، نہ انگور پائیں
ہوا حکم باورچیوں کو کہ ہاں
ابھی جا کے پوچھو کہ کل کیا پکائیں
وہ کھٹے، کہاں پائیں، املی کے پھول
وہ کڑوے کریلے کہاں سے منگائیں
فقط گوشت، سو بھیڑ کا ریشے دار
کہو، اس کو، کیا، کھا کے ہم حظ اٹھائیں

قطعہ

خوانی بہ سوے خویش و ندانی کہ مردہ ام
دانی کہ مردہ را رہ و رسم خرام نیست
نے شیخ سدو ام، نہ الٰہ بخش، مرگ من
از عالم جنابت و مرگ حرام نیست

۱۸۶۵ء - ۱۸۶۷ء

(۵۵)

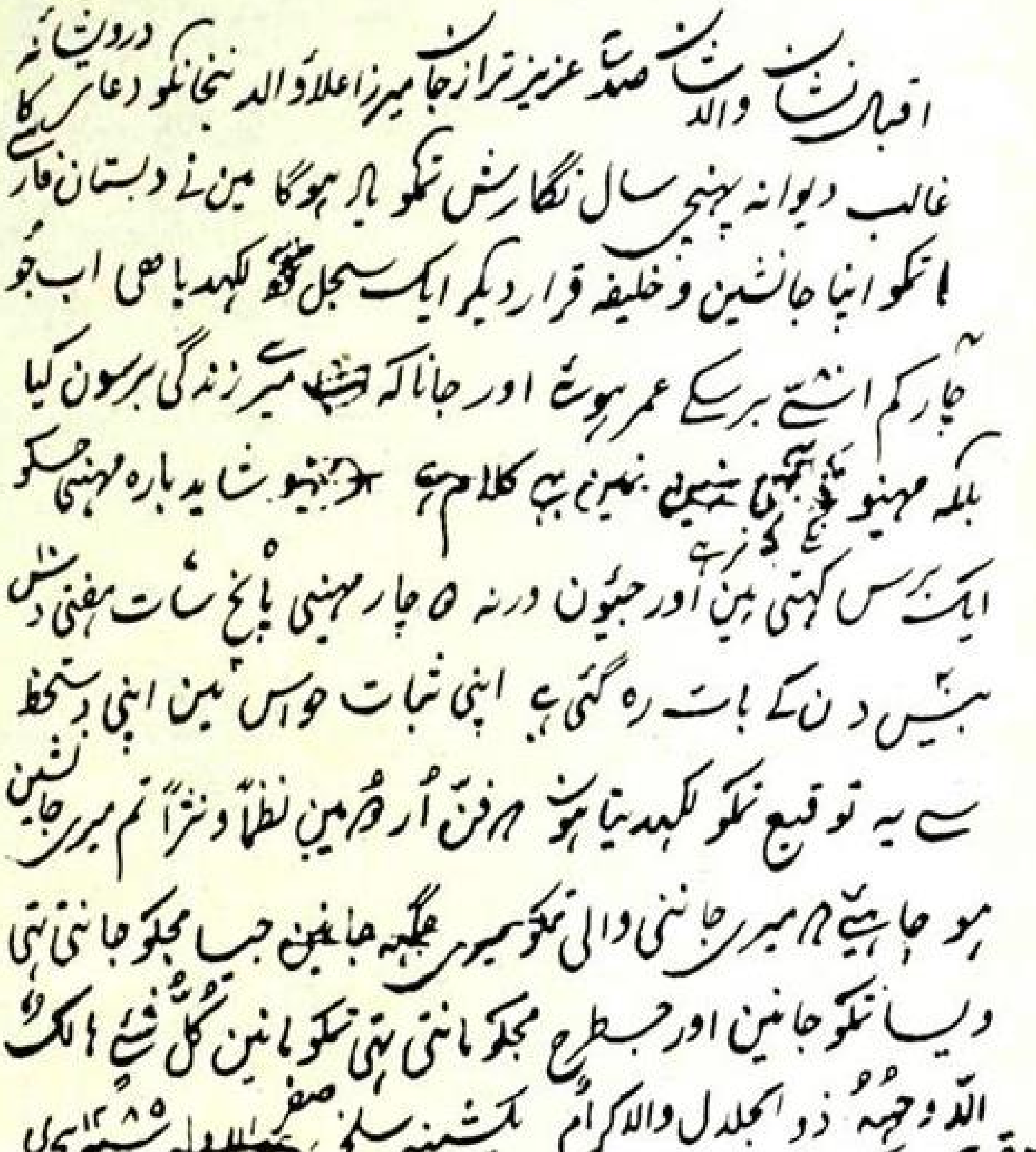

اقبال نشان والا شان صدہ عزیز تر از جان میرزا علاء الدین خانکو دعاے درویشانہ
غالب دیوانہ پہنچے سال نگارش تمکو یاد ہوگا مین نے دبستان فارسی کا
تمکو اپنا جانشین و خلیفہ قرار دیکر ایک سجل تمکو لکھدیا ہے اب جو
چار کم اسّی برس کی عمر ہوئی اور جانا کہ میری زندگی برسون کیا
بلکہ مہینون کی بھی نہین نہین ہے کلام ہے مہینوں شاید بارہ مہینے جسکو
ایک برس کہتے ہین اور جیون ورنہ دو چار مہینے پانچ سات ہفتے دس
بیس دن کی بات رہ گئی ہے اپنی ثبات حواس مین اپنے دستخط
سے یہ توقیع تمکو لکھدیتا ہون ہر فن اردو مین نظماً و نثراً تم میرے جانشین
ہو جاہیے ہر میرے جاننے والے تمکو میری جگہ جانین جسطرح مجکو جانتے تہے
ویسا تمکو جانین اور جسطرح مجکو مانتے تہے تمکو مانین کُلُّ شیءٍ ہالکٌ
الا وجہہٗ ذو الجلال والاکرام یکشنبہ سلخ صفر ۱۲۸۵ ہجری
یبقیٰ وجہ ربک

۲۱ جون ۱۸۶۸ء

اقبال نشان والا شان، صدرہ عزیز تر از جان، مرزا علاء الدین خان کو دعاے درویشانہ غالبِ دیوانہ پہنچے۔

سال نگارش تم کو یاد ہو گا۔ میں نے دبستانِ فارسی کا تم کو اپنا جانشین و خلیفہ قرار دے کر ایک سجل لکھ دیا ہے۔ اب جو چار کم اسّی برس کی عمر ہوئی اور جانا کہ میری زندگی برسوں کیا بلکہ مہینوں کی نہ رہی۔ شاید بارہ مہینے جس کو ایک برس کہتے ہیں اور جیوں، ورنہ دو چار مہینے پانچ سات ہفتے دس بیس دن کی بات رہ گئی ہے۔ اپنے ثباتِ حواس میں اپنے دستخط سے یہ

توقیع تم کو لکھ دیتا ہوں کہ فن اردو میں نظماً و نثراً تم میرے جانشین ہو۔ چاہیے کہ میرے جاننے والے جیسا مجھ کو جانتے تھے، ویسا تم کو جانیں اور جس طرح مجھ کو مانتے تھے، تم کو مانیں۔

کُلّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلّاَ وَجه وَیبقیٰ وجه رَبّكَ ذُوالْجَلَال وَالْاِكْرَام۔

یکشنبہ سلخ صفر ۱۲۸۵ھ

۲۱ جون ۱۸۶۸ء دہلی

(۵۶)

سعادت و اقبال نشان مرزا علاء الدین خان بہادر کو فقیر اسد اللہ کی دعا پہنچے۔ کل شام کو مخدوم مکرم جناب آغا محمد حسین صاحب شیرازی ’بہ سواری ریل‘ مانند دولتِ دلخواہ کہ ناگاہ آوے، فقیر کے تکیے میں تشریف لائے۔ شب کو جناب ڈپٹی ولایت حسین خاں کے مکان میں آرام فرمایا، اب وہاں آتے ہیں۔ قریبِ طلوعِ آفتاب، بہ چشمِ نیم باز، یہ رقعہ تمھارے نام لکھا ہے۔ جو کچھ جی چاہتا ہے، وہ مفصل نہیں لکھ سکتا۔ مختصر مفید: آغا صاحب کو دیکھ کر یوں سمجھنا کہ میرا بوڑھا چچا غالب جوان ہو کر میلے کی سیر کو حاضر ہوا ہے۔ پس نور چشمانِ راحت جان مرزا باقر علی خاں بہادر و مرزا حسین علی خاں بہادر جناب آغا صاحب کا قدم بوس بجا لائیں اور اُن کی خدمت گزاری کو اپنی سعادت اور میری خوشنودی سمجھیں، بس۔

ہاں مرزا علائی اگر کرنیل الکزنڈر اسکنر بہادر سے ملاقات ہو تو میرا سلام کہنا۔

غالب

(۵۷)

میاں!

میں تمھارے باپ کا تابع، تمھارا مطیع، فرخ مرزا کا فرماں بردار مگر ابھی اٹھا ہوں، اپنے کو بھی نہیں سمجھا کہ میں کون ہوں۔ آج فرخ صاحب کے نام کا رقعہ پہنچ جائے گا۔ چھپے جز تمھارے دیے ہوئے میر مہدی حسین صاحب کو دیے اور باقی دن چڑھے، اعیان مطبع جمع ہو لیں تو

وہ اوراق بھی منگا دوں!

غالب

(۵۸)

صاحب!

بہت دن سے تمھارا خط نہیں آیا۔ آپ کا وکیل بڑا چرب زبان ہے مقدمہ اُس نے جیت لیا۔ چنانچہ اُس کی تحریر سے تم کو معلوم ہوا ہوگا۔ سنتا ہوں کہ حمزہ خاں کو ان دنوں علّتِ مشائخ کا زور ہے اور سعدی کی اس بات پر عمل کرتے ہیں:

کسا نیکہ یزداں پرستی کنند
بہ آوازِ دولاب مستی کنند

خدا مبارک کرے۔

متن کے مآخذ

اِس باب میں پہلے تو خطوطِ غالبؔ کے اُن مجموعوں، مختلف کتابوں اور رسالوں کی فہرست دی گئی ہے، جنہیں متن کے مآخذ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ پھر ہر خط کا پہلا فقرہ نقل کیا گیا ہے۔ خط کی تاریخِ تحریر دے کر اُس کے متن کے مآخذ کی نشان دہی کی گئی ہے، اگر کسی خط کے متن کے مآخذ کے طور پر ایک سے زیادہ کتابوں کا حوالہ دیا گیا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ پہلے مآخذ کے متن کو بنیادی نسخے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے اور باقی مآخذ سے متن کا موازنہ کیا گیا ہے۔

۱۔ خطوطِ غالبؔ کے عکس۔

۲۔ معارف، اعظم گڑھ، دسمبر ۱۹۲۲ء (معارف)

۳۔ اُردوے معلّٰی، مطبع اکمل المطابع، دہلی، ۱۸۶۹ء (اُردوے معلّٰی)

۴۔ عودِ ہندی، مطبعِ مجتبائی، میرٹھ، ۱۸۶۸ء (عودِ اوّل)

۵۔ عودِ ہندی، مطبعِ مجتبائی، میرٹھ، ۱۸۶۸ء (عودِ ہندی کا ری پرنٹ بھی ساتھ ہی چھپا تھا، تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: ص ص ۳۳-۳۶) (عودِ دوم)

۶۔ اُردوے معلّٰی، حصہ اول مع حصہ دوم، مطبعِ نامی مجتبائی، دہلی، ۱۸۹۹ء (اردوے معلّٰی مجتبائی)

۷ - تلاشِ غالب، ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، دلی، ۱۹۶۹ء (تلاشِ غالب)

۸ - نقوش، لاہور، مکاتیب نمبر (نقوش، مکاتیب نمبر)

مرزا ہرگوپال تفتہ

۱ - صاحب! دوسرا پارسل جس کو تم نے بہ تکلف خط بنا کر بھیجا، پہنچا۔

اردوئے معلٰی مجتبائی حصہ ۲، ص ۳۹ — ۱۸۴۷ء یا اس سے قبل

۲ - مہاراج! آپ کا مہربانی نامہ پہنچا۔

(اردوئے معلٰی ص ۸۲) — مئی ۱۸۴۸ء

۳ - بھائی! یہ مصرع جو تم کو ہم پہنچا ہے، فنِ تاریخ گوئی میں اس کو کرامت اور اعجاز کہتے ہیں۔

(اردوئے معلٰی مجتبائی حصہ ۲، ص ۲۱) — اگست ۱۸۵۰ء

۴ - کیوں مہاراج، کول میں آنا اور منشی نبی بخش صاحب کے ساتھ غزل خوانی کرنی اور ہم کو یاد نہ لانا۔

(اردوئے معلٰی ص ۱۱۵) — ۴ جنوری ۱۸۵۲ء

۵ - شفیق بالتحقیق منشی ہرگوپال تفتہ ہمیشہ سلامت رہیں۔

(اردوئے معلٰی ص ۷۶) — ۲۱ فروری ۱۸۵۲ء

۶ - بندہ پرور! "بیش از بیش و کم از کم" یہ ترکیب بہت فصیح ہے۔

(اصل خط) — ۲۲ مارچ ۱۸۵۲ء

۷ - کاشانۂ دل کے ماہِ دو ہفتہ، منشی ہرگوپال تفتہ، تحریر میں کیا کیا سحر طرازیاں کرتے ہیں۔

(اردوئے معلٰی ص ۷۶) — ۱۸ جون ۱۸۵۲ء

۸۔ کل تمھارا خط آیا۔ رازِ نہانی مجھ پر آشکارا ہوا۔
(اردوے معلّیٰ ص ۱۱۳) ۱۰ دسمبر ۱۸۵۲ء

۹۔ صاحب! دیکھو، پھر تم دنگا کرتے ہو۔

(اردوے معلّیٰ مجتبائی حصہ ۲ ص ۳۸) ۱۸۵۲ء

۱۰۔ واہ! کیا خوبیِ قسمت ہے میری۔
(اردوے معلّیٰ مجتبائی حصہ ۲، ص ۱۵) ۱۸۵۲ء

۱۱۔ بھائی! پرسوں شام کو ڈاک کا ہرکارہ آیا اور ایک خط تمھارا اور ایک خط جانی جی کا لایا۔
(اردوے معلّیٰ ص ۹۵) ۲۵ فروری ۱۸۵۳ء

۱۲۔ بھائی! آج مجھ کو بڑی تشویش ہے اور یہ خط میں تم کو کمال سراسیمگی میں لکھتا ہوں۔
(اردوے معلّیٰ ص ۶۰) ۲۸ مارچ ۱۸۵۳ء

۱۳۔ پرسوں تمھارا خط آیا۔ حال جو معلوم تھا، وہ پھر معلوم ہوا۔
(اردوے معلّیٰ ص ۹۵) دسمبر ۱۸۵۲ء

۱۴۔ آج منگل کے دن پانچویں اپریل کو تین گھڑی دن رہے ڈاک خانہ کا ہرکارہ آیا۔
(اردوے معلّیٰ ص ۴۵) ۶ اپریل ۱۸۵۳ء

۱۵۔ بھائی! ہاں میں نے "زبدۃ الاخبار" میں دیکھا کہ رانی صاحب مر گئیں۔
(اردوے معلّیٰ ص ۱۱۷) اپریل ۱۸۵۳ء

۱۶۔ بھائی! تم نے مجھے کونسا دو چار سو روپے کا نوکر یا پنسن دار قرار دیا ہے۔
(اردوے معلّیٰ ص ۱۱۲) ۳۰ مئی ۱۸۵۳ء

۱۷۔ عجب تماشا ہے، بابو صاحب لکھ چکے ہیں کہ ہردیو سنگھ آ گیا۔
(اردوے معلّیٰ ص ۱۱۸) ۵ جون ۱۸۵۳ء

۱۸۔ تمھاری خیر و عافیت معلوم ہوئی۔ غزل نے محنت کم لی۔

(اردوئے معلّٰی ص ۴۶) 9 جون ۱۸۵۳ء

۱۹۔ بھائی! جس دن تم کو خط بھیجا۔

(اردوئے معلّٰی ص ۴۷) ۱۴ جون ۱۸۵۳ء

۲۰۔ بھائی! میں نے مانا تمھاری شاعری کو۔

(اردوئے معلّٰی ص ۶۰) ۲۱ اگست ۱۸۵۳ء

۲۱۔ میں تم کو خط بھیج چکا ہوں، پہنچا ہوگا۔

(اردوئے معلّٰی مجتبائی حصہ ۲ ص ۳۷) اکتوبر ۱۸۵۳ء

۲۲۔ "دیدمست"، یہ لفظ نیا بنایا ہے۔

(اردوئے معلّٰی مجتبائی حصہ ۲ ص ۲۸) ۱۳ جنوری ۱۸۵۴ء

۲۳۔ بندہ پرور! ایک مہربانی نامہ سکندرآباد سے اور ایک علی گڑھ سے پہنچا۔

(اردوئے معلّٰی ص ۷۰) ۲۳ فروری ۱۸۵۴ء

۲۴۔ منشی صاحب! تمھارا خط اس دن یعنی کل بدھ کے دن پہنچا۔

(اردوئے معلّٰی ص ۷۸) ۲ مارچ ۱۸۵۴ء

۲۵۔ شفیق میرے لالہ ہرگوپال تفتہ میرا قصور معاف کریں۔

(تلاشِ غالب ص ۸۵) جون ۱۸۵۴ء

۲۶۔ میرا اسلام پہنچے، خط اور کاغذ اشعار پہنچا۔

(اردوئے معلّٰی ص 119) جولائی ۱۸۵۴ء

۲۷۔ صاحب! دیباچہ و تقریظ کا لکھنا ایسا آسان نہیں ہے کہ جیسا تم کو دیوان کا لکھ لینا۔

(اردوئے معلّٰی مجتبائی حصہ ۲ ص ۲۸) اپریل، مئی ۱۸۵۵ء

۲۸۔ تمھارا خط پہنچا۔ مجھ کو بہت رنج ہوا۔

(اردوے معلّٰی ص ۸۳) قبل ۱۸۵۵ء

۲۹۔ صاحب! تم جانتے ہو کہ یہ معاملہ کیا ہے اور کیا واقع ہوا۔

(اردوے معلّٰی ص ۸۷) ۵ دسمبر ۱۸۵۷ء

۳۰۔ آج سنیچر بار کو دوپہر کے وقت ڈاک کا ہرکارہ آیا۔

(اردوے معلّٰی ص ۸۰) ۳۰ جنوری ۱۸۵۸ء

۳۱۔ از عمر و دولت برخوردار باشند۔

(اردوے معلّٰی ص ۸۵) ۳ فروری ۱۸۵۸ء

۳۲۔ صاحب! تم نے لکھا تھا کہ میں جلد آگرے جاؤں گا۔

(اردوے معلّٰی ص ۸۴) ۵ مارچ ۱۸۵۸ء

۳۳۔ جانِ من و جانانِ من! کل میں نے تم کو سکندرآباد میں سمجھ کر خط بھیجا۔

(اردوے معلّٰی ص ۹۷) ۶ مارچ ۱۸۵۸ء

۳۴۔ صاحب! تمھاری سعادت مندی کو ہزار ہزار آفریں۔

(اردوے معلّٰی ص ۱۱۵) ۱۲ مارچ ۱۸۵۸ء

۳۵۔ صاحب! کیوں مجھے یاد کیا۔ کیوں خط لکھنے کی تکلیف اٹھائی۔

(اردوے معلّٰی ص ۴۸) ۱۲ اپریل ۱۸۵۸ء

۳۶۔ مرزا تفتہ! عجب اتفاق ہوا۔ پنجشنبے کے دن ۲۲ اپریل کو کلیان خط ڈاک میں ڈال کر آیا۔

(اردوے معلّٰی ص ۶۴) ۲۵ اپریل ۱۸۵۸ء

۳۷۔ صاحب! پچیس اپریل کو ایک خط اور ایک پارسل ڈاک میں ارسال کر چکا ہوں۔

(اردوے معلّٰی ص ۵۵) ۳۰ اپریل ۱۸۵۸ء

۳۸۔ بھائی! وہ خط پہلا تم کو بھیج چکا تھا کہ بیمار ہو گیا۔
(اردوے معلّی ص ۱۰۶) ۲۴ مئی ۱۸۵۸ء

۳۹۔ کیوں صاحب! مجھ سے کیوں خفا ہو؟
(اردوے معلّی ص ۷۳) ۱۹ جون ۱۸۵۸ء

۴۰۔ جیتے رہو اور خوش رہو۔
(اردوے معلّی ص ۱۰۴) ۲۶ جون ۱۸۵۸ء

۴۱۔ مرزا تفتہ کو دعا پہنچے۔ بہت دن سے خط کیوں نہیں لکھا؟
(اردوے معلّی ص ۸۷) ۱۸ جولائی ۱۸۵۸ء

۴۲۔ مرزا تفتہ! کل قریب دوپہر کے ڈاک کا ہرکارہ، وہ جو خط بانٹا کرتا ہے آیا۔
(اردوے معلّی ص ۵۸) ۲۸ جولائی ۱۸۵۸ء

۴۳۔ رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
(اردوے معلّی ص ۱۲۳ عود اول، ص ۹۹ جون، جولائی ۱۸۵۸ء
عود دوم، ص ۹۹)

۴۴۔ مرزا تفتہ! تمھارے اوراقِ مثنوی کا پمفلٹ پاکٹ پرسوں پندرہ اگست کو۔
(اردوے معلّی ص ۴۸) ۱۷ اگست ۱۸۵۸ء

۴۵۔ صاحب! عجب اتفاق ہے۔ آج صبح کو ایک خط تم کو اور ایک خط، جاگیر کے گاؤں
کی تہنیت میں اپنے شفیق کو ڈاک میں بھیج چکا تھا۔
(اردوے معلّی ۹۶) ۲۳ اگست ۱۸۵۸ء

۴۶۔ نورِ نظر و لختِ جگر مرزا تفتہ! تم کو معلوم رہے کہ رلے صاحب مکرم و معظم۔ الخ
(اردوے معلّی ص ۹۱) ۲۸ اگست ۱۸۵۸ء

۴۷۔ بھائی! تمھارا وہ خط، جس میں اوراقِ مثنوی ملفوف تھے۔
(اردوے معلّی ص ۵۶) اگست ۱۸۵۸ء

۴۸۔ صاحب! عجب تماشا ہے۔ تمھارے کہے سے منشی شیونراین صاحب کو خط لکھا تھا۔

(اردوے معلیٰ ص ۱۲۱) ۱ ستمبر ۱۸۵۸ء

۴۹۔ لِلّٰہ الشکر، تمھارا خط آیا اور دلِ سودا زدہ نے آرام پایا۔

(اردوے معلیٰ ص ۵۰) ۳ ستمبر ۱۸۵۸ء

۵۰۔ مرزا تفتہ کو دعا پہنچے۔ دونوں فقرے جس محل پر بتائے ہیں۔

(اردوے معلیٰ ص ۵۲) ۳-۶ ستمبر ۱۸۵۸ء

۵۱۔ مشفق میرے کرم فرما میرے! تمھارا خط اور تین دو ورقے چھاپے کے پہنچے۔

(اردوے معلیٰ ص ۱۰۳) ۷ ستمبر ۱۸۵۸ء

۵۲۔ اچھا میرا بھائی ”نہیب“ والے دو ورقے چار سو ہوں، پانسو ہوں۔ سب بدلوا ڈالنا۔

(اردوے معلیٰ ص ۷۲) ۱۶ ستمبر ۱۸۵۸ء

۵۳۔ بھائی! مجھ میں تم میں نامہ نگاری کا ہے کو ہے، مکالمہ ہے۔

(اردوے معلیٰ ص ۵۸) ۱۷ ستمبر ۱۸۵۸ء

۵۴۔ بھائی! آج صبح کو بہ سبب حکیم صاحب کے تقاضے کے، شکوہ آمیز خط جناب مرزا صاحب کی خدمت میں لکھ کر بھیجا۔

(اردوے معلیٰ ص ۱۰۱) ۲۰ ستمبر ۱۸۵۸ء

۵۵۔ صاحب! قصیدے کے چھاپے جانے کی بشارت صاحبِ مطبع نے مجھ کو بھی دی ہے۔

(اردوے معلیٰ ص ۶۷) ۲۱ ستمبر ۱۸۵۸ء

۵۶۔ کیوں صاحب، اس کا کیا سبب ہے کہ بہت دن سے ہماری آپ کی ملاقات نہیں ہوئی۔

(اردوے معلیٰ ص ۱۲۰) ۳ نومبر ۱۸۵۸ء

۵۷۔ اللہ اللہ، ہم تو کول سے تمھارے خط کے آنے کے منتظر تھے۔

(اردوے معلیٰ ص ۱۰۷) ۳ نومبر ۱۸۵۸ء

۵۸۔ کیوں صاحب! کیا یہ آئین جاری ہوا ہے کہ سکندر آباد کے رہنے والے دلّی کے خاک نشینوں کو خط نہ لکھیں۔

(اردوئے معلّٰی ص ۵۴)

۱۳ نومبر ۱۸۵۸ء

۵۹۔ آج پنجشنبے کے دن اٹھارہ نومبر کو تمہارا خط آیا اور میں آج ہی جواب لکھتا ہوں۔

(اردوئے معلّٰی ص ۷۰)

۱۸ نومبر ۱۸۵۸ء

۶۰۔ برخوردار! تمہارا خط پہنچا۔ اصلاحی غزل کی رسید معلوم ہوئی۔

(اردوئے معلّٰی ص ۱۰۵)

۲۰ نومبر ۱۸۵۸ء

۶۱۔ میرزا تفتہ تمہارا خط آیا۔ فقیر کو حقیر کا حال معلوم ہوا۔

(اردوئے معلّٰی ص ۹۲)

۲۷ نومبر ۱۸۵۸ء

۶۲۔ صاحب! تمہارا خط آیا۔ میں نے اپنے سب مطالب کا جواب پایا۔

(اردوئے معلّٰی ص ۶۵)

۱۹ دسمبر ۱۸۵۸ء

۶۳۔ کیوں صاحب! روٹھے ہی رہو گے یا کبھی منو گے بھی؟

(اردوئے معلّٰی ص ۸۱)

۲۷ دسمبر ۱۸۵۸ء

۶۴۔ دیکھو صاحب! یہ باتیں ہم کو پسند نہیں۔

(اردوئے معلّٰی ص ۶۶)

۳ جنوری ۱۸۵۹ء

۶۵۔ صاحب! تمہارا خط مع رقعۂ مردِ سخن فہم پہنچا۔

(اردوئے معلّٰی ص ۵۸)

۲۶ جنوری ۱۸۵۹ء

۶۶۔ صاحب! میرٹھ سے آکر تم کو خط لکھ چکا ہوں۔

(اردوئے معلّٰی ص ۸۴)

۳۰ جنوری ۱۸۵۹ء

۶۷۔ صاحب! تم تو اچھے خاصے عارف ہو۔

(اردوئے معلّٰی ص ۸۷)

۱۹ فروری ۱۸۵۹ء

۶۸۔ صاحب! تمھارا خط آیا، دل خوش ہوا۔

(اردوے معلّی ص ۸۹) ۲۷ فروری ۱۸۵۹ء

۶۸۔ اجی مرزا تفتہ، بھائی منشی نبی بخش کو تمھارے حال کی بڑی پرسش ہے۔

اردوے معلّی کی بعد کی اشاعتوں میں یہ پیراگراف "اجی مرزا تفتہ" الخ ایک الگ خط بنا دیا گیا ہے۔ یہ درست نہیں۔ یہ خط نمبر ۶۸ (صاحب تمھارا خط آیا دل خوش ہوا) الخ۔ کا آخری پیراگراف ہے۔ اردوے معلّی کی پہلی اشاعت میں یہ دونوں خط ایک ہیں۔

۶۹۔ کیوں مرزا تفتہ، تم بے وفا یا میں گنہ گار؟

(اردوے معلّی ص ۹۰) ۲۷ مارچ ۱۸۵۹ء

۷۰۔ صاحب! آج تمھارا خط صبح کو آیا۔ میں دوپہر کو جواب لکھتا ہوں۔

(اردوے معلّی ص ۱۰۷) ۵ جون ۱۸۵۹ء

۷۱۔ صاحب! ہم تمھارے اخبار نویس ہیں اور تم کو خبر دیتے ہیں کہ برخوردار میر بادشاہ آئے ہیں۔

(اردوے معلّی ص ۸۸) ۱۷ جون ۱۸۵۹ء

۷۲۔ صاحب! ایک خط تمھارا پرسوں آیا۔ اس میں مندرج کہ میں میرٹھ جاؤں گا۔

(اردوے معلّی ص ۱۷) ۲۹ جون ۱۸۵۹ء

۷۳۔ بھائی! تمھارے ذہن نے خوب انتقال کیا۔

(اردوے معلّی مجتبائی حصہ ۲ ص ۲۵) ۸ اکتوبر ۱۸۵۸ء

۷۴۔ صاحب! تمھارا خط آیا، حال معلوم ہوا

(اردوے معلّی ص ۹۶) ۵ نومبر ۱۸۵۹ء

۷۵۔ میری جان! کیا سمجھے ہو؟ سب مخلوقات تفتہ و غالب کیوں کر بن جائیں۔؟

(اردوے معلّی ص ۵۷) ۲۳ دسمبر ۱۸۵۹ء

۷۶۔ بھائی! میں نے دلّی کو چھوڑا اور رام پور کو چلا۔

(اردوے معلّٰی ص ۸۶) ۲۱ جنوری ۱۸۵۸ء

۷۷۔ صاحب! تمھارے یہ اوراق سکندر آباد سے دلّی اور دلّی سے رام پور پہنچے۔

(اردوے معلّٰی مجتبائی حصہ ۲ ص ۳۵) اوائل فروری ۱۸۶۰ء

۷۸۔ میری جان! آخر لڑکے ہو، بات کو نہ سمجھے۔

(اردوے معلّٰی ص ۷۳) ۱۴ فروری ۱۸۶۰ء

۷۹۔ برخوردار! سعادت آثار منشی ہرگوپال سلمہ اللہ تعالیٰ۔

(اردوے معلّٰی ص ۸۶) ۱ مارچ ۱۸۶۰ء

۸۰۔ مرزا تفتہ! اِس غم زدگی میں مجھ کو ہنسانا تمھارا ہی کام ہے۔

(اردوے معلّٰی ص ۵۳) ۳۱ مارچ ۱۸۶۰ء

۸۱۔ مرزا تفتہ! ایک امر عجیب تم کو لکھتا ہوں۔

(اردوے معلّٰی ص ۶۵) ۱۶ اپریل ۱۸۶۰ء

۸۲۔ بھائی! آج اِس وقت تمھارا خط پہنچا۔ پڑھتے ہی جواب لکھتا ہوں۔

(اردوے معلّٰی ص ۹۰) ۶ مئی ۱۸۶۰ء

۸۳۔ برخوردار مرزا تفتہ! دوسرا مسودہ بھی کل پہنچا۔ تم سچے اور میں معذور۔

(اردوے معلّٰی ص ۴۷) ۲۰ جولائی ۱۸۶۰ء

۸۴۔ مرزا تفتہ! کل تمھارا خط مع کاغذ اشعار آیا۔

(اردوے معلّٰی ص ۱۱۴) ۱۹ نومبر ۱۸۶۰ء

۸۵۔ صاحب! تمھارا خط میرٹھ سے آیا۔

(اردوے معلّٰی ص ۸۵) ۲۰ جنوری ۱۸۶۱ء

۸۶۔ اجی مرزا تفتہ! تم نے روپیہ بھی کھویا اور اپنی فکر کو اور میری اصلاح کو بھی ڈبویا۔

(اردوے معلّٰی ص ۶۹) ۹ اپریل ۱۸۶۱ء

۸۷۔ میاں مرزا تفتہ! ہزار آفریں، کیا اچھا قصیدہ لکھا ہے۔ واہ واہ چشم بد دور۔

(اردوے معلّیٰ ص ۶۲) ۱۹ اگست ۱۸۶۱ء

۸۸۔ مرزا تفتہ صاحب! اس قصیدے کے باب میں بہت باتیں آپ کی خدمت میں عرض کرنی ہیں۔

(اردوے معلّیٰ مجتبائی حصہ ۲، ص ۳۶) ۹ ستمبر ۱۸۶۱ء

۸۹۔ صاحب! "گوہر را" "خاور را" یہ قصیدہ بہت اصلاح طلب تھا۔

(اردوے معلّیٰ مجتبائی حصہ ۲، ص ۲۷) ۱۲ ستمبر ۱۸۶۱ء

۹۰۔ "انگشتری" اور "خاتم" دونوں ایک ہیں۔

(اردوے معلّیٰ مجتبائی حصہ ۲، ص ۲۶) ستمبر ۱۸۶۱ء

۹۱۔ صاحب! قصیدے پر قصیدہ لکھا اور خوب لکھا۔

(اردوے معلّیٰ مجتبائی حصہ ۲، ص ۳۴) ۴ اکتوبر ۱۸۶۱ء

۹۲۔ صاحب! یہ قصیدہ تم نے بہت خوب لکھا ہے۔

(اردوے معلّیٰ مجتبائی حصہ ۲، ص ۲۹) اکتوبر یا نومبر ۱۸۶۱ء

۹۳۔ تم کو معلوم ہے کہ ممدوح تمھارے یہاں آئے ہیں۔

(اردوے معلّیٰ مجتبائی حصہ ۲، ص ۳۲) اکتوبر یا نومبر ۱۸۶۱ء

۹۴۔ صاحب! دو زبانوں سے مرکب ہے۔ یہ فارسی متعارف۔

(اردوے معلّیٰ مجتبائی حصہ ۲، ص ۲۲) ۲۷ اگست ۱۸۶۲ء

۹۵۔ بھائی! "ریمیا" "وہیمیا" خرافات ہے۔

(اردوے معلّیٰ مجتبائی حصہ ۲، ص ۲۹) اگست ۱۸۶۲ء

۹۶۔ مرزا تفتہ! جو کچھ تم نے لکھا، یہ بے دردی ہے اور بد گمانی۔

(اردوے معلّیٰ ص ۹۹) ۲۷ نومبر ۱۸۶۲ء

۹۷۔ صاحب بندہ! میں نے بکس کا ایک ایک خانہ دیکھا۔

(اردوے معلّٰی ص ۱۱۱) ۴ مارچ ۱۸۶۳ء

۹۸۔ لو صاحب، ہم نے لفٹنٹ گورنر کی ملازمت اور خلعت پر قناعت کر کے انبالے جانا موقوف کیا۔

(اردوے معلّٰی مجتبائی حصہ ۲، ص ۳۲) اپریل ۱۸۶۳ء

۹۹۔ حضرت! آپ کے سب خط پہنچے، سب قصیدے پہنچے۔

(اردوے معلّٰی مجتبائی حصہ ۲، ص ۳۱) ۳ جولائی ۱۸۶۳ء

۱۰۰۔ حضرت! پرسوں صبح کو تمھارے سب کاغذ ایک لفافے میں بند کر کے ڈاک گھر بھجوا دیے۔

(اردوے معلّٰی مجتبائی حصہ ۲، ص ۳۰) ۵ جولائی ۱۸۶۳ء

۱۰۱۔ مرزا تفتہ! یہ غلطی تمھارے کلام میں کبھی نہیں دیکھی تھی کہ شعر ناموزوں ہو۔

(اردوے معلّٰی مجتبائی حصہ ۲، ص ۳۱) ۱۶ جولائی ۱۸۶۳ء

۱۰۲۔ سچ ہے، اگر آپ استاد کا مصرع نہ لکھتے تو میں۔

(اردوے معلّٰی مجتبائی حصہ ۲، ص ۳۴) ۲۳ جولائی ۱۸۶۳ء

۱۰۳۔ صاحب! "کشیدن" کی جگہ "درکشیدن"، بلکہ "برکشیدن" کی جگہ "درکشیدن" نہ چاہیے۔

(اردوے معلّٰی مجتبائی حصہ ۲، ص ۳۱) مارچ۔ ستمبر ۱۸۶۳ء

۱۰۴۔ نورِ چشم غالبِ از خود رفتہ، مرزا تفتہ! خدا تم کو خوش اور تندرست رکھے۔

(اردوے معلّٰی ص ۱۱۰) ۲۴ نومبر ۱۸۶۳ء

۱۰۵۔ صاحب! کل پارسل اشعار کا ایک آنے کا ٹکٹ لگا کر

(اردوے معلّٰی ص ۱۰۹) ۶ ستمبر ۱۸۶۴ء

۱۰۶۔ بھائی! تم سچ کہتے ہو کہ بہت مسودے اصلاح کے واسطے فراہم ہوئے ہیں۔

(اردوے معلّٰی ص ۹۴) ۱۴ اکتوبر ۱۸۶۴ء

۱۰۷۔ منشی صاحب! میں سالِ گذشتہ بیمار تھا۔

(اردوے معلّٰی ص ۱۰۰) ۹ دسمبر ۱۸۶۴ء

۱۰۸۔ آؤ میرزا تفتہ، میرے گلے لگ جاؤ۔

(اردوے معلّٰی ص ۶۳) ۱۴ دسمبر ۱۸۶۴ء

۱۰۹۔ منشی صاحبِ سعادت و اقبال نشان منشی ہرگوپال صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ۔

(اردوے معلّٰی ص ۱۱۰) ۱۲ فروری ۱۸۶۵ء

۱۱۰۔ مرزا تفتہ کہ پیوستہ بہ دل جا دارد

(اردوے معلّٰی ص ۱۰۹) فروری ۱۸۶۵ء

۱۱۱۔ مرزا تفتہ! پیر شو و بیاموز۔

(اردوے معلّٰی مجتبائی حصہ ۲ ص ۱۹) ۱۴ مئی ۱۸۶۵ء

۱۱۲۔ صاحب! تم نے تن تن کا ذکر کیوں کیا؟ میں نے اس باب میں کچھ نہ لکھا تھا۔

(اردوے معلّٰی مجتبائی حصہ ۲، ص ۳۳) آخر مئی ۱۸۶۵ء

۱۱۳۔ میرے مہربان، میری جان، مرزا تفتۂ سخن دان۔

(اردوے معلّٰی ص ۹۸) ۲۸ نومبر ۱۸۶۵ء

۱۱۴۔ لو صاحب! کھچڑی کھائی دن بہلائے۔ کپڑے پھاٹے گھر کو آئے۔

(اردوے معلّٰی ص ۱۰۸) جنوری ۱۸۶۶ء

۱۱۵۔ مرزا تفتہ صاحب! پرسوں تمھارا دوسرا خط پہنچا۔

(اردوے معلّٰی ص ۹۳) ۱۸۶۷ء

۱۱۶۔ لاحول ولا قوۃ، کس ملعون نے بہ سببِ ذوقِ شعر، اشعار کی اصلاح منظور رکھی۔

(اردوے معلّٰی مجتبائی حصہ ۲، ص ۳۲)

۱۱۷۔ میاں! تمھارے انتقالاتِ ذہن نے مارا۔

(اردوے معلّٰی مجتبائی حصہ ۲، ص ۲۴)

۱۱۸۔ صاحب! واقعی "سداب" کا ذکر کتبِ طبی میں بھی ہے اور عرفی کے ہاں بھی ہے۔

(اردوے معلّٰی مجتبائی حصہ ۲، ص ۳۶)

۱۱۹۔ حضرت! اس قصیدے کی جتنی تعریف کروں کم ہے۔

(اردوے معلّٰی مجتبائی حصہ ۲، ص ۳۲)

۱۲۰۔ مرزا تفتہ! کیا کہنا ہے، نہ ظہیر کا پتا نہ غالب کا۔

(اردوے معلّٰی مجتبائی حصہ ۲، ص ۳۲)

۱۲۱۔ میاں! سنو اس قصیدے کا ممدوح شعر کے فن سے ایسا بیگانہ ہے۔

(اردوے معلّٰی مجتبائی حصہ ۲، ص ۲۵)

۱۲۲۔ دل بسے داغدار بود، نماند

(اردوے معلّٰی مجتبائی حصہ ۲، ص ۳۶)

۱۲۳۔ حضرت! اس غزل میں پروانہ و پیمانہ و بُت خانہ تین قافیے اصلی ہیں۔

(اردوے معلّٰی مجتبائی حصہ ۲، ص ۴۱)

نواب علاء الدین خاں علائی

۱۔ مرزا نسیمی کو دعا پہنچے۔

(اردوے معلّٰی ص ۴۱۰) ۱۸۵۸ء

۲۔ آج بدھ کے دن ستائیس رمضان کو پہر دن چڑھے کہ جس وقت میں کھانا کھا کر باہر آیا تھا۔

(اردوے معلّٰی ص ۴۳۴) ۱۱ مئی ۱۸۵۸ء

۳۔ خاک نمناکم و تو باد بہار

(اردوے معلّٰی ص ۴۲۵) ۲۳ اگست ۱۸۵۸ء

۴۔ سبحان اللہ، ہزار برس تک نہ پیام بھیجنا، نہ خط لکھنا اور پھر لکھنا تو سراسر غلط لکھنا۔

(اردوے معلیٰ ص ۴۳۵) ۲ جولائی ۱۸۶۰ء

۵۔ صاحب! میری داستان سنیے۔ پنسن بے کم و کاست جاری ہوا۔

(اردوے معلیٰ ص ۴۰۲) ۸ جون ۱۸۶۰ء

۶۔ مولانا نسیمی! کیوں خفا ہوتے ہو؟

(اردوے معلیٰ ص ۴۱۷) ۴ اپریل ۱۸۶۱ء

۷۔ میری جان! تخلص تمھارا بہت پاکیزہ اور میرے پسند ہے۔

(اردوے معلیٰ ص ۴۱۲) ۱۲ مئی ۱۸۶۱ء

۸۔ میری جان علائی ہمہ داں! اس دفعہ دخل مقدر کا کیا کہنا ہے۔

(اردوے معلیٰ ص ۴۰۷) ۱ جون ۱۸۶۱ء

۹۔ جانِ غالب! یاد آتا ہے کہ تمھارے عمِ نامدار سے سنا تھا۔

(اردوے معلیٰ ص ۳۹۸۔ عود اول و عود دوم ص ۶۹) جون ۱۸۶۱ء

۱۰۔ علائی مولائی! اس وقت تمھارا خط پہنچا۔

(اردوے معلیٰ ص ۴۰۳) ۲۵ ستمبر ۱۸۶۱ء

۱۱۔ صاحب! آگ برستی ہے۔ کیوں کر آگ میں گر پڑوں۔ مہینا ڈیڑھ مہینا اور چپکے رہو۔

(اصل خط) ۳۰ ستمبر ۱۸۶۱ء

۱۲۔ میری جان! کیا کہتے ہو؟ کیا چاہتے ہو؟

(اردوے معلیٰ ص ۴۲۴) ۱۵ اکتوبر ۱۸۶۱ء

۱۳۔ آج جس وقت کہ میں روٹی کھانے کو گھر جاتا تھا۔

(اردوے معلیٰ ص ۳۹۸) ۱۲ نومبر ۱۸۶۱ء

۱۴۔ مرزا علائی! پہلے اُستاد میر جان صاحب کے قہر و غضب سے مجھ کو بچاؤ۔

(اردوے معلیٰ ص ۴۱۴) جنوری فروری ۱۸۶۲ء

۱۵۔ صاحب! صبح جمعے کو میں نے تم کو خط لکھا۔ اسی وقت بھیج دیا۔

(اردوے معلّٰی ص ۴۲۱) ۹ فروری ۱۸۶۲ء

۱۶۔ "نیرِ اصغر" سپہر سخن سرائی مولانا علائی کے خاطر نشان و دل نشین ہو۔

(اردوے معلّٰی ص ۴۴۸) ۱۵ فروری ۱۸۶۲ء

۱۷۔ صاحب! کل تمھارے خط کا جواب بھیج چکا ہوں، پہنچا ہوگا۔

(اردوے معلّٰی ص ۴۳۰) ۱۶ فروری ۱۸۶۲ء

۱۸۔ صاحب! پرسوں تمھارا خط آیا۔ کل جمعے کے دن نواب کا مسہل تھا۔

(اردوے معلّٰی ص ۴۱۴) ۱ مارچ ۱۸۶۲ء

۱۹۔ صاحب! میرا برادر عالی قدر اور تمھارا والد ماجد اب اچھا ہے۔

(اردوے معلّٰی ص ۴۳۶) ۷ مارچ ۱۸۶۲ء

۲۰۔ یار بھتیجے، گویا بھائی مولانا علائی۔ خدا کی دہائی۔

(اردوے معلّٰی ص ۴۱۰) ۱۹ جون ۱۸۶۲ء

۲۱۔ جانِ غالب! دو خط تمھارے متواتر پہنچے۔

(اردوے معلّٰی ص ۴۱۶۔ اصل خط ۱۸ جولائی ۱۸۶۲ء

۲۲۔ لو صاحب! پرسوں تمھارا خط آیا اور کل دوپہر کو استاد میر جان آئے۔

(اردوے معلّٰی ص ۴۱۹) ۱۸ جولائی ۱۸۶۲ء

۲۳۔ میری جان! سن، پنجشنبہ، پنجشنبہ آٹھ، جمعہ نو، ہفتہ دس، اتوار گیارہ، ایک مژہ برہم زدن مینہ نہیں تھما۔

(اردوے معلّٰی ص ۴۴۲) ۲۷ جولائی ۱۸۶۲ء

۲۴۔ مولانا علائی! نہ مجھے خوفِ مرگ نہ دعویِ صبر ہے۔

(اردوے معلّٰی ص ۴۳۸) ۶ اگست ۱۸۶۲ء

۲۵۔ جانِ غالبؔ، مگر جسم سے نکلی ہوئی جان ۔

(اردوے معلّیٰ ص ۴۳۹) ۹ ستمبر ۱۸۶۲ء

۲۶۔ میاں! تم میرے ساتھ وہ معاملے کرتے ہو جو احیا سے مرسوم و معمول ہیں۔

(اردوے معلّیٰ ص ۴۱۲) اوائل مارچ ۱۸۶۳ء

۲۷۔ اقبال نشانا! بخیر و عافیت و فتح و نصرت لوہارو پہنچنا مبارک ہو۔

(اردوے معلّیٰ ص ۳۹۸) اپریل۔مئی ۱۸۶۳ء

۲۸۔ ولی عہدی میں شاہی ہو مبارک ۔

(اردوے معلّیٰ ص ۴۲۳) اپریل۔مئی ۱۸۶۳ء

۲۹۔ لَا مَوْجُودُ اِلَّا اللّٰہ

(اردوے معلّیٰ ص ۴۲۸) ۳۰ مئی ۱۸۶۳ء

۳۰۔ بد است مرگ، ولے بدتر از گمان تو نیست ۔

(اردوے معلّیٰ ص ۴۲۹) ۱۱ جون ۱۸۶۳ء

۳۱۔ میری جان! مرزا علی حسین خاں آئے اور مجھ سے ملے۔

(اردوے معلّیٰ ص ۴۰۸) ۲۱ جون ۱۸۶۳ء

۳۲۔ صاحب! میں از کار رفتہ و درماندہ ہوں۔

(اردوے معلّیٰ ص ۴۲۲) ۳ جولائی ۱۸۶۳ء

۳۳۔ جانا عالی شانا! پہلے خط اور پھر بہ توسط برخوردار علی حسین خاں مجلد کلیاتِ فارسی یہ پہنچے۔

(اردوے معلّیٰ ص ۴۲۶) ۲۰ ستمبر ۱۸۶۳ء

۳۴۔ اقبال نشانِ مرزا علاء الدین خاں بہادر کو غالبِ گوشہ نشین کی دعا پہنچے۔

(اردوے معلّیٰ ص ۴۰۵) ۳ دسمبر ۱۸۶۳ء

۳۵۔ مولانا علائی! واللہ، علی حسین خاں کا بیان بہ مقتضائے محبت تھا۔

(اردوئے معلّٰی ص ۴۳۳) ۱۳ دسمبر ۱۸۶۳ء

۳۶۔ علائی مولائی کو غالبؔ طالب کی دعا۔ بے چارے مرزا کا معاملہ علی حسین خاں کی معرفت طے ہوگیا۔

(اردوئے معلّٰی ص ۴۲۸) ۱ جنوری ۱۸۶۴ء

۳۷۔ میری جان! غالبِ کثیر المطالب کی کہانی سن۔

(اردوئے معلّٰی ص ۴۴۶) ۱۸ مئی ۱۸۶۴ء

۳۸۔ اے میری جان! مثنوی "ابر گہر بار" کون سی فکر تازہ تھی کہ میں تجھ کو بھیجتا۔

(اردوئے معلّٰی ص ۴۲۷) ۳۰ مئی ۱۸۶۴ء

۳۹۔ علائی مولائی! غالبؔ کو اپنا دعاگو اور خیر خواہ تصوّر کریں۔

(اردوئے معلّٰی ص ۴۲۰) ۱۰ جولائی ۱۸۶۴ء

۴۰۔ اجی مولانا علائی! نواب صاحب دو مہینے تک کی اجازت دے چکے۔

(اردوئے معلّٰی ص ۴۳۲) ۱۷ ستمبر ۱۸۶۴ء

۴۱۔ مرزا علائی مولائی! نہ لاہور سے خط لکھا نہ لوہارو سے۔

(اردوئے معلّٰی ص ۴۲۶) ۳ نومبر ۱۸۶۴ء

۴۲۔ میری جان! تمھارا خط بھی آیا اور علی حسین خاں نجم الدین بھی تشریف لایا۔

(اردوئے معلّٰی ص ۴۰۶) ۹ دسمبر ۱۸۶۴ء

۴۳۔ لو صاحب، وہ مرزا رجب بیگ مرے۔

(اردوئے معلّٰی ص ۴۱۷) ۵ جنوری ۱۸۶۵ء

۴۴۔ میری جان! ناسازیِ روزگار و بے ربطیِ اطوار۔

(اردوئے معلّٰی ص ۴۱۹) جنوری ۱۸۶۵ء

۴۵ - میری جان! نئے مہمان کا قدم تم پر مبارک ہو۔
(اردوے معلّٰی ص ۳۹۶) ۱۳ فروری ۱۸۶۵ء

۴۶ - صاحب! کل تمہارا خط پہنچا۔ آج اس کا جواب لکھ کر روانہ کرتا ہوں۔
(اردوے معلّٰی ص ۴۰۶) ۲۲ فروری ۱۸۶۵ء

۴۷ - شکر ایزد کہ ترا با پدرت صلح فتاد۔
(اردوے معلّٰی ص ۳۹۵) یکم اکتوبر ۱۸۶۵ء

۴۸ - جانا عالی شانا! خط پہنچا، حظ اٹھایا۔
(اردوے معلّٰی ص ۴۰۴) ۶ دسمبر ۱۸۶۵ء

۴۹ - مرزا! رو برو بہ از پہلو آؤ میرے سامنے بیٹھ جاؤ۔
(اردوے معلّٰی ۳۹۴) ۲۲ دسمبر ۱۸۶۵ء

۵۰ - صاحب تمہارا خط پہنچا، مطالب دل نشیں ہوئے۔
(اردوے معلّٰی ص ۳۹۳) ۲۲-۲۶ دسمبر ۱۸۶۵ء

۵۱ - جانا جانا، ایک میرا خط تمہارے دو خطوں کے جواب میں تم کو پہنچا ہو گا۔
(اردوے معلّٰی ص ۳۹۶) - ۲۶ دسمبر ۱۸۶۵ء

۵۲ - میاں! چلتے وقت تمہارے چچا نے غلیل کی فرمائش کی تھی۔
(اردوے معلّٰی ص ۴۱۵) ۱۳ جنوری ۱۸۶۶ء

۵۳ - میاں! مدعا اصلی ان سطور کی تحریر سے یہ ہے۔
(اردوے معلّٰی ص ۴۳۲)

۵۴ - خوشی ہے یہ آنے کی برسات میں
(معارف اعظم گڑھ، دسمبر ۱۹۲۲ء۔ (۱۸۶۵ء - ۱۸۶۷ء)
غالب کی نادر تحریریں، ص ۸۵ - نسخۂ عرشی، پہلا ایڈیشن)

۵۵۔ اقبال نشان والا شان صدرہ عزیز تر از جان، مرزا علاءالدین خاں کو دعائے درویشانۂ غالبِ دیوانہ پہنچے۔

(اردوے معلّٰی ص ۴۵۰) ۲۱ جون ۱۸۶۸ء

۵۶۔ سعادت و اقبال نشان مرزا علاء الدین خاں بہادر کو فقیر اسد اللہ کی دعا پہنچے۔

(اردوے معلّٰی ص ۴۰۲)

۵۷۔ میاں میں تمھارے باپ کا تابع، تمھارا مطیع، فرخ مرزا کا فرماں بردار۔

(اردوے معلّٰی ص ۴۴۸)

۵۸۔ صاحب! بہت دن سے تمھارا خط نہیں آیا

(اردوے معلّٰی ص ۴۱۳)

حواشی

ص ۱۵۔ ۱۔ فغانِ بے خبر، خواجہ غلام غوث خاں بے خبر، الہ آباد، ۱۸۹۱ء، ص ۱۲۹

ص ۳۰۔ ۱۔ خطوطِ غالب، مرتبہ مہیش پرشاد، ص ب ی ۲۔ ایضاً، ص د

ص ۵۰۔ ۱۔ خطوطِ غالب، مرتبہ مہیش پرشاد، "نقل یا" بجائے "یا نقل"

ص ۸۷۔ ۲۔ خطوطِ غالب، ص ط ی ۳۔ ایضاً، ص و ی

ص ۹۷۔ ۱۔ آبِ حیات، محمد حسین آزاد، سرفراز پریس لکھنؤ، ص ۶۴۸

ص ۱۰۳۔ ۱۔ آبِ حیات، ص ۶۲۵

ص ۱۰۵

۱۔ نوطرزِ مرصع، عطا حسین تحسین، مرتبہ سید نور الحسن ہاشمی، الہ آباد، ۱۹۵۸ء، ص ۶۵

۲۔ باغ و بہار، میر امن دہلوی، کلکتہ ۱۹۰۴ء، ص ۱۵

ص ۱۰۶

۱۔ باغ و بہار، ص ۱۱

ص ۱۰۷

۱۔ فسانۂ عجائب، رجب علی بیگ سرور، لکھنؤ (نول کشور) ۱۲۸۳ھ، ص ص ۱۴-۱۳

۲۔ ایضاً، ص ۱۵

ص ۱۰۹

۱۔ یادگارِ غالب، مولانا الطاف حسین حالی، کانپور، ۱۸۹۷ء، ص ۱۰۱

ص ۱۱۱

۱۔ غالب نامہ، شیخ محمد اکرام، (طبع اوّل) ص ۱۷۱

۲۔ غالب شناسی، ڈاکٹر ظ۔ انصاری

ص ۱۱۲

۱۔ ڈاکٹر معین الرحمٰن، غالب اور انقلاب ستاون، ص ۱۹۷

ص ۱۱۳

۱۔ دیوانِ غالب، مرتبہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی، ۱۸۶۵ء، ص ۶۳

۲ پنج آہنگ ، ص ۶۳

ص ۱۱۴

۱۔ پنج آہنگ، ص ۱۴۵

ص ۱۱۸

۱۔ العلم، کراچی، جنوری تا مارچ ۱۹۶۹ء، ص ۳۷۷

ص ۱۱۹

۱۔ حالی نے عبدالرزاق شاکر کے نام غالب کے ساتویں خط سے یہ اقتباس لیا ہے۔

۲۔ رسا ہمدانی نے "نادر خطوطِ غالب" کے نام سے ایک مجموعہ چھاپا تھا، جس میں اُن کے پردادا سید کرامت حسین کرامت ہمدانی کے نام غالب کے ۲۳ خطوط ہیں۔ یکم جنوری ۱۸۵۱ء کے ایک خط میں بقول اُن کے غالب لکھتے ہیں:

"شاہ صاحب کو غالبِ ناتواں کا سلام پہنچے۔ یہ پہلا خط ہے، جو میں تمھیں اُردو زبان میں لکھ رہا ہوں۔ زبانِ فارسی میں خطوں کا لکھنا آج سے متروک ہے۔ پیرانہ سالی اور ضعف کے صدموں سے یہ محنت پژوہی اور جگر کاوی کی قوت مجھ میں نہیں رہی۔" (نادر خطوطِ غالب، لکھنو، ۱۹۳۹ء، ص ۱۴) یہ خط جعلی ہے۔ رسا ہمدانی نے حالی کے اس

بیان کو اس خط کی بنیاد بنایا ہے، بلکہ بعض پورے فقرے چُرا لیے ہیں۔ قاضی عبدالودود نے پہلی با
ان خطوط کے جعل کا انکشاف کیا تھا۔ (ندیم، گیا، جنوری ۱۹۴۳ء)

۳۔ یادگارِ غالب، ص ۱۷۴

ص ۱۲۰

۱۔ حالی کے اس بیان پر پہلی بار غلام رسول مہر نے اعتراض کیا تھا۔ ملاحظہ ہو:
غالب، لاہور، طبعِ چہارم، ص ۳۹۶

ص ۱۲۱ ۱۔ العلم، کراچی، جنوری تا مارچ ۱۹۶۹ء، ص ۳۷۹

ص ۱۳۵ ۱۔ محمد حسین ہیکل، عمر فاروق اعظم، مترجمہ حبیب اشعر، لاہور، ۱۹۵۸ء، ص ص ۱۵۰-۱۵۱

ص ۱۴۵ ۱۔ بین الاقوامی سیمنار، نئی دلی، ۱۹۶۹ء، ص ۳۲

ص ۱۴۶ ۱۔ مکاتیبِ غالب، چھٹا اڈیشن، رام پور، ص ۶۱

ص ۲۳۲

۱۔ خطوطِ غالب، مرتبہ مولوی مہیش میں تفتہ کے نام ۱۲۴ خط ہیں۔ ان میں ایک تو مرزا حاتم علی مہر کے نام کا خط: "بھائی صاحب، ۳۳ کتابیں بھیجی ہوئی برخوردار منشی شیو نرائن کی الخ" شامل ہو گیا ہے اور دوسرے مولوی مہیش نے خط ۶۷ کے آخری پیراگراف کو ایک علیحدہ خط تسلیم کیا ہے۔ "اردوئے معلّٰی" کے بعد کے اڈیشنوں میں بھی ایسا ہی ہوا ہے، لیکن اردوئے معلّٰی کے پہلے اور دوسرے اڈیشن میں یہ خط ۶۷ کا آخری پیراگراف ہے، اس لیے اُسے علیحدہ خط تسلیم کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ گویا تفتہ کے نام کل ۱۲۲ خط رہ گئے۔ ایک خط ڈاکٹر نثار احمد فاروقی نے دریافت کیا۔ اس طرح تفتہ کے نام غالب کے خطوط کی کل تعداد ۱۲۳ ہو گئی۔

ص ۲۳۶

۱۔ خط پر تاریخِ تحریر نہیں ہے۔ اس خط میں غالب نے تفتہ کے تین اشعار پر اصلاح دی ہے۔ میرے پیشِ نظر تفتہ کے پہلے دیوان کا مطبوعہ نسخہ ہے۔ یہ ناقص الآخر ہے اور "م" کی ردیف تک کا کلام موجود ہے۔ پوری کوشش کے باوجود تفتہ کے دیوانِ اوّل کا مکمل مطبوعہ نسخہ دستیاب نہیں ہو سکا۔ اس لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ جس شعر کا یہ مصرعہ ہے "خارہا در راہش افشانم کہ چوں خواہد شدن" اس میں ہے

یا نہیں۔ باقی دونوں شعر جن پر غالب نے اس خط میں اصلاح دی ہے موجود ہیں۔ دیوان کی طباعت کا اعلان اواخر ۱۸۴۷ء میں کیا گیا تھا۔ دسمبر ۱۸۴۸ء میں دیوان طباعت کی منزلوں سے گزر رہا تھا۔ (صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات، ص ۱۵۱) اگر ہم یہ تسلیم کر لیں کہ ۱۸۴۷ء کے اواخر سے قبل ہی یہ دیوان مرتب ہو چکا تھا تو اس کا مطلب ہے کہ یہ خط اواخر ۱۸۴۷ء سے قبل کا ہے۔ ایک دل چسپ بات یہ ہے کہ غالب نے دونوں اشعار پر جو اصلاح دی ہے وہ تفتہ نے قبول نہیں کی۔ اس کا امکان کم ہے کہ تفتہ نے پہلے غزلیں چھاپیں اور پھر اصلاح کے لیے بھیجیں۔

۲۔ غالب نے حقیر کے نام ایک خط میں اس دیباچے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے: "بہ ہر حال اس گفتگو میں منشی صاحب (تفتہ) نے ایک فقرہ اپنی مدح میں بڑھوا لیا یعنی سپہرِ سخن را ماہِ دو ہفتہ"۔ یہاں اسی فقرے کا ذکر ہے۔

ص ۲۳۷

۱۔ اردوے معلیٰ "جانتے گے"۔

۲۔ اس خط پر تاریخ تحریر نہیں ہے۔ غالب نے اِس خط میں وہی دو باتیں لکھی ہیں، جو انھوں نے ۴ جون ۱۸۴۸ء کے خط میں حقیر کو لکھی تھیں (نادراتِ غالب ص ۲) ایک تو تفتہ کے دیوانِ اوّل کے دیباچے میں ایک فقرے کے اضافے کی بات اور دوسرے بانی کو مدبّر کرنے کی ترکیب۔ اِس لیے غالب نے تفتہ کے نام یہ خط مئی ۱۸۴۸ء میں لکھا ہوگا۔ دیوان کے ساتھ چھپنے سے پہلے یہ تقریظ اسعد الاخبار (آگرہ) کے ۲۰ اگست ۱۸۴۹ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی، جس کی بنیاد پر مولوی مہیش پرشاد نے اس خط کی تاریخِ تحریر اگست ۱۸۴۹ء متعین کی تھی۔ مولوی مہیش پرشاد کے مرتبہ "خطوطِ غالب" ۱۹۴۱ء میں، اور آفاق حسین آفاق کی مرتبہ "نادراتِ غالب" ۱۹۴۹ء میں شائع ہوئی تھی، اِس لیے حقیر کے نام غالب کا مذکورہ خط مولوی صاحب کی نظر سے نہیں گزر سکا۔

ص ۲۳۸

۱۔ مجتبائی "سے" ندارد۔

۲۔ منشی صاحب سے مراد ہے منشی نبی بخش حقیر۔

۳۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں ہے۔ مولوی مہیش نے اگست ۱۸۵۰ء تجویز کی ہے اور کوئی دلیل پیش نہیں

کی۔ خط میں غالب نے لکھا ہے: "جب تمھارا دیوان چھاپا جائے گا۔ یہ قطعہ بھی چھپ جائے گا۔" مولانا امتیاز علی خاں عرشی لکھتے ہیں کہ وہ قطعہ جس کا ذکر اس خط میں ہے دیوانِ تفتہ میں ہے اور ۱۸۵۵ء کا لکھا ہوا ہے۔" (العلم، کراچی، جنوری تا مارچ ۱۹۶۹ء، ص ۳۸۳) اس صورت میں امکان یہی ہے کہ یہ خط اگست ۱۸۵۵ء میں لکھا گیا ہو۔ قاضی عبدالودود اس تاریخِ تحریر کے بارے میں لکھتے ہیں: "خط ۱۲ (یعنی خط زیرِ بحث) کا زمانۂ کتابت جو مہیش پرشاد نے معین کیا ہے، صحیح معلوم ہوتا ہے اس کی صحت میں شبہہ ظاہر کیا گیا تھا، بے جا ثابت ہوا۔ (معاصر، جولائی ۱۹۴۴ء، جلد ۸، ۱۲)

ص ۲۴۰

۱۔ "کوئی" سے مراد کوئی ایسا شخص ہے جو کول یعنی علی گڈھ کا رہنے والا تھا۔

ص ۲۴۳

۱۔ اس مطلع کے بارے میں غالب نے ۴ مارچ ۱۸۵۲ء کے ایک فارسی خط میں تفتہ کو لکھا تھا: "زندگانی ہا اور "جانفشانی ہا" قافیے والا مطلع اگرچہ ہم نے قلم زد کر دیا تھا لیکن ایک ایسا دوسرا مطلع لکھ دیا ہے۔ جس سے ظہوری کی روح خوش ہو جائے گی۔

رایگاں است زندگانی ہا
می تواں کرد جانفشانی ہا
کس چہ نازد بہ جانفشانی ہا

آخری دو مصرعوں میں سے جو پسند آئے اُسے مصرعِ ثانی بنا لیں۔" (باغِ دو در، ص ۱۶۰-۱۶۱)

۲۔ غالب نے "سہرٹ" لکھا ہے جو سہوِ قلم معلوم ہوتا ہے، کیوں اصل لفظ "سورٹھ" ہے۔ ہندی میں یہ ایک راگنی کا نام ہے۔

ص ۲۴۴

۱۔ غالب نے "ماند" لکھا ہے، یہ سہوِ قلم ہے۔

۲۔ ۲۴ مارچ ۱۸۵۲ء کے ایک فارسی خط میں غالب نے تفتہ کو لکھا ہے: "کالے صاحب کی وفات کے بعد اس گھر کے در و دیوار نے میرا ساتھ چھوڑ دیا۔ (یعنی وہاں کے لوگوں سے نبھی نہیں) میں نے کوچہ بلیماراں میں ایک گھر لے لیا ہے۔ امید ہے کہ اس گھر سے میری لاش ہی نکلے گی۔" (باغِ دو در، ص ۱۶۱)

۳۔ اردوے معلّی "طرازیاں"۔

ص ۲۴۶

۱۔ تفتہ بھرت پور ریاست میں ملازم ہو گئے تھے۔ قوی امکان ہے کہ یہ نوکری جانی بہاری لال راضی کے توسط سے ملی تھی۔ کچھ عرصے بعد تفتہ کے راضی سے اختلافات ہو گئے اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ تفتہ نے ملازمت چھوڑ دی۔ غالب اسی واقعے کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

۲۔ جے پور کے بارے میں غالب نے تفتہ کو لکھا تھا: "جے پور کے میرے ایک مخلص دوست نے مجھے لکھا تھا کہ تمھارا جو کلام "اخبار سلطانی" (غالب کی مراد غالباً "سراج الاخبار" سے ہے جو قلعۂ معلّی سے شائع ہوتا تھا) میں شائع ہوتا ہے۔ وہ جواں دولت، جواں سال راجا (راجا جے پور) کی نظر سے گزرتا ہے اور راجا کو بہت پسند آتا ہے، اور تمھارے بہت مشتاق ہیں۔ میں نے اپنے دل سے کہا کہ میں اس معاملے میں اپنوں اور بیگانوں سے کوئی مضائقہ نہیں کرتا تو پھر راجا جے پور سے کیوں مضائقہ کروں۔" اس کے بعد غالب نے تفصیل لکھی ہے کہ کس طرح انھوں نے جانی بہاری لال کے توسط سے راجا کی خدمت میں اپنا دیوان پیش کیا۔ (باغِ دو در، ص ص ۱۶۳ - ۱۶۴) اس دیوان پر راجا نے غالب کو پانچ سو روپے کا عطیہ دیا تھا۔

۳۔ "اب بدنام ہو گیا ہوں اور ایک بہت بڑا دھبا لگ گیا ہے۔" یہ اشارہ غالباً حادثۂ اسیری کی طرف ہے، غالب نے اپنے گھر پر قمار خانہ قائم کر رکھا تھا اور اس الزام میں دو بار گرفتار ہوئے تھے۔ پہلی بار ۱۸۴۱ء میں۔ اس دفعہ سو روپے جرمانہ ادا کر کے نجات پائی۔ دوسری بار وہ ۲۵ مئی ۱۸۴۷ء کو گرفتار ہوئے اور اس دفعہ دو سو روپے جرمانہ اور چھ مہینے قید کی سزا ہوئی۔ غالب کئی مہینے جیل میں رہے۔ ڈاکٹر راس سول سرجن کی مداخلت سے اس مدت میں کچھ تخفیف ہو گئی تھی۔ ملاحظہ ہو:

۴۔ دہلی اردو اخبار، ۱۵ اگست ۱۸۴۱ء (نیشنل آرکائیوز، نئی دلی) ـــ قدیم اخبارات کی کچھ جلدیں، مولانا امتیاز علی خاں عرشی، نواے ادب، بمبئی، اپریل ۱۹۵۵ء، احسن الاخبار بحوالہ دہلی کا آخری سانس، ص ص ۱۷۴ - ۱۷۵ ـــ کلامِ عاصی، ص ۲۶۳ - حادثۂ اسیری کے واقعات اور یہ حوالے ڈاکٹر نثار احمد فاروقی کی تلاشِ غالب (لاہور، ص ص ۸۶ - ۸۸) سے نقل کیے گئے ہیں۔

ص ۲۴۷

۱۔ اردوے معلیٰ مجتبائی "خرج"

۲۔ اردوے معلیٰ مجتبائی "یا" بجائے "یاے"

ص ۲۴۸

۱۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں ہے۔ غالب نے خط میں "بیش و بیشتر" کی بحث کی ہے۔ یہی گفتگو غالب نے تفتہ کے نام اردو خط مورخہ ۲ مارچ ۱۸۵۲ء، اور فارسی خط ۲۴ مارچ ۱۸۵۲ء (باغ دو در، ص ۲۶۱) میں بھی کی ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خط غالباً ۱۸۵۲ء ہی کے کسی مہینے میں لکھا گیا ہے۔

ص ۲۵۱

۱۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ غالب نے اپنا دیوان راجا جے پور کی خدمت میں پیش ہونے کا ذکر کیا ہے۔ ۱۰ دسمبر ۱۸۵۲ء کے خط میں تفتہ نے لکھا تھا کہ "صحاف کے ہاں سے ابھی دیوان نہیں آیا۔ آج کل آجائے گا پھر اس کے جزدان کی تیاری کر کے روانہ کروں گا۔" اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خط دسمبر ۱۸۵۲ء کے اواخر میں لکھا گیا ہوگا۔

ص ۲۵۲

۱۔ بھرت پور کے راجا کا انتقال ۲۷ مارچ ۱۸۵۳ء کو ہوا۔ اُس وقت وارث راجا کی عمر تین سال تھی۔

FOREIGN DEPTT. 145-151-8TH APRIL 1853

ص ۲۵۳

۱۔ اردوے معلیٰ "پڈ"۔ غالب نے جہاں کہیں "پڈ" لکھا ہے، میں نے اسے "پیڈ" کر دیا ہے۔

۲۔ اِس خط پر تاریخِ تحریر نہیں۔ خط میں غالب نے لکھا ہے: "راجا صاحب دیوان کے دیکھنے سے خوش ہوئے۔ راول جی نئے اجنٹ کے استقبال کو گئے ہیں۔" یہی باتیں غالب نے ۱۷ مارچ ۱۸۵۳ء کے خط میں منشی نبی بخش حقیر کو ان الفاظ میں لکھی تھیں: "کتاب اور عرضی راجا صاحب کے پاس پہنچی ہے اور وہ خوش ہوئے۔ نئے اجنٹ کے آنے کا ہنگامہ تھا، وہ بھی ختم ہوا۔ اب دیکھیے کیا ہوتا ہے۔" اس کا بہ ظاہر مطلب یہی ہے کہ یہ خط بھی مارچ ۱۸۵۳ء میں لکھا گیا۔

ص ۲۵۵

۱۔ اردوے معلّٰی "رانی مری"

ص ۲۵۶

۱۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ خط میں غالب نے لکھا ہے کہ "راجا مرا، رانی نہیں مری۔" یہ درست ہے، کیوں کہ راجا سے مراد بھرت پور کے راجا نریش بلونت سنگھ سے ہے، ان کا انتقال ۲۷ مارچ ۱۸۵۳ء کو ہوا تھا۔ اس وقت ولی عہد راجا جسونت سنگھ تین برس کے تھے (ملاحظہ ہو: ہماری زبان' علیگڈھ' ۸ نومبر اور ۱۵ نومبر ۱۹۶۱ء) غالب کے اس خط سے بھی ولی عہد کی عمر کی تائید ہوتی ہے۔ راجا کی بیماری اور وفات کا ذکر غالب نے پہلی بار ۲۸ مارچ ۱۸۵۳ء کے خط میں کیا ہے۔ پھر ۳۰ مئی ۱۸۵۳ء کے خط میں لکھا ہے: "کل راجا کے مرنے کی خبر سنی۔" اس لیے یہ خط مئی ۱۸۵۲ء میں لکھا گیا ہوگا۔ غالب نے اس خط میں بیساکھ کا مہینا بتایا ہے۔ اس سال بیساکھ اور مئی کے مہینوں میں بھی مطابقت تھی۔

ص ۲۵۷

۱۔ غالب اُس انکم ٹیکس کا ذکر کر رہے ہیں جو اُن کی پنشن پر لگا تھا۔

۲۔ اردوے معلّٰی میں اس خط پر دوشنبہ ۳ مئی ۱۸۵۳ء کی تاریخ ہے۔ تقویم کی رُو سے ۳ مئی کو "دوشنبہ" نہیں "سہ شنبہ" ہے۔ مولوی مہیش اور مالک رام صاحب نے "۳ مئی" کو "۲ مئی" کر دیا ہے۔ کاظم علی خاں صاحب نے اسے "۳۰ مئی" قرار دیا ہے۔ کاظم صاحب کی تجویز کردہ تاریخ درست معلوم ہوتی ہے۔ "۳۰ مئی" کو دوشنبہ تھا۔ غالب نے اس خط میں لکھا ہے: "منشی صاحب (حقیر) کا ایک خط ہاترس سے آیا تھا کل اس کا جواب ہاترس کو روانہ کر چکا ہوں۔" ۲۹ مئی کے خط میں غالب نے حقیر کو لکھا تھا: "یہ خیال کہ ابھی ہاترس سے نہ آئے ہوں، مانع تحریر رہا۔" اس عبارت سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ زیر بحث خط ۳۰ مئی کو لکھا گیا۔

۳۔ اردوے معلّٰی میں "انیس" ہے جب کہ غالب نے اس خط میں جو حساب لکھا ہے' اس کی رُو سے یہ رقم "انتیس" ہوتی ہے۔ بہ ظاہر یہ سہو کاتب ہے۔

ص ۲۵۹

۱۔ اردوے معلّٰی میں تاریخ تحریر پنجشنبہ' ۵ جون ۱۸۵۳ء ہے' لیکن ۵ جون کو پنجشنبہ نہیں یکشنبہ تھا۔

یہ بہ ظاہر سہوِ کاتب ہے۔

ص ۲۶۰

۱۔ غالبؔ کے لب و لہجے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مہاراجے پور سے جو پانچ سو روپے ملنے والے تھے، تفتہؔ نے اُن میں سے کچھ روپے مانگے تھے۔

ص ۲۶۱

۱۔ اِس خط پر تاریخِ تحریر نہیں ہے۔ مولوی مہیش نے اس کا سنہ تحریر ۱۸۵۱ء متعین کیا ہے، جو درست نہیں معلوم ہوتا، اس خط میں غالبؔ نے عطاء اللہ خاں نامی کا ذکر کیا ہے۔ ان ہی عطاء اللہ خاں نامی کا ذکر غالبؔ نبی بخش حقیرؔ کے نام خط مورخہ ۶ اکتوبر ۱۸۵۳ء میں کر چکے ہیں میرا خیال ہے کہ یہ خط اکتوبر ۱۸۵۳ء میں لکھا گیا ہوگا۔

ص ۲۶۵

۱۔ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی نے یہ خط پہلی بار نقوش (لاہور) سالنامہ ۱۹۶۳ء میں شائع کرایا تھا۔ پھر یہ خط ان کی کتاب "تلاشِ غالبؔ" میں شامل ہوا۔ اس خط پر تاریخِ تحریر نہیں ہے۔ فاروقی صاحب نے دلائل سے ثابت کیا ہے کہ یہ خط جون ۱۸۵۴ء میں لکھا گیا تھا۔ مجھے ان کی رائے سے اتفاق ہے۔ یہاں یہ خط "تلاشِ غالبؔ" سے نقل کیا گیا ہے۔

۲۔ اردوے معلّٰی "مضان"

۳۔ خط پر تاریخِ تحریر نہیں۔ غالبؔ نے جولائی ۱۸۵۴ء کے خط میں منشی نبی بخش حقیرؔ کو لکھا ہے کہ: "بھائی! اب کے تہنیتِ عید میں دو قصیدے کس انداز کے لکھے ہیں کہ دیکھو گے تو حظ اٹھاؤ گے۔ پرسوں یا اترسوں روانہ کروں گا۔ ہرگوپال صاحب کو بھی دکھا دیجے گا"۔ تفتہؔ کے نام اس خط میں بھی دو قصیدوں اور حقیرؔ کے نام خط کا ذکر ہے، اِس لیے امکان یہی ہے کہ یہ خط جولائی ۱۸۵۴ء میں لکھا گیا۔

ص ۲۶۶

۱۔ یہ تفتہؔ کے دوسرے دیوانِ فارسی کا ذکر ہے۔ یہ دیوان ۱۸۵۶ء میں مطبع کوہِ نور لاہور سے شائع ہوا تھا۔

۲۔ خط پر تاریخِ تحریر نہیں۔ غالبؔ نے ۲۵ مئی ۱۸۵۵ء کو منشی نبی بخش حقیرؔ کو لکھا تھا: "(تفتہؔ) مجھ سے

خفا ہیں۔ حکم تھا کہ دیوان کا دیباچہ لکھ۔ میں نے کہا، صاحب! تم ہر سال ایک دیوان لکھو گے، میں دیباچہ کہاں تک لکھا کروں گا۔" تفتہ کے نام یہی خط ہے، جس کا غالب نے ذکر کیا ہے۔ اِس لیے یہ خط اپریل یا مئی ۱۸۵۵ء میں لکھا گیا ہوگا۔

۳۔ اس خط میں غالب نے بابو صاحب یعنی جانی بہاری لال کا ذکر کیا ہے۔ غالب نے بابو صاحب کا ذکر مرزا ہرگوپال تفتہ اور سید بدرالدین احمد المعروف بہ فقیر کے خطوط میں بھی کیا ہے۔ خطوطِ غالب میں ان کا ذکر پہلی بار تفتہ کے نام خط مورخہ یکم فروری ۱۸۵۲ء میں اور آخری بار سید بدرالدین احمد المعروف بہ فقیر کے نام ۳ جنوری ۱۸۵۵ء کے خط میں آیا ہے، اِس لیے میرا قیاس ہے کہ یہ خط ۱۸۵۵ء یا اس سے قبل لکھا گیا۔

ص ۲۶۸

۱۔ غالب کا یہ بیان درست نہیں کہ غدر کے دوران انھوں نے فتنہ و آشوب میں کسی مصلحت میں دخل نہیں دیا۔ غالب غدر کے دوران کئی بار نہ صرف دربار میں حاضر ہوئے بلکہ انھوں نے کم سے کم تین قصیدے بہادر شاہ ظفر کی خدمت میں پیش کیے۔ ان کا یہ خیال غلط ثابت ہوا کہ اُن کے خلاف "مخبروں کے بیان سے کوئی بات پائی نہیں گئی۔" ایک جاسوس گوری شنکر نے ۱۹ جولائی ۱۸۵۷ء کو انگریزوں کو اطلاع دی تھی کہ غالب نے ایک سکہ کہہ کر ظفر کی نذر کیا ہے۔ گوری شنکر کی اس رپورٹ نے غالب کو کافی پریشانی میں مبتلا کیا تھا۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، غالب اور شاہانِ تیموریہ ص ص ۷۹ - ۸۴

غالب نے تاریخِ تحریر خط کے متن میں لکھی ہے۔

ص ۲۷۰ - ۱۔ اردوے معلیٰ "اگر" ۲۔ اردوے معلیٰ "ہر ایک"۔ "ہر" زائد۔

ص ۲۷۳

۱۔ اردوے معلیٰ میں یہ ۱۲۵۸ء ہے۔ ظاہر ہے یہ سہو کاتب ہے۔

ص ۲۷۴

۱۔ اردوے معلیٰ "سات"

۲۔ غالب نے یہ لفظ "جو درد تمھیں ہے، وہی اُسے ہے" کے مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ غالب نے منشی نبی بخش حقیر کے نام خط مورخہ ۲۲ دسمبر ۱۸۵۳ء میں بھی یہ لفظ اسی مفہوم میں استعمال کیا

ہے۔ تفتہ کے نام خط میں غالب کا اشارہ تفتہ کے لڑکے کی وفات کی طرف ہے۔ ۲۶ جولائی ۱۸۵۵ء کے خط میں غالب نے منشی نبی بخش حقیر کو لکھا تھا: ”مگر تم کو تفتہ کی بھی کچھ خبر ہے۔ ہیتمبر سنگھ اُس کا لاڈلا بیٹا مر گیا۔ ہائے اُس غریب کے دل پر کیا گزری ہوگی۔“

ص ۲۷۶

۱۔ اردوئے معلّٰی ”ہے“

۲۔ اردوئے معلّٰی ”صرف“

ص ۲۷۸

۱۔ اردوئے معلّٰی ”افسانۂ عجائب“

۲۔ یہ شعر مصحفی کے شاگرد نور الاسلام منتظر کا ہے۔ سرور نے ”فسانۂ عجائب“ میں دوسرا مصرع اس طرح لکھا ہے: ”یاد رکھنا تم فسانہ ہیں ہم لوگ۔“

۳۔ اس خط پر دن اور تاریخ ہے لیکن سنہ نہیں۔ خط میں غالب نے تفتہ کے اُس فارسی دیوان کا ذکر کیا ہے، جو ۱۸۵۷ء میں مطبع کوہِ نور لاہور سے شائع ہوا تھا۔ اگرچہ دیوان پر سنہِ اشاعت ۱۸۵۷ء ہے لیکن ممکن ہے کہ یہ اوائل ۱۸۵۶ء میں چھپ کر تیار ہوا ہو۔ تفتہ کا پہلا دیوان ۱۸۵۱ء میں چھپا تھا لیکن ۱۸۵۱ء میں ۲۶ جون کو پنجشنبہ ہے۔ ۱۸۵۷ء میں ۲۶ جون کو جمعہ ہے۔ اِس لیے امکان یہی ہے کہ یہ خط ۱۸۵۶ء کا ہو۔ مولوی مہیش نے بھی اسے ۱۸۵۶ء کا تسلیم کیا ہے۔

ص ۲۷۹

۱۔ اردوئے معلّٰی ”شال“

ص ۲۸۰

۱۔ عود اول و دوم ”درد نوائی“۔

۲۔ اردوئے معلّٰی ”پہلے تم کو“

۳۔ اردوئے معلّٰی، عود اول ”کہ“ ندارد۔

۴۔ عود اول و دوم ”پڑھ دینا“

۵۔ عود اول و دوم ”ہوں۔“

۶۔ عودِ اول "ہوا"

۷۔ اردوئے معلّیٰ "کے" ندارد

۸۔ عودِ اول "زندگی اپنی اسی ڈھب سے جو گزری غالبؔ"

ص ۲۸۱

۱۔ عودِ اول "انگریزی"

۲۔ عودِ دوم "اپنے"

۳۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ خط میں غالبؔ نے انقلاب ۱۸۵۷ء کے بارے میں اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ مولوی مہیش پرشاد نے جون ۱۸۵۸ء اور جولائی ۱۸۵۸ء کے درمیان خطوط میں اس خط کو ترتیب دیا ہے۔ بہ ظاہر یہ غلط نہیں معلوم ہوتا۔

ص ۲۸۲

۱۔ اردوئے معلّیٰ "مگر"

ص ۲۸۳

۱۔ "شفیق" سے مراد غالباً منشی غلام غوث خاں بے خبر ہے۔ غالبؔ نے تفتہ کے نام ۳ نومبر ۱۸۵۸ء کے خط میں لکھا ہے: "تم نے لکھا تھا کہ منشی غلام غوث خاں صاحب کو ایک گاؤں جاگیر میں ملا ہے"

۲۔ اردوئے معلّیٰ میں بہ قرأت "مطلع" ہے۔ جب کہ اسے "شعر" ہونا چاہیے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ سہو غالبؔ سے ہوا ہے یا کاتب سے۔

۳۔ اردوئے معلّیٰ "پوست"

۴۔ اردوئے معلّیٰ "عیاث"

ص ۲۸۴

۱۔ اردوئے معلّیٰ "مجھ پر اگر" "اگر" زائد

۲۔ اس خط پر غالبؔ نے دن، تاریخ اور مہینا لکھا ہے لیکن سنہ نہیں لکھا۔ یہ ۱۸۵۸ء ہونا چاہیئے۔ کیونکہ خط میں "دستنبو" کی طباعت کا ذکر ہے۔

۳۔ اردوئے معلّیٰ "اسی"

۴- غالب نے اکتوبر ۱۸۵۸ء کے خط میں میر مہدی مجروح کو "دستنبو" کی طباعت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔ "منشی امید سنگھ اندور والے دلّی آئے تھے۔ سابقہ معرفت مجھ سے نہ تھا۔ ایک دوست اُن کو میرے گھر لے آیا۔ انھوں نے وہ نسخہ دیکھا۔ چھپوانے کا قصد کیا۔... پچاس جلدیں منشی امید سنگھ نے لیں، پچیس روپے چھاپے خانے میں بہ طریقِ ہنڈوی بھجوا دیے۔"

ص ۲۸۵

۱- اردوئے معلّٰی کے حاشیے پر ان الفاظ کے معنی اس طرح دیے گئے ہیں: افسر، تاج — افسار، پوزی۔ گرزن، تاج — چادر گردش، تغیرِ حال۔

ص ۲۸۶

۱- خط پر تاریخِ تحریر نہیں ہے۔ غالب نے "دستنبو" کا مسودہ بھیجنے کا ذکر کیا ہے۔ یہ واقعہ اگست ۱۸۵۸ء کا ہے۔

ص ۲۸۸

۱- اردوئے معلّٰی میں دن اور مہینا تو ہے، سنہ نہیں۔ چوں کہ غالب نے "دستنبو" کا ذکر کیا ہے اس لیے یہ خط ۱۸۵۸ء میں لکھا گیا ہوگا۔

۲- اردوئے معلّٰی "ہجم"

ص ۲۸۹

۱- بھائی سے مراد منشی نبی بخش حقیر ہیں۔

ص ۲۹۰

۱- اردوئے معلّٰی "نوا"

ص ۲۹۱

۱- مضمون بتا رہا ہے کہ یہ خط ۳ اور ۷ ستمبر ۱۸۵۸ء کے درمیان ہی لکھا گیا ہوگا۔

ض ۲۹۲

۱- اردوئے معلّٰی "فرنچھہ" بجائے "فرنچ"

ص ۲۹۳

۱- اردوئے معلّٰی میں یہ قرأت "چاہیں" تھیں۔ مولوی مہیش نے بغیر اطلاع کے اس قرأت کو "چاہی" کر دیا ہے

میرے خیال سے "چاہیں" قرأت درست ہے۔

ص ۲۹۵

۱۔ اردوے معلّٰی "ستمبر" ندارد

ص ۲۹۶

۱۔ خط پر تاریخِ تحریر میں سنہ نہیں لکھا گیا۔ چوں کہ خط میں "دستنبو" کی جلد سازی کا ذکر کیا گیا ہے اس لیے یہ ستمبر کا مہینا اور ۱۸۵۸ء ہے۔ اردوے معلی میں تاریخ "جمعہ، ۷ ستمبر" ہے۔ یہ درست نہیں، کیوں کہ ۷ ستمبر کو "سہ شنبہ" اور "۱۷ ستمبر" کو "جمعہ" ہے۔ اِس لیے یہ تاریخ "۱۷ ستمبر" ہونی چاہیے۔

۲۔ اردوے معلّٰی "نوا"

ص ۲۹۷

۱۔ خط پر تاریخِ تحریر نہیں۔ غالب نے اس خط میں مرزا حاتم علی مہر کے نام اُس خط کا ذکر کیا ہے جس میں انھوں نے حکیم احسن اللہ خاں کے نام "آفتاب عالم تاب" جاری کرانے کی فرمایش کی تھی۔ غالب نے مہر کے نام مکتوب میں اسی خط کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا: "کل دوشنبے کا دن، ۲۰ ستمبر کی تھی۔ صبح کو میں نے آپ کو شکایت نامہ لکھا۔" تفتہ کے اس زیرِ بحث خط میں غالب نے مہر کے نام اس خط کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے: "آج صبح کو بہ سبب حکیم صاحب کے تقاضے کے، شکوہ آمیز خط جناب مرزا صاحب (مہر) کی خدمت میں بھیجا۔" اس کا مطلب ہے کہ تفتہ کے نام یہ خط ۲۰ ستمبر ۱۸۵۸ء کو لکھا گیا۔

ص ۳۰۲

۱۔ اردوے معلّٰی "نوامبر"

۲۔ اردوے معلّٰی "بھی"

ص ۳۰۴

۱۔ تاج گنج میں رہنے والوں سے مراد منشی نبی بخش حقیر اور اُن کے صاحبزادے سے ہے۔ نہ جانے یہ دونوں کس الزام میں گرفتار ہوئے تھے۔ امکان یہی ہے کہ یہ بغاوت کے الزام میں گرفتار ہوئے ہوں۔

ص ۳۰۶

۱۔ اردوے معلّٰی "شنائی"

ص ۳۰۷

ا۔ اردوے معلی میں یہ تاریخ ۷ دسمبر ۱۸۵۸ء ہے جو بظاہر سہوِ کاتب ہے، کیوں کہ تقویم کی رو سے "۷ دسمبر" کو سوموار نہیں "منگل" ہے۔ دسمبر کی "۲۷" کو البتہ سوموار ہے اِس لیے یہ خط ۲۷ دسمبر کو لکھا گیا ہوگا۔ مولوی مہیش نے اس قرات کو درست کر دیا تھا، لیکن اس کی اطلاع نہیں دی۔

ص ۳۱۰

ا۔ اردوے معلّٰی "لے"

ص ۳۱۱

ا۔ اردوے معلّٰی "منگوائی"

۲۔ بعد کی اشاعتوں میں "اجی مرزا تفتہ ..... ضرور لکھیے گا" کو ایک الگ خط بنا دیا گیا ہے، جو درست نہیں۔

ص ۳۱۲

ا۔ خط پر تاریخ ہے لیکن سنہ تحریر نہیں۔ خط میں راے امید سنگھ اور تقویم کی مدد سے سنہ کا تعین کیا گیا ہے۔ غالب نے تاریخِ تحریر خط کے شروع میں دی ہے۔

۲۔ اردوے معلّٰی "چھڑا"

ص ۳۱۶

ا۔ اردوے معلّٰی "گر"

ص ۳۱۷

ا۔ اردوے معلّٰی "نصحت"

ص ۳۱۹

ا۔ خط پر تاریخِ تحریر نہیں ہے۔ تفتہ کے نام ۱۴ فروری ۱۸۶۰ء کے خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خط اوائل فروری ۱۸۶۰ء میں لکھا گیا ہوگا، کیوں کہ دونوں خطوں میں تفتہ کو رام پور بلانے کا ذکر ہے۔

ص ۳۲۰

ا۔ اردوے معلّٰی "چیر"

ص ۳۲۱

۱۔ اردوے معلیٰ میں تاریخِ تحریر میں ۱۸۶۲ء ہے، جو درست نہیں۔ یہ ۱۸۶۰ء ہونا چاہیے۔ خود غالب نے خط میں اس سال کو ۱۲۷۷ء بتایا ہے جو تقویم کی رُو سے ۱۸۶۰ء ہے۔ اس خط میں غالب نے سفرِ رام پور کا ذکر کیا ہے۔ رام پور کو غالب کا یہ پہلا سفر تھا۔ وہ ۱۹ جنوری ۱۸۶۰ء کو روانہ ہوئے تھے، اور ۲۴ مارچ کو دہلی واپس آئے تھے۔

ص ۳۲۳

۱۔ اردوے معلیٰ میں تاریخِ تحریر خط کے آغاز میں ہے۔ تقویم کی رُو سے "۶ مئی" کو "یکشنبہ" ہے۔

ص ۳۲۴

۱۔ اردوے معلیٰ "کٹگر"

۲۔ اردوے معلیٰ "لال کنوے"

ص ۳۲۵

۱۔ اردوے معلیٰ، "کی کی" ایک "کی" زائد۔

۲۔ تاریخِ تحریر خط کے آغاز میں لکھی گئی ہے اور ہجری اور عیسوی سنین نہیں لکھے گئے۔ منشی نبی بخش کا انتقال ۱۲۷۷ھ میں ہوا تھا اِس لیے یہ ۱۲۷۷ھ اور ۱۸۶۰ء ہے۔ تقویم کی رُو سے بھی یہی سنین قرار پاتے ہیں۔

ص ۳۲۶

۱۔ غالب نے تاریخِ تحریر میں سنہ نہیں لکھا۔ خط میں تفتہ کی "سبنلستاں" کی طباعت کا ذکر ہے۔ "سبنلستاں" کے بارے میں غالب نے ۹ اپریل ۱۸۶۱ء کے ایک خط میں تفتہ کو لکھا تھا: "سبنلستان ایک معشوقِ خوب رو ہے، بد لباس ہے"۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ خط بھی ۱۸۶۱ء میں لکھا گیا۔ یوں بھی ۲۰ جنوری ۱۸۶۱ء کو "یکشنبہ" تھا۔

۲۔ اردوے معلیٰ "دونو"

۳۔ اردوے معلیٰ "دونو"

ص ۳۲۷

۱۔ اِس قصیدے کے بارے میں قاضی عبدالودود لکھتے ہیں: "غالب کے ایک خاص شاگرد میکش کی

رسائی لکھنؤ میں قطب الدولہ کے یہاں ہوگئی۔ غالب کو اس کا امکان نظر آیا کہ قطب الدولہ کی وساطت سے واجد علی شاہ کی خدمت میں قصیدہ پیش کر کے صلہ وصول کیا جائے۔ مگر وہ چاہتے تھے کہ کم از کم پانچ ہزار ملیں۔ چوں کہ خود صلے کی رقم مقرر کر دینا دستور نہیں، انھوں نے یہ دکھانا چاہا کہ یہ دربارِ اودھ کا معمول ہے کہ مجھے قصیدے کا صلہ اس قدر ملے۔ نصیر الدین حیدر کی مدح کے قصیدے کی نسبت قطب الدولہ کو لکھتے ہیں ......" از عہدِ اورنگ نشینی نصیر الدین حیدر ..... بہ صیغۂ مدح زلہ خوار خوان عطاے آن سلطنتم۔ قصیدۂ من بوساطت روشن الدولہ بہ پیشگہ سلطان ..... گذشتہ و پنج ہزار روپیہ مرحمت گشتہ" اس کے صراحتہً یہ معنی نکلتے ہیں کہ غالب نے صلہ پایا ورنہ زلہ خوار خوان عطا" مہمل ہو جاتا ہے۔ صلہ یابی کی امید منقطع ہونے لگی تو غالب نے عالمِ یاس میں میکش کو لکھا کہ میری یہ قسمت کہاں کہ صلہ ملے۔" نصیر الدین حیدر مدح شنید و زر بخشید، روشن الدولہ و منشی محمد حسن پاک بخوردند و پشیزی بمن نرسید" لیکن یہ بھی داستانِ محض ہے۔ نصیر الدین حیدر تک قصیدہ پہنچا ہی نہیں، اس صورت میں صلے کا کیا سوال ہے۔ کلیات کے ایک سے زیادہ قدیم نسخوں میں قصیدۂ مذکور کا عنوان یہ ہے ..." نگارش پذیرفتن مدح شاہ اودھ درجریدہ و بورق یادگار ماندن مدح بہ ممدوح نہ رسیدہ، از عالمِ مستی بہ بوے بادہ ناکشیدگی" اس داستان میں بعد کو غالب نے یہ اضافہ کیا "اس سلسلے میں ناسخ سے مراسلت ہوئی اور انھوں نے وعدہ کیا کہ روپے (کذا) روشن الدولہ کے حلق سے نکال لیں گے مگر اسے کیا کیجیے کہ اس کے بعد ہی نصیر الدین حیدر فوت ہو گئے۔" غالب یہ بھی فراموش کر گئے کہ عہدِ روشن الدولہ میں ناسخ کا وہ اثر نہ تھا کہ ایسا وعدہ کر سکتے (بین الاقوامی سمینار، نئی دِلی ۱۹۶۹ء ص ص ۲۷-۲۸)

ص ۳۲۹

۱۔ اردوے معلّیٰ "دیکھو"

ص ۳۳۰

۱۔ تاریخِ تحریر غالب نے خط کے متن میں لکھی ہے۔ تاریخ میں سنہ نہیں لکھا۔ یہ ۱۸۶۱ء ہے۔ ۱۲ ستمبر کو پنجشنبہ ۱۸۶۱ء میں ہے۔ مولوی مہیش نے اس خط کا سن تحریر ۱۸۶۳ء قرار دیا ہے۔

چوں کہ اس سنہ میں ۱۲ ستمبر کو "شنبہ" ہے۔ اس لیے مولوی صاحب نے بغیر اطلاع خط کی تاریخ "۱۲ ستمبر" سے بدل کر "۱۰ ستمبر" کر دی، جو صحیح نہیں۔

۲۔ اردوے معلیٰ "کر" ندارد۔

ص ۳۳۲

۱۔ اردوے معلیٰ مجتبائی "بنا"

۲۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ اس خط میں غالب نے "دراعہ" کے بارے میں گفتگو کی ہے اور اسی لفظ کے بارے میں ۱۲ ستمبر ۱۸۶۱ء کے خط میں بحث کی تھی، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خط ستمبر ۱۸۶۱ء ہی میں لکھا گیا ہوگا۔

۳۔ اردوے معلیٰ، مجتبائی، "برآورم"

ص ۳۳۴

۱۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں ہے۔ تفتہ کے نام غالب کے ۴ اکتوبر ۱۸۶۱ء اور دسمبر ۱۸۶۱ء کے خطوط کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۴ اکتوبر ۱۸۶۱ء کے بعد اور دسمبر ۱۸۶۱ء سے پہلے لکھا ہوگا۔

۲۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ خط کے مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ خط ستمبر ۱۸۶۱ء کے بعد اور دسمبر ۱۸۶۱ء سے قبل لکھا گیا ہوگا۔

ص ۳۳۶

۱۔ اردوے معلیٰ "پس"

ص ۳۳۷

۱۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ خط میں "زمان" اور "زمانہ" پر گفتگو کی ہے۔ یہی گفتگو، ۲۷ اگست ۱۸۶۲ء کے خط میں بھی ہے۔ اِس لیے یہ خط بھی اگست ۱۸۶۲ء میں لکھا گیا ہوگا۔ اس کا بھی امکان ہے کہ یہ خط، ۲۷ اگست والے خط سے پہلے لکھا گیا ہو۔

ص ۳۳۹

۱-۲۔ اردوے معلیٰ "میرٹھ"

۳۔ اردوے معلّٰی "دیں"

۴۔ خط پر تاریخِ تحریر" روز چارشنبہ، ۱۳ رمضان ۴ فروری" ہے۔ غالب نے انبالے کے دربار کا ذکر کیا ہے۔ یہ ۱۸۶۳ء کا واقعہ ہے کیوں کہ ۱۶ مارچ ۱۸۶۳ء کے خط میں غالب نے نواب یوسف علی خاں ناظم کو پوری تفصیل لکھی تھی۔ غالب نے البتہ مہینا غلط لکھا ہے یا ممکن ہے کہ یہ سہوِ کاتب ہو، یہ مہینا فروری نہیں مارچ ہے۔

ص ۳۴۰

۱۔ خط پر تاریخِ تحریر نہیں۔ غالب نے ۱۶ مارچ ۱۸۶۳ء کے خط میں نواب یوسف علی خاں ناظم کو لکھا ہے کہ "منگل ۳ مارچ کو جناب لفٹنٹ گورنر بہادر نے خلعت عطا کی" اس خط میں اسی خلعت کا ذکر ہے، اس لیے یہ خط مارچ یا اپریل اور زیادہ امکان ہے کہ اپریل ۱۸۶۳ء میں لکھا گیا ہو۔

۲۔ خط پر تاریخ اور مہینا تو ہے، لیکن سنہ نہیں۔ پاؤں پر ورم کی تقریباً یہی تفصیل غالب نے ۳ جولائی ۱۸۶۳ء کے خط میں نواب علاء الدین خاں علائی کو لکھی تھی اس لیے یہ خط بھی اسی سنہ میں لکھا گیا ہوگا۔

ص ۳۴۱

۱۔ خط پر تاریخِ تحریر نہیں۔ غالب نے مختلف لوگوں کے نام جولائی اور اگست ۱۸۶۳ء کے خطوں میں پھوڑوں کے مرض کا ذکر کیا ہے، اور ۳ جولائی ۱۸۶۳ء کے خط میں تفتہ کو لکھا تھا: "آپ کے سب خط پہنچے، سب قصیدے پہنچے۔ بعد اصلاح بھیج دیے گئے"۔ اس خط میں ۳ جولائی کے خط کا ذکر اس طرح کیا ہے: "اپنا حال پرسوں کے خط میں مفصل لکھ چکا ہوں"۔ اس لیے یہ خط ۵ جولائی ۱۸۶۳ء کو لکھا گیا ہوگا۔

ص ۳۴۲

۱۔ اردوے معلّٰی مجتبائی "پیچ" ندارد۔

ص ۳۴۴

۱۔ خط پر تاریخِ تحریر نہیں۔ غالب نے خط میں پاؤں کے ورم اور ہاتھ کے پھوڑوں کا ذکر کیا ہے۔

انھیں یہ بیماری مارچ ۱۸۶۳ء میں ہوئی تھی اور ستمبر میں وہ صحت یاب ہوئے تھے۔ اس لیے امکان یہی ہے کہ یہ خط مارچ اور ستمبر ۱۸۶۳ء کے درمیان لکھا گیا۔

ص ۳۴۵

۱۔ غالبؔ نے تاریخِ تحریر میں سنہ نہیں لکھا۔ تقویم کی رُو سے یہ ۱۸۶۴ء ہے۔ غالبؔ نے خط کے آغاز میں تاریخِ تحریر لکھی ہے۔

ص ۳۴۶

۱۔ اردوئے معلّٰی میں تاریخِ تحریر میں ۱۸۶۲ء ہے لیکن ۱۴ اکتوبر ۱۸۶۲ء کو "سہ شنبہ" تھا۔ جبکہ غالبؔ نے "جمعہ" لکھا ہے۔ تقویم کی رو سے اگر مطابقت کی جائے تو ایک دن سے زیادہ کا فرق نہیں پڑتا جبکہ اس تاریخ میں تین دن کا فرق پڑ رہا ہے۔ مولوی مہیشؔ نے ۱۸۶۴ء تجویز کیا ہے جو درست معلوم ہوتا ہے۔

ص ۳۴۸

۱۔ اردوئے معلّٰی "جو اس"۔

۲۔ "سِک نمبر" سے مراد فوج کا وہ سپاہی ہے جسے بیماری کی وجہ سے ڈاکٹر آرام کی ہدایت کرتے ہیں۔ اس صورت میں اصل تلفّظ Sick Number ہوگا۔

ص ۳۴۹

۱۔ غالبؔ نے نواب یوسف علی خاں ناظمؔ کے نام جس خط کا ذکر کیا ہے اُس کے بارے میں مولانا امتیاز علی خاں عرشی فرماتے ہیں: "گو وہ عریضہ مثلوں میں موجود نہیں ہے لیکن دوسری مثلوں میں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب کا یہ ارشاد کہ "برس دن سے اُن کا کلام نہیں آتا" حقیقی عذر ہے کیونکہ دسمبر ۱۸۶۳ء سے دسمبر ۱۸۶۴ء تک نواب فردوس مکاں نے تقریباً ہر ماہ خط بھیجا ہے مگر کسی میں اشعار کے ارسال کی اطلاع یا مرسلہ کلام کی واپسی کا تقاضا درج نہیں ہے۔ مکاتیبِ غالبؔ (چھٹا اڈیشن) ص ۸۷)

۲۔ غالبؔ نے تاریخِ تحریر میں صرف "۱۴ رجب" لکھا ہے۔ اس خط میں رنگین کے اُس تذکرے کا ذکر ہے جو وہ فارسی اور اردو شاعروں کا لکھ رہے تھے۔ تفتہؔ کے نام ۹ دسمبر ۱۸۶۴ء کے خط میں بھی

اس تذکرے پر گفتگو ہے، اس لیے اس خط کا سنہ تحریر ۱۸۶۴ء قرار پائے گا۔

۳۔ اردوے معلّیٰ، "کو"۔

ص ۳۵۰

۱۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں ہے۔ اس تاریخ کا تعین اس بنیاد پر کیا گیا ہے کہ فروری ۱۸۶۵ء میں مرزا تفتہ لکھنؤ تھے۔ دیکھیے غالب کا خط بنام تفتہ مورخہ ۱۲ فروری ۱۸۶۵ء۔ یہ خط ۱۲ فروری کے بعد لکھا گیا ہوگا۔

ص ۳۵۱

۱۔ اردوے معلّیٰ مجتبائی "سُب گھڑی"۔

ص ۳۵۲

۱۔ اردوے معلّیٰ، مجتبائی "لکھنؤ"

۲۔ ۲۱ اپریل ۱۸۶۵ء کو نواب یوسف علی خاں ناظم کا انتقال ہوگیا تھا۔ غالب نے نواب کلب علی خاں کو اُن کے والد کی وفات پر تعزیت اور اُن کے مسند نشین ہونے پر تہنیت لکھی تھی۔

ص ۳۵۴

۱۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں ہے۔ غالب نے مرزا تفتہ کے نام ۱۴ مئی ۱۸۶۵ء کے خط میں تقریباً اِن ہی تمام الفاظ پر بحث کی تھی۔ اِس لیے یہ خط ۱۴ مئی ۱۸۶۵ء کے بعد اور غالباً آخر مئی ۱۸۶۵ء میں لکھا گیا ہوگا۔

ص ۳۵۵

۱۔ تقویم کی رو سے ۲۸ نومبر کو "سہ شنبہ" ہے

۲۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ غالب نے خط میں رام پور سے واپسی کا ذکر کیا ہے۔ یہ رام پور کے دوسرے سفر کا ذکر ہے۔ مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خط جنوری ۱۸۶۵ء میں لکھا گیا ہوگا۔

ص ۳۵۶

۱۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ غالب نے ۱۸۶۷ء میں "اکمل الاخبار" اور "اشرف الاخبار" میں اپنا حال چھپوا کر معذرت کی تھی کہ اب وہ کلام کی اصلاح نہیں کر سکتے۔ یہی بات پنڈت بدری ناتھ

کے بارے میں اس خط میں کہی ہے۔ اِس لیے ممکن ہے کہ یہ خط بھی اسی سال لکھا گیا ہو۔

ص ۳۵۸

۱۔ اردوے معلّٰی مجتبائی اور دوسرے اڈیشنوں میں یہ قرأت ہے: "مثل زمیں نہ بہ حذفِ نون" پہلی بار "خطوطِ غالب" میں ڈاکٹر عبد الستار صدیقی نے یہ قرأت درست کی ہے۔

۲۔ اردوے معلّٰی، مجتبائی "کنوی"

۳۔ تفتہ نے غالباً یہ قصیدہ غالب کی مدح میں کہا تھا۔

ص ۳۵۹

۱۔ اردوے معلّٰی مجتبائی "امورِ دینی" "دینی" بجائے "دین"

ص ۳۶۴

۱۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ خط میں جو قطعہ نقل کیا گیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ۱۸۵۷ء کے آخر یا ۱۸۵۸ء میں لکھا گیا ہو گا۔

۲۔ بھائی سے مراد مرزا یوسف ہے، جو غالب کے اکلوتے بھائی تھے۔

ص ۳۶۵

۱۔ خط پر تاریخِ تحریر نہیں۔ خط کے شروع میں غالب نے لکھا ہے: "آج بدھ کے دن، ۲۷ رمضان کو" اور علائی کے مرحوم بچے کی تاریخ وفات ۱۲۷۴ھ نکالی ہے۔ اِس لیے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خط ۲۷ رمضان ۱۲۷۴ھ کو لکھا گیا ہو گا۔ ۲۷ رمضان کو تقویم کی رو سے، بدھ نہیں، منگل تھا۔

۲۔ اردوے معلّٰی اور مہیش کے ہاں یہ قرأت "جابردن" ہے۔ غالباً پہلی بار مولانا غلام رسول مہر نے اس طرف توجہ دلائی ہے کہ یہ قرأت "جابردار" ہونی چاہیے جو درست معلوم ہوتی ہے۔

۳۔ نواب امین الدین احمد خاں۔

۴۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں۔

ص ۳۶۶

۱۔ اردوے معلّٰی "۱۲۶۶ء" ظاہرا یہ سہوِ کاتب ہے۔

ص ۳۶۷

۱۔ اردوے معلّٰی میں یہ قرأت "۷ جون" ہے۔ غالب نے "سترہ ذی الحجہ" بھی لکھی ہے۔ مہیش اور فاضل

دونوں کے ہاں یہی قرأت ہے۔ تقویم کی رو سے اسے ۷ جولائی ہونا چاہیے۔ ہاں، ۷ جولائی ۱۸۶۰ء کو ذی الحجہ کی ۱۸ تاریخ تھی، سترہ نہیں۔

ص ۳۶۸

۱۔ خط پر تاریخِ تحریر نہیں۔ خط میں غالب نے لکھا ہے: "آج سات جون اور سترہ ذی الحجہ ہے"۔ خط کے شروع میں غالب نے لکھا ہے: "پنشن بے کم و کاست جاری ہوا۔ زرِ مجتمعۂ سہ سالہ یک مشت مل گیا۔" یہ واقعہ ۱۸۶۰ء کا ہے، کیوں کہ چار مئی ۱۸۶۰ء کو غالب کو پنشن کے دو ہزار ایک سو پچاس روپے ملے تھے۔

۲۔ اردوے معلّیٰ "دونو"

۳۔ اردوے معلّیٰ "صد"

۴ اردوے معلّیٰ "نا"

۵۔ اردوے معلّیٰ "و" ندارد۔

۶۔ اردوے معلّیٰ "کھٹا"

ص ۳۶۹

۱۔ غالب نے تاریخِ تحریر میں صرف "پنجشنبہ ۴ اپریل" لکھا ہے۔ ۴ اپریل کو پنجشنبہ ۱۸۶۱ء میں تھا۔ غالب نے لکھا ہے کہ: "محلہ سابق کا نام لکھتے ہیں"۔ مکان بدلنے کا ذکر غالب نے تفتہ کے نام ایک خط مورخہ ۲۰ جولائی ۱۸۶۰ء میں کیا ہے۔ خطِ زیرِ بحث سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب مکان تبدیل کر چکے ہیں۔ اس لیے یہ خط ۱۸۶۱ء میں لکھا گیا ہوگا۔ مولوی مہیش نے بھی یہی سنہ قرار دیا ہے۔

ص ۳۷۰

۱۔ اردوے معلّیٰ "تخلص بہتر"، "بہتر" زائد۔

ص ۳۷۱

۱۔ اردوے معلّیٰ "ماحدہ"

۲۔ اردوے معلّیٰ "لکھکرہا"

۳۔ اس خط کی تاریخِ تحریر میں غالب نے سنہ نہیں لکھا۔ جون ۱۸۶۱ء کے خط میں غالب نے "لغاتِ دساتیر" کا ذکر کیا ہے۔ اِس لیے یہ خط بھی ۱۸۶۱ء میں لکھا گیا۔ تقویم کی رُو سے یکم جون کو شنبہ تھا۔

ص ۳۷۲

۱۔ عود اول و دوم "جانِ غالب.... ماجرا کیا ہے" ندارد۔

۲۔ عود اول "الملک لمن الیوم۔"

۳۔ عود اول و دوم "چنانچہ ۸ رجب ۱۲۱۲ھ کو مجھ کو روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا۔"

۴۔ عود اول و دوم "۱۷"

۵۔ عود اول و دوم "فکر" ندارد۔

۶۔ عود اول "جہل خانے میں سے۔" عود دوم "جیل خانے میں سے۔"

۷۔ عود اول و دوم "ایک"

۸۔ اردوے معلّٰی "اس"

۹۔ اردوے معلّٰی "اس ماہ ذی الحجہ" عود اول و دوم دونوں میں "۱۲۷۷ھ" بھی ہے۔

۱۰۔ عود اول و عود دوم۔ دونوں میں یہ خط یہیں ختم ہو جاتا ہے۔

ص ۳۷۳

۱۔ اردوے معلّٰی "ماویں"

ص ۳۷۴

۱۔ اردوے معلّٰی "کماں"

۲۔ نسخۂ عرشی "یا رب، وہ نہ سمجھے ہیں۔ الخ"

ص ۳۷۵

۱۔ نسخۂ عرشی "بوسہ"

۲۔ اس خط میں تاریخ تحریر نہیں۔ غالب نے اس خط میں لکھا ہے: "اسی ماہ ذی الحجہ ۱۲۷۷ھ میں چھوٹ جاؤں گا۔" تقویم کی رُو سے یہ جون ۱۸۶۱ء ہے۔

ص ۳۷۶

۱۔ اردوے معلّٰی "گاشنگ"

۲۔ "رئیس" سے مراد رام پور کے نواب یوسف علی خاں ناظم ہیں۔

۳۔ "مرشد زادے" سے مراد نواب یوسف علی خاں کے منجھلے صاحبزادے سید حیدر علی خاں ہے۔ اُن کی کی شادی ۲۷ جولائی ۱۸۶۱ء کو ہوئی تھی۔

۴۔ اردوے معلّیٰ "خیر"

۵۔ غالبؔ نے تاریخِ تحریر خط کے آغاز میں لکھی ہے۔

ص ۳۷۹

۱۔ اردوے معلّیٰ "آدیا"

۲۔ اردوے معلّیٰ "باقر"

۳۔ غالبؔ نے تاریخِ تحریر خط کے آغاز میں لکھی ہے۔

ص ۳۸۰

۱۔ امام محمد اور امام ابو یوسف کو صاحبین کہا جاتا ہے۔ فقہ کے مسائل پر ان دونوں میں بہت اختلاف تھا۔

۲۔ اردوے معلّیٰ "زیادہ"

۳۔ اردوے معلّیٰ "بود"

ص ۳۸۱

۱۔ خط پر تاریخِ تحریر نہیں۔ قربان علی بیگ سالکؔ اور شمشاد علی بیگ رضوانؔ لوہارو میں ملازمت کے خواہاں تھے اور غالبؔ کی کوششوں سے دونوں کو ملازمت مل گئی تھی۔ علاء الدین خاں علائیؔ کے نام ۹ فروری ۱۸۶۲ء کے خط میں غالبؔ نے جس انداز میں ان دونوں کا ذکر کیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خط زیرِ بحث ۹ فروری ۱۸۶۲ء سے قبل لکھا گیا ہوگا۔

۲۔ اردوے معلّیٰ "گیا آیا"، "آیا" زائد۔

۳۔ یعنی صرف شمشاد علی بیگ رضوانؔ کو لوہارو بلانا چاہتے ہیں۔

۴۔ غالبؔ نے تاریخِ تحریر خط کے آغاز میں لکھی تھی۔

ص ۳۸۲

۱۔ حکیم منجھلے کا اصل نام حکیم حسام الدین تھا۔

۲۔ اردوے معلّیٰ "فرمائیے۔"

۳۔ اردوئے معلّٰی ''سپارس''

ص ۳۸۳

۱۔ غالبؔ نے خط کے آغاز میں صرف ''شنبہ ۵ اشعبان و فروری، وقتِ نمازِ ظہر'' لکھا ہے۔ تقویم کی رُو سے یہ ۱۲۷۸ھ مطابق ۱۸۶۲ء ہے۔ غالبؔ نے ۱۶ فروری ۱۸۶۲ء کو علائی کے نام ایک خط میں امین الدین خاں کے بارے میں لکھا تھا ''کل تمھارے خط کا جواب بھیج چکا ہوں، پہنچا ہوگا ..... حکیم محمود خاں کے طور پر معالجہ قرار پایا ہے، یعنی انھوں نے نسخہ لکھ دیا ہے۔'' اس کا مطلب ہے کہ زیرِ بحث خط ایک دن پہلے یعنی ۱۵ فروری ۱۸۶۲ء کو لکھا گیا۔

ص ۳۸۴

۱۔ اردوئے معلّٰی ''ہے''

۲۔ غالبؔ نے تاریخِ تحریر خط کے آغاز میں اس طرح دی ہے۔ ''یکشنبہ ۱۶ فروری ۱۸۶۲ء ہنگامِ نیمروز۔''

ص ۳۸۵

۱۔ اردوئے معلّٰی ''سپارس''

۲۔ مغل بچوں سے مراد مرزا قربان علی بیگ سالکؔ اور مرزا شمشاد علی بیگ ہے۔

۳۔ اردوئے معلّٰی میں یہ قرأت ''گرمینٹ'' ہے۔ ممکن ہے غالبؔ اسی طرح تلفظ کرتے ہوں۔

۴۔ غالبؔ نے تاریخِ تحریر خط کے آغاز میں لکھی ہے۔ غالبؔ نے ''یکشنبہ'' لکھا ہے جبکہ تقویم کی رو سے یکم مارچ ''کو شنبہ'' تھا۔ خود غالبؔ نے خط میں لکھا ہے کہ ''کل جمعے کے دن نواب کا مسہل تھا۔''

ص ۳۸۶

۱۔ اردوئے معلّٰی ''سوائے''

۲۔ اس خط کی تاریخِ تحریر میں غالبؔ نے سنہ نہیں لکھا۔ یکم مارچ ۱۸۶۲ء کے خط میں غالبؔ نے علاء الدین خاں علائی کو اُن کے والد کی بیماری کے بارے میں لکھا تھا۔ نیز لوہارو میں مرزا قربان علی بیگ سالکؔ اور مرزا شمشاد علی بیگ رضوانؔ کی ملازمت کے بارے میں لکھا تھا۔ یہی دونوں باتیں اس خط میں بھی لکھی ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خط ۱۸۶۲ء ہی میں لکھا گیا۔

ص ۳۸۷

۱۔ اردوئے معلّٰی ''اتر کر''

ص ۳۸۸

۱۔ اردوئے معلیٰ "مرجائیے"

۲۔ شہاب الدین احمد خاں کا نام مزاحاً اس طرح لکھا ہے۔

۳۔ اردوئے معلیٰ "یوم الخمس"

۴۔ خط پر تاریخِ تحریر نہیں۔ غالب نے دن اور تاریخ دونوں خود خط میں لکھے ہیں۔ اس خط میں یہ بھی لکھا ہے کہ "قاطعِ برہان" کا چھاپا تمام ہو گیا۔ "قاطعِ برہان" کا پہلا اڈیشن نول کشور، لکھنؤ سے ۱۸۶۲ء میں شائع ہوا تھا۔ اِس لیے یہ خط ۱۹ جون ۱۸۶۲ء کو لکھا گیا۔

ص ۳۹۱

۱۔ اصل خط میں ایک فارسی اور ایک اردو غزل اور بھی ہیں۔

ص ۳۹۲

۱۔ خط پر تاریخِ تحریر نہیں۔ لفافے پر غالب نے "روزِ آدینہ ۱۸ جولائی" لکھا ہے۔ غالب نے علائی کے نام خط مورخہ ۲۷ جولائی ۱۸۶۲ء میں "داماں گلہ دارد" والے شعر اور عرفی کا ذکر کیا ہے۔ اس خط میں بھی ان دونوں کا ذکر ہے۔ اِس لیے یہ خط بھی ۱۸۶۲ء میں لکھا گیا ہوگا۔

ص ۳۹۴

۱۔ اردوئے معلیٰ "میاں جان"

۲۔ دامانِ نگہ تنگ و گل حسنِ تو بسیار   گلچیں نگاہ تو ز داماں گلہ دارد
در بزمِ وصالِ تو بہ ہنگامِ تماشا   نظارہ ز جنبیدنِ مژگاں گلہ دارد

یہ اشعار غالب نے قدسی کی طرف منسوب کیے ہیں۔ کلیاتِ قدسی کے دو قلمی نسخے دیکھے۔ نہ یہ اشعار ملتے ہیں نہ اِس زمین میں کوئی غزل۔ فارسی اشعار کے ایک مطبوعہ مجموعے میں یہ اشعار عشرتی کے نام نظر آئے۔ مقطع کا ایک مصرع یاد ہے۔ "اے عشرتی از وضعِ تو جاناں گلہ دارد" قاضی عبدالودود، 'معیار' (پٹنہ) جولائی ۱۹۳۶ء ص ۳۸۴

۳۔ خط پر تاریخِ تحریر نہیں۔ ۱۹ جون ۱۸۶۲ء کے ایک خط میں غالب نے علائی کو میر جان کے بارے میں لکھا: "کل استاد میر جان نے تمہارا خط مجھ کو دکھایا ہے۔ میں نے اُن کو جانے نہ جانے میں متردد پایا۔" اس خط میں بھی

میرجان کے لوہارو جانے کا ذکر ہے۔ علائی کے نام ۱۸۶۲ء کے دو خطوط میں قدسی کی "مژگاں گلہ دارد" والی غزل کا ذکر ہے۔ اِس لیے قیاس کہتا ہے کہ یہ خط بھی ۱۸۶۲ء میں لکھا گیا۔

۴۔ اردوے معلّیٰ "آٹھ" ندارد۔

ص ۳۹۶

۱۔ غالباً نواب الٰہی بخش خاں معروف کے چھوٹے بھائی نواب احمد بخش خاں سے مراد ہے۔

۲۔ اردوے معلّیٰ "حمزہ خاں"

ص ۳۹۷

۱۔ خطوطِ غالب کے بیشتر مجموعوں میں یہ قرأت "اباعث" ہے۔ غالباً پہلی بار ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے خطوطِ غالب مرتبہ مہیش پرشاد میں اسے درست کر کے "اباحت" کیا ہے۔

۲۔ اردوے معلّیٰ "کے"

ص ۳۹۹

۱۔ غالب نے تاریخِ تحریر خط کے آغاز میں دی ہے۔ اردوے معلی میں ۱۸۶۴ء چھپا ہے جو غلط ہے۔ تقویم کی رو سے یہ ۱۸۶۲ء ہے۔ اس کے حق میں دو دلیلیں، یہ بھی ہیں کہ اس خط میں قدسی کے اشعار کا ذکر ہے۔ غالب نے قدسی اور اُن سے منسوب ان اشعار کا ذکر علائی کے نام ۱۸۶۲ء میں لکھے گئے دوسرے خطوط میں بھی کیا ہے۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ ۱۸ جولائی ۱۸۶۲ء کے خط میں غالب نے علائی کو لکھا تھا کہ انھوں نے شراب چھوڑ دی تھی اور ۱۰ جولائی کو پھر شروع کر دی۔ اس خط میں اس واقعے کی تفصیل بیان کی ہے۔

ص ۴۰۰

۱۔ اردوے معلّیٰ کے حاشیے پر اس عربی عبارت کا یہ ترجمہ دیا گیا ہے: "جانا میں نے اپنے کو بہ سبب ٹوٹنے قصدوں کے۔"

۲۔ اردوے معلّیٰ "مرنج"

۳۔ اردوے معلّیٰ "ٹرکے"

۴۔ رضوان پندرہ روپے مہینا تنخواہ مانگ رہے تھے۔ علائی بارہ روپے مہینا دینا چاہتے تھے لیکن اُن کے والد نواب امین الدین احمد خاں کو سات روپے مہینا منظور تھا۔ علائی نے تجویز پیش کی کہ ابتدا دس روپے

مہینے سے کی جائے۔ ۵۔ اردوے معلّٰی میں یہ قرأت "اولویت" ہی ہے، جس کے معنی ہیں برتری۔

ص: ۴۰۱

۱۔ غالؔب نے تاریخِ تحریر خط کے آغاز میں لکھی ہے۔

۲۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ غالؔب نے جس دربار کا ذکر ہے، وہ ۱۸۶۳ء میں منعقد ہوا تھا، اِس لیے یہ خط اوائل مارچ ۱۸۶۳ء میں لکھا گیا ہوگا۔

ص ۴۰۲

۱۔ خط پر تاریخِ تحریر نہیں۔ غالؔب نے ۲۱ جون ۱۸۶۳ء کو ایک خط میں علاؔئی کو لکھا ہے: "مرزا علی حسین خاں آئے اور مجھ سے ملے۔ میں نے خطوط تمھارے یک مشت ان کو دیے۔ اب تمھارے پاس بھیجیے کا ان کو اختیار ہے" خطوط سے بظاہر مراد وہی اردو خطوط ہیں جن کا غالؔب نے زیر بحث خط میں مطالبہ کیا ہے۔ اس لیے گمانِ غالب ہے کہ علاؔئی نے اپریل یا مئی ۱۸۶۳ء میں غالؔب کو یہ خطوط بھیجے تھے۔ علاؔئی کے نام ۳۰ مئی ۱۸۶۳ء کے ایک خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالؔب کو یہ خطوط مل چکے تھے۔ اس لیے یہ خط اپریل، مئی ۱۸۶۳ء میں لکھا گیا ہوگا۔ یہ خطوط غالؔب نے اس مجموعے کے لیے منگائے تھے، جو اکمل المطابع دہلی سے ۶ مارچ ۱۸۶۹ء کو "اردوے معلّٰی" کے نام سے شائع ہوا تھا۔

۳۔ اردوے معلّٰی "فرح"

ص ۴۰۳

۱۔ خط پر تاریخِ تحریر نہیں۔ چوں کہ غالؔب نے علاؔئی سے اپنے خطوط کا مطالبہ کیا ہے۔ اس لیے یہ خط بھی خط ۲ کی طرح اپریل، مئی ۱۸۶۳ء میں لکھا گیا ہوگا۔

۲۔ اردوے معلّٰی "یا" ندارد۔

۳۔ اردوے معلّٰی کے حاشیے پر "پیرِ خرِف" کے معنی "پیرِ حواس باختہ" دیے ہیں۔

۴۔ اردوے معلّٰی "اکر"۔

۵۔ تاریخ تحریر خط کے آغاز میں لکھی ہے۔

ص ۴۰۴

۱۔ اردوے معلّٰی میں حاشیے پر "استا" کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے: "ژند کی تفسیر کا نام ہے۔ یہ کتاب آتش پرستوں کے مذہب کی ہے۔"

۲۔ اردوئے معلّٰی "ہو گی"۔

ص ۴۰۵

۱۔ اردوئے معلّٰی "معینوں"

۲۔ غالب نے تاریخِ تحریر خط کے آغاز میں لکھی ہے۔

ص ۴۰۷

۱۔ اردوئے معلّٰی "سوا ہے"

۲۔ غالب نے تاریخِ تحریر خط کے آغاز میں لکھی ہے۔

ص ۴۰۸

۱۔ "سال ۱۸۶۳ء" میرا اضافہ ہے۔

ص ۴۰۹

۱۔ غالب نے تاریخِ تحریر خط کے شروع میں لکھی ہے۔

۲۔ غالب نے تاریخِ تحریر خط کے آغاز میں لکھی ہے۔

ص ۴۱۰

۱۔ اردوئے معلّٰی "اے"

ص ۴۱۱

۱۔ تاریخِ تحریر میں صرف ۱۸ء چھپا ہے۔ یہ ۱۸۶۴ء ہے، کیونکہ باسی عید کا مطلب ہے کہ یہ "۱۱ ذی الحجہ" ہے۔ تقویم کی رو سے ۱۱ ذی الحجہ ۱۲۸۰ھ اور ۱۸ مئی ۱۸۶۴ء میں مطابقت ہے

ص ۴۱۲

۱۔ غالب نے تاریخِ تحریر خط کے آغاز میں لکھی ہے اور صرف ہجری تاریخ لکھی ہے۔

ص ۴۱۳

۱۔ غالب نے تاریخِ تحریر خط کے آغاز میں لکھی ہے۔

ص ۴۱۴

۱۔ تقویم کی رو سے ۳ نومبر ۱۸۶۴ء کو پنجشنبہ ہے۔

ص ۴۱۵

۱۔ یہ علاء الدین خاں احمد علائی کے والد امین الدین احمد خاں کا ذکر ہے۔

۲۔ غالب نے خط کے آغاز میں صرف "جمعہ نہم رجب و دسمبر" لکھا ہے۔ ۱۸۶۴ء وہ سال ہے جب ۹ رجب کو ۹ دسمبر تھا اور جمعے کا دن تھا۔ اِس لیے یہ خط ۱۲۸۱ھ مطابق ۱۸۶۴ء میں لکھا گیا ہوگا۔

۳۔ اردوئے معلّیٰ "دیدار و دگر" "و" زائد۔

۴۔ اردوئے معلّیٰ "دے" ندارد۔

۵۔ اردوئے معلّیٰ "بچے"

۶۔ غالب نے خط پر تاریخِ تحریر نہیں لکھی لیکن خط میں لکھا ہے "شعبان بیگ پیدا ہو گئے۔ کل اُن کی چھٹی ہو گئی"۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ خط "۷ شعبان" کو لکھا گیا۔ ۹ دسمبر ۱۸۶۴ء کے خط میں غالب نے علائی کو لکھا تھا: "اگر سرنوشتِ آسمانی میں بھی اواخر رجب یا اوائل شعبان میں ہمارا تمھارا مل بیٹھنا مندرج ہے تو زبانی کہہ سن لیں گے۔" زیرِ بحث خط میں بھی رجب یا شعبان میں علائی کے دلی آنے کا ذکر ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ خط بھی ۱۸۶۴ء میں لکھا گیا۔

ص ۴۱۶

۱۔ اردوئے معلّیٰ "گیا"

۲۔ خط پر تاریخِ تحریر نہیں۔ خط میں غالب نے لکھا ہے کہ: "میرا شہاب الدین خاں بچ گیا۔" ۶ جنوری ۱۸۶۵ء کے خط میں غالب نے علائی کو لکھا تھا: "شہاب الدین خاں کی بیماری نے میری زیست کا مزا کھو دیا۔ میں کہتا ہوں کہ اس کے عوض میں مر جاؤں"۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خط اواخر جنوری ۱۸۶۵ء میں لکھا گیا ہوگا۔

ص ۴۱۷

۱۔ اردوئے معلّیٰ "آئے"، خطوطِ غالب کے بیشتر مجموعوں میں یہ قرأت "آئے" ہے، جو کسی طرح درست نہیں۔ غالباً پہلی بار مولوی مہیش نے قیاسی تصحیح کر کے اُسے "آؤں" لکھا ہے۔

۲۔ غالب نے خط کے آغاز میں صرف "صبح دوشنبہ، شانزدہم از مہ صیام" لکھا ہے۔ خط میں علائی کے بچے کی ولادت کا ذکر ہے۔ یہی ذکر ۲۳ فروری ۱۸۶۵ء کے خط میں بھی ہے۔ اس لیے خط زیرِ بحث

۱۸۶۵ء میں لکھا گیا ہے۔

ص ۴۱۸

۱۔ غالب نے تاریخِ تحریر میں صرف "پنجشنبہ، ۲۶ رمضان" لکھا ہے۔ یہ ۱۲۸۱ھ مطابق ۱۸۶۵ء ہے کیونکہ اس خط میں رجب اور شعبان کے بارے میں وہی باتیں کہی گئی ہیں جو غالب نے، شعبان ۱۲۸۱ھ کے خط میں کہی تھیں۔ ۲۶ رمضان کو تقویم کی رو سے "چارشنبہ" ہے۔

۲۔ غالب نے تاریخِ تحریر خط کے آغاز میں لکھی ہے۔

ص ۴۱۹

۱ غالب نے تاریخِ تحریر خط کے آغاز میں لکھی ہے۔

ص ۴۲۰

۱۔ اردوے معلّٰی "ایثار"

۲۔ غالب نے تاریخِ تحریر خط کے متن میں لکھی ہے۔

۳۔ اردوے معلّٰی "ے" ندارد۔

ص ۴۲۱

۱۔ اردوے معلّٰی "نہیں کہ، "نہیں" زائد۔

۲۔ اردوے معلّٰی میں یہ تاریخِ تحریر خط ۱۵ کے اختتام پر نقل ہوئی ہے۔ جب کہ اسے خط زیرِ بحث کے آغاز میں نقل ہونا چاہیے تھا، کیوں کہ خود غالب نے لکھا ہے کہ تاریخ اوپر لکھ آیا ہوں۔ ویسے بھی یہ تاریخِ تحریر خط ۱۵ کی نہیں ہو سکتی، کیوں کہ غالب کے خط زیرِ بحث سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب ابھی رام پور ہی میں ہیں۔

ص ۴۲۳

۱۔ خط پر تاریخِ تحریر نہیں۔ ۲۲ دسمبر اور ۲۶ دسمبر ۱۸۶۵ء کے خطوط کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ خط زیرِ بحث ان دونوں خطوں کی تحریر کی درمیانی مدت میں لکھا گیا۔

۲۔ اردوے معلّٰی "یوم الخمس"

۳۔ اردوے معلّٰی "گروہ"

۴۔ اردوے معلّٰی "ایٹھی"

۵۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ خط میں غالب نے لکھا ہے "آج منگل ہے، سات شعبان کی اور ۲۶ دسمبر کی"۔ خط سے معلوم ہوتا ہے کہ رام پور کے قیام کے دوران لکھا گیا ہے، اس لیے یہ خط ۷ شعبان ۱۲۸۲ھ مطابق ۲۶ دسمبر ۱۸۶۵ء کو لکھا گیا۔

ص ۴۲۴

۱۔ اردوے معلٰی "دو کرتا"

۲۔ اردوے معلٰی "لیتا"

۳۔ اردوے معلٰی "سوہان"

۴۔ غالب نے تاریخ تحریر میں صرف "شنبہ، ۲۵ شعبان ۱۳ جنوری" لکھا ہے۔ یہ ۱۲۸۲ھ اور ۱۸۶۶ء ہے۔ کیوں کہ ان ہی تاریخوں میں غالب رام پور میں تھے۔

۵۔ خط پر تاریخ تحریر نہیں۔ اس خط میں غالب نے کمیٹی کا ذکر کیا ہے۔ غالباً کمیٹی سے مراد "دہلی سوسائٹی" ہے۔ اس سوسائٹی کا پہلا جلسہ ۲۸ جولائی ۱۸۶۵ء کو منعقد ہوا تھا۔ غالب آخر زندگی تک اس سوسائٹی میں دلچسپی لیتے رہے۔ امکان یہ ہے کہ غالب نے اس سوسائٹی کے جلسے کے لیے کوئی تحریر لکھی تھی اور غالب کو توقع تھی کہ وہ عبارت جلسے میں پڑھ کر سنائی جائے گی۔ [illegible] کے ذریعے قیاس ہوتا ہے کہ غالب نے ۲۸ جولائی ۱۸۶۵ء کے بعد علائی کو یہ خط لکھا ہے۔ خط کے متن سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت علائی دلی میں تھے۔ سوسائٹی کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "دہلی سوسائٹی" عبدالستار صدیقی، علی گڑھ میگزین، غالب نمبر (۱۹۴۸-۴۹ء) ص [illegible] ۴۶

ص [illegible]

۱۔ [illegible] علی خاں عرشی نے یہ خط ۵ اپریل ۱۸۶۶ء [illegible] بیان کا بتایا ہے، [illegible] نے کوئی دلیل [illegible]

ص [illegible]

۱۔ [illegible] سمجھا

۲۔ [illegible]

ص [illegible]

۱۔ [illegible] یہ غالب کے خطوں کے مجموعے "اردوے معلٰی" [illegible]